ڈاکٹر عباس برمانی

غالب

کے زمانے کی دلّی

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر» میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

غالب

کے زمانے کی دلّی

ڈاکٹر عباس برمانی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

954.023 Barmani, Dr Abbas
Ghalib Kay Zamaanay Ki Dilli/
Dr. Abbas Barmani.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2006.
224pp. with photographs.
1. Urdu Literature - History - Muslim India - Ghalib. I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

2006
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1875-6

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore Pakistan Phone 7667970

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

غالب کے ''ارادت گزین دیریں''

فرزندِ دلّی الیگزنڈر سکنر کے نام

اور

محبّ غالب

کالی داس گپتا رضاؔ کے نام

غالب

دلّی اور غالب

اے جہاں آباد اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

(علامہ محمد اقبال۔ بانگِ درا)

فہرست

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۱-	اظہارِ تشکر	۹
۲-	عرضِ مؤلف	۱۱
۳-	عباس برمانی کا ذوقِ تحقیق اور رنگِ تخلیق	۱۵
۴-	غالب بقلم خود	۱۹
۵-	سیرِ دلّی.....کوچہ و بازار عمارات	۲۶
۶-	قلعہ معلیٰ	۴۰
۷-	دلّی کے بازار؛ جامع مسجد؛ ذکر چاندنی چوک کا	۴۷
۸-	پھول والوں کی سیر	۵۴
۹-	عیدین؛ ہولی؛ دیوالی؛ نوروز اور محرم	۵۸
۱۰-	دلّی کی زبان؛ اردو؛ ہندی؛ ہندوستانی؛ اردوئے معلیٰ	۶۵
۱۱-	انیسویں صدی کی دلّی کے کچھ بڑے شاعر	۷۱
۱۲-	دلّی کا آخری بادشاہ	۷۸
۱۳-	نصیر الدولہ کرنل جیمس سکنر بہادر غالب جنگ.....دلّی اور انگریز	۸۶
۱۴-	دلّی کے مصور	۹۶
۱۵-	دلّی کے موسیقار اور مطرب	۱۰۱
۱۶-	خسخانہ و برفاب	۱۰۵
۱۷-	قلعہ معلیٰ اور شہرِ دلّی کے مشاعرے	۱۰۸

۱۸- شہزادہ جواں بخت کی شادی اور ایک ادبی معرکہ ۱۱۳
۱۹- قلعہ معلی کے القاب و خطابات..... نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ ۱۱۹
۲۰- دہلی کالج اور دہلی سوسائٹی..... ۱۲۳
۲۱- دتی کے کتب خانے کتب زیر مطالعہ غالب تصانیف غالب ۱۳۲
۲۲- دہلی اردو اخبار مولوی محمد باقر ایک صحافی ایک مجاہد آزادی ۱۳۷
۲۳- غالب پس دیوار زنداں دتی کی انتظامیہ عدلیہ رائے عامہ اور صحافت ۱۴۵
۲۴- گلی قاسم جان فخر الدولہ معروف شمس الدین خاں ایک قاتل ایک شہید ۱۵۰
۲۵- بلاقی بیگم کے کوچے سے سلطان جی تک رسوم دہلی رُت بسنت ۱۵۸
۲۶- دتی کے پانچ شمس العلماء حضرات.....الطاف حسین حالی محمد حسین آزاد ڈپٹی نذیر احمد ضیاء الدین ذکاء اللہ ۱۶۲
۲۷- سر سید احمد خان: آثار الصنادید اسباب بغاوت ہند ۱۷۰
۲۸- مشاہیر دتی مشرف بہ تلمذ غالب ۱۷۶
۲۹- دتی کے دو صوفی ایک تونگر ایک قلندر ۱۹۰
۳۰- دی گریٹ گیم.....روس ایران افغانستان.....غالب کی نظر میں ۱۹۶
۳۱- غالب اور غدر ۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۹ء کی دتی ۲۰۰
۳۲- آہ غالب بمرد ۲۱۷
۳۳- کتابیات ۲۲۲

اظہارِ تشکر

میں صمیم قلب سے شکر گزار ہوں محترم ڈاکٹر انوار احمد صاحب ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کا جنھوں نے ازراہِ عنایت زیر نظر کتاب کا مکمل کمپوز شدہ متن پڑھنے کی زحمت گوارہ کی اور دیباچہ بھی تحریر فرمایا۔ اپنی بہن شبیہ فاطمہ اور اپنے دوستوں پروفیسر سہیل عباس بلوچ، ڈاکٹر طاہر جمیل چودھری، شاکر حسین شاکر، سید ارشاد حسین بخاری اور علی رضا ساقی کا جو مجھے کتب فراہم کرتے رہے۔

اپنے دوستوں ڈاکٹر نجیب حیدر، ڈاکٹر محمد نصر اللہ، پروفیسر سعید اختر، رضی الدین رضی، قمر رضا شہزاد اور سید عامر سہیل کا جنھوں نے مجھے گراں قدر مشورے دیئے اور میرے لیے حوصلہ افزائی کا باعث رہے۔

ڈاکٹر نجیب حیدر اور سید محمد اقبال صاحب کا جنھوں نے کتاب کے لیے بعض تصاویر فراہم اور سکین کیں۔

اور

اپنی نصف بہتر اور اپنے بچوں کا جن کے حصے کا وقت میں نے اس کتاب کی تالیف میں صرف کیا۔

اور اپنے ناشرین محترم افضال احمد اور جناب نیاز احمد کا..... یہ ان کی حوصلہ افزائیوں اور مہمیزِ شوق کا نتیجہ ہے کہ مجھ میں تنگنائے سفر نامہ نگاری سے نکل کر تحقیق کے بحرِ بیکراں کی غواصی کی ہمت پیدا ہوئی۔

عرضِ مؤلف

مولانا الطاف حسین حالی کالی داس گپتا اور مرزا سنگین بیگ سے انتظار حسین تک سینکڑوں مصنفین نے غالب اور دہلی پر کتب تالیف کیں۔ دونوں ہی بہت بڑے موضوع ہیں۔ غالب ایک فرد نہیں ایک ادارہ تھے اور دتی محض ایک شہر نہیں ایک تہذیب تھی..... اندر پرستھ سے لے کر نئی دہلی تک تاریخ کا ایک بیکراں سمندر ہے۔ میں نے اس سمندر کی غواصی کر کے عہدِ غالب کی دتی کو کھوجنے کی کوشش کی ہے۔ دتی کو غالب کی نظروں سے دیکھا ہے۔ غالب ۱۸۱۳ء میں دتی کے ہوئے۔ اس سے تین برس قبل وہ دتی کے داماد بنے تھے اور ۱۸۶۹ء میں وہ دتی کی خاک اوڑھ کر ابدی نیند سو گئے۔

میں نے اپنی کھوج ۱۸۰۳ء سے شروع کی' جب ایک طویل بدامنی اور انارکی کے بعد دتی میں امن کے دور کا آغاز ہو رہا تھا۔ ادارے وجود میں آ رہے تھے۔ عدلیہ' انتظامیہ' پولیس جو فعال لما رید نہیں تھے' جنہیں جوابدہی کا سامنا کرنا پڑتا تھا' فردِ واحد کا فیصلہ حرفِ آخر نہیں تھا۔ ایک عدالت کے اوپر اس سے بڑی عدالت تھی۔ لوگوں کو اپیل کا حق مل رہا تھا۔ اگرچہ یہ ادارے مثالی نہیں تھے ان پر شاہی اثرات بھی تھے اور نوآبادیاتی بھی' لیکن ادارے بہرحال وجود میں آ رہے تھے اور پھر صحافت کا آغاز ہو رہا تھا۔ اخبارات' ایک خاص وائرے کے اندر سہی' کافی کھل کر عوامی مسائل کا اظہار کر رہے تھے۔ عوام کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ حقائق جاننا بھی ان کے حقوق میں شامل ہے اور یہ بھی کہ وہ کچھ بنیادی حقوق بھی رکھتے ہیں۔ محض فرائض ادا کرنے والے غلام نہیں۔ رائے عامہ وجود میں آ رہی تھی۔ قلعہ معلیٰ علم و دانش اور ادب و ثقافت کا مرکز بن گیا تھا۔ اکبرِ اعظم کے دور میں دربار کا جو سیکولر مزاج بنا تھا' وہ لوٹ آیا تھا۔ ہندوستانی اور یورپی کلچرز کے امتزاج سے ایک نیا کلچر وجود میں آ رہا تھا۔ ہندوستانی کلچر اس قدر طاقتور تھا کہ اہلِ یورپ بھی اسے اپنانے پر مجبور ہو چکے تھے۔ زبان و ادب ایک جدید رنگ اختیار کر رہے تھے جو زیادہ شوخ' زیادہ گہرا اور تا دیر باقی رہنے والا تھا۔

یہ وہ عہد تھا جب اتنی زیادہ نابغہ روزگار شخصیات دتی میں جمع ہو گئی تھیں کہ عقلِ انسانی دنگ رہ جاتی

ہے۔ غالب‘ ذوق‘ مومن‘ صہبائی‘ شیفتہ‘ آزردہ‘ سید احمد خان‘ حالی‘ نذیر احمد‘ ذکاء اللہ‘ ضیاء الدین‘ ماسٹر رام چندر‘ ڈاکٹر چمن لال‘ پیارے لال آشوب‘ پنڈت من پھول.....

دہلی کالج اور دہلی سوسائٹی جیسے ادارے قائم ہو رہے تھے۔ ورنیکولر سوسائٹی کا مطبع قائم ہو چکا تھا۔ جدید علوم کی کتب ترجمہ ہو کر چھپ رہی تھیں۔ ریاضی‘ جغرافیہ‘ طبیعیات و کیمیا اور فلکیات پر کتابیں تحریر کی جا رہی تھیں۔ سائنسی علوم میں دلچسپی اس قدر بڑھ رہی تھی کہ دہلی کالج کے طلبہ جو تجربے کالج کی تجربہ گاہ میں کرتے‘ وہ گھر جا کر دہراتے اور اعزہ و اقارب اور دوستوں کو حیران کر دیتے۔

بینک اور مالیاتی ادارے بن رہے تھے۔ لگان تاوان نہیں رہا تھا۔ کرائے کے فوجیوں اور لڑاکوں کی بجائے ریونیو آفیسرز کی مانگ تھی۔ لوگوں کا تعلیم کی جانب میلان بڑھ رہا تھا۔ نوجوان طالع آزمائی کی بجائے علم حاصل کر کے تحصیل دار‘ منصف اور استاد بن رہے تھے۔ مدتوں بعد لوگ ایک ایسی فوج دیکھ رہے تھے جس کے سپاہی شہر میں دکانداروں سے اشیاء ادائیگی کر کے خریدتے تھے اور دیہات میں لوگوں کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار نہیں کرتے تھے‘ کیونکہ انہیں باقاعدگی کے ساتھ معقول تنخواہ ملتی تھی۔ تجارتی شاہراہیں محفوظ ہونے کی وجہ سے تجارت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ڈاک کا نظام سستا اور قابلِ اعتبار تھا۔ ریل اور ٹیلی گراف آ رہے تھے۔ دریاؤں میں سست رفتار کشتیوں کی جگہ دخانی جہازوں نے لے لی تھی۔ فاصلے سمٹ رہے تھے۔ دربار کے سیکولر مزاج کی وجہ سے عوام بھی مذہبی تعصبات سے آزاد ہو رہے تھے۔ مسٹر سپئیر لکھتے ہیں کہ نصف صدی سے زیادہ پر محیط اس دور میں مجھے مذہبی اور فرقہ وارانہ تصادم کا ایک بھی واقعہ تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکا۔ پھر ۱۸۵۷ء آتا ہے اور امن و امان‘ تعلیم و معیشت سب بارود کی نذر ہو جاتے ہیں۔ خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔ لوٹ مار اس وسیع پیمانے پر ہونے لگتی ہے گویا نادر‘ ابدالی‘ روہیلوں اور مرہٹوں کا دور لوٹ آیا ہو۔ ہندوستانی کلچر میں تیزی سے ڈھلتے ہوئے یورپی اپنے قدم روک لیتے ہیں۔ اب وہ شستہ اردو اور فارسی کی بجائے ”ویل ٹم کیا مانگتا“ قسم کی زبان بولنے لگتے ہیں۔ جہاں ہندوستانیوں کی حالت سدھارنے اور مغل شہزادوں کو تعلیم سے آراستہ کر کے اعلیٰ عہدے دینے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے‘ وہاں ہندوستانیوں کو کچلنے اور شہزادوں کو توپ دم کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جہاں شاہ جہان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نئی اور شاندار عمارتوں کی تعمیر اور قدیم عمارتوں کی تزئین و آرائش اور تعمیر نو کی جا رہی تھی‘ وہاں تاریخی عمارات کو منہدم کرنے کا وسیع پیمانے پر آغاز کیا جاتا ہے۔ ہندوستانیوں کو نچلے درجے کی مخلوق قرار دے دیا جاتا ہے۔ (بدقسمتی سے سرسید جیسے دانشور بھی اپنے تمام تر علم و فضل اور روشن خیالی کے باوجود انگریزوں سے موازنہ کرتے ہوئے ہندوستانیوں کو گھٹیا درجے کے حیوان لکھنے لگے تھے)۔ ہندوستان ہزاروں سالوں سے حملہ آوروں کی آماجگاہ رہا تھا..... لیکن یہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے اندر جذب کر لیتا تھا‘ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ حاکم قوم کے خلاف ایک وسیع عوامی بغاوت ابھری تھی‘ چنانچہ بداعتمادی کی ایک خلیج حکام

اورعوام کے درمیان حائل ہوگئی۔ جنگ آزادی کے نتائج کو دیکھتے ہوئے غالب کی ''رستخیز بے جا'' کی اصطلاح کچھ اتنی بے جا بھی نہیں لگتی۔اس سے ایک بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ بہتری کا راستہ ارتقاء اور اصلاح کا ہے۔انقلاب کا راستہ تباہی و بربادی کا ہے۔کسی نظام کو تباہ کرنے کی بجائے اسے اپنا فطری راستہ اختیار کرنے کا موقع دیا جانا چاہیے۔اگر وہ ناقص ہے تو خود بخود مٹ جائے گا۔اداروں کو مضبوط کر کے ہی ریاست کو اور معاشرے کو امن اور خوشحالی کے راستے پر ڈالا جاسکتا ہے۔یہ تھی اس کتاب کی وجہ تالیف.....اب آیئے حضرت غالب کی انگلی تھام کر دلّی کی سیر کرتے ہیں۔

محمد عباس برمانی

۱۱ستمبر۲۰۰۵ء

چوٹی زیریں ڈیرہ غازی خان

عباس برمانی کا ذوقِ تحقیق اور رنگِ تخلیق

ڈاکٹر انوار احمد ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز ملتان یونیورسٹی

عباس برمانی کو میں سفرنامہ نگار کے طور پر جانتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ وہ مستنصر حسین تارڑ سے متاثر ہے' زیادہ سے زیادہ اور زیادہ خانہ برانداز ہو جائے گا اور آخر آخر رشتے کرانے بیٹھ جائے گا' مگر اس نے تو ہر ملاقات میں مجھے حیرت زدہ کرنا شروع کیا' اپنے ذوقِ مطالعہ سے اور اب وہ تہذیبی بازیافت کا ایک اور باب لایا ہے "غالبؔ کے زمانے کی دِلّی"......دِلّی سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ چوٹی زیریں میں بیٹھے عباس برمانی نے ایک مخصوص عہد کی دِلّی کو اور غالبؔ کے زمانے کو تاریخی و تہذیبی شہادتوں' جمالیاتی وجدان اور تخلیقی تخیل سے کیوں دریافت کرنا چاہا ہے؟ کیا یہ اپنے اجتماعی وجود سے منہا ہونے والے حوالے کی بازیابی کی رومانوی کوشش ہے؟ پاکستان کے جہادی مکتبِ فکر کی جانب سے لال قلعے پر سبز ہلالی پرچم لہرانے کے خواب یا کلیم کی تجدید ہے؟ یا پھر مغل کلچر کی تلچھٹ' سامراجی ورثے' مشرق شناسی اور عالمگیریت کے کثیر الابعاد منظر نامے کو سمجھنے کی ایک سنجیدہ کوشش' جس کے ماخذات حیرت انگیز ہیں اور جس سہولت سے وہ نتائج اخذ کرتا ہے' جس اسلوب میں بیان کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ چوٹی زیریں والوں کے اس نقطۂ نظر کو بھی جس معصومیت سے وہ بیان کرتا ہے' وہ سب مجھے مؤقف سے اختلاف کے باوجود متاثر کرتا ہے:

> "بہتری کا راستہ ارتقاء اور اصلاح کا ہے' انقلاب کا راستہ تباہی و بربادی کا ہے' کسی نظام کو تباہ کرنے کی بجائے اسے اپنا فطری راستہ اختیار کرنے کا موقع دیا جانا چاہیے' اگر وہ ناقص ہے تو خود بخود مٹ جائے گا۔ اداروں کو مضبوط کر کے ہی ریاست کو اور معاشرے کو امن اور خوشحالی کے راستے پر ڈالا جا سکتا ہے۔" (عرضِ مؤلف)

اس تہذیبی و تخلیقی سفر میں وہ جسے خضر بناتا ہے' وہ غالبؔ ہے' جس کے جہانِ معانی کی نکتہ شناسی ادبیات کے کسی بھی سنجیدہ طالب علم کی جمالیاتی اور فکری تربیت کا لازمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ پر اتنا بہت

کچھ لکھے جانے کے باوجود لکھا جارہا ہے، فلمیں، ڈرامے اور تمثیلیں، دستاویزی سرمایے کو عوامی سطح پر جاذب اور دل پذیر بنارہی ہیں، ایسے برمانی کی یہ کتاب اس روایت میں جذب ہوکر منفرد نقش بھی بناتی ہے کہ اس میں ایک محقق کی محنت ہے، پیرایہ نہیں۔ اس موضوع پر لکھی جانے والی معاصر شہادتوں سے اخذ معنی کی کاوش ہے۔ خوشہ چینی کی تدوین کا دین نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے مطالعے، تجزیے اور بیان کو محبت بھری واردات بنا کر ان سب قارئین کو شریک کیا ہے، جن میں مجھ ایسے مدرسین بھی ہیں جنھوں نے برس ہا برس طالب علموں کو غالب کے مکاتیب پڑھائے اور بعض مشکل مقامات کو زور بیان کے سہارے عبور کیا، عباس برمانی کی اس کتاب سے اندازہ ہوا کہ ان مکاتیب کو حقیقی تناظر اب فراہم ہوا ہے۔

یہ امر اپنی جگہ دلچسپ ہے کہ آخر ۱۸۵۷ء کے حوالے سے اتنی بہت سی کتابیں کیوں شائع ہورہی ہیں (دوبارہ، سہ بارہ بھی) پڑھی بھی جارہی ہیں اور یہ شاید پہلی مرتبہ ہورہا ہے کہ صرف آخری مغل فرمانروا کی مظلومیت کے حوالے سے رقت قلبی پیدا کرنے والے شواہد یا جذبات انگیز بیانات ہی پیش نہیں ہورہے زوال کے اسباب کو سمجھنے کی بصیرت کو تقویت دینے والی چشم کشا شہادتیں بھی ہیں۔ عباس برمانی نے بھی بہادر شاہ ظفر کی ۴۵ نفر پر مشتمل اولاد کی جو تفصیل دی ہے اور آخری دو شادیوں کی تفصیل، وہ اس شہنشاہ کے آخری ایام کے بارے میں نوحوں کی تاثیر گھٹا دیتی ہے۔ اس طرح خطوط غالب یادستنبو کے ساتھ ساتھ معاصر تذکرہ وتاریخ اور بعض انگریزوں کی یادداشتوں کو ملاکر غالب کی سوانح حیات ہی نہیں، دلّی شہر اور ایک اجتماعی تہذیب کی شام کی کشش اور زوال کی ناگزیریت کو بیان کیا گیا ہے۔

پھر یہ معاملہ غالب اور اس کے احباب کی مرقع کشی کا نہیں رہتا۔ شہر کے کوچہ وبازار رسومات، دو بڑی قوموں کا باہم ثقافتی انجذاب یا مشترکہ الفت کے محور ومرکز بھی بیان ہوئے ہیں۔ ۱۸۶۸ء کی مردم شماری اور ۱۸۳۸ء کے بھی اس سلسلے کے اعداد وشمار 'مسلم دہلی' کی ماہیت بیان کرتے ہیں کہ ہندو اکثریت میں تھے مگر مسلم ثقافتی رنگ کا غلبہ محض سیاسی اقتدار کا کرشمہ نہ تھا بلکہ خود ہندوؤں کا اپنا ذوق جمال تھا، جس نے مسلم رسومات کو ایک خاص رنگ دیا تھا۔

خوشونت سنگھ نے دلّی پر جو ناول لکھا، اس میں اس کا مخصوص چٹخارے دار اسلوب ہے، مگر اس نے لکھا کہ ٹیلی ویژن پروگرام کے لیے دستاویزی پروگرام کے لیے اس نے بہت سی معلومات جمع کیں، جنھیں بعد میں اپنے ناول کے خام مواد کے لیے استعمال کیا۔ اسی طرح انتظار حسین کے لیے دلّی ایک دل کش خواب ہے، جسے وہ ہند مسلم تہذیبی شخصیت کو سمجھنے اور اس کے متوازی ہم آہنگ تمدنی حاشیے کو بھی اس طرح ابھارا جاتا ہے کہ تاریخ و تہذیب کی تعبیر بھی کرتا جاتا ہے، اسی طرح حسن نظامی، نذیر، ناصر فراق، اشرف صبوحی اور شاہد احمد دہلوی کا یاس انگیز مبالغہ ایک اور رنگ پیدا کرتا ہے۔ عباس برمانی کا رنگ جدا ہے، اس کا انداز معروضی تو نہیں، اس کا اس دور، اس دور کی شخصیتوں، مقامات اور واقعات سے ایک خاص طرح کا لگاؤ ہے، مگر اس پورے تذکرے میں وہ کوشش

غالب کی مُہر

کرتا ہے کہ اس کے ماخذات ہی راوی بن جائیں اور جب بیشتر مقامات پر کتابی معلومات متکلم مناظر تشکیل دیتی ہیں' تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محض لذتِ مطالعہ کی شرکت کی آرزومندی نہیں تھی' جس نے اس سے یہ کتاب لکھوائی۔

غالبؔ' دلّی میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ دلّی کا داماد تھا لیکن اس نے اپنی شخصیت اور نظم ونثر سے اسے جہانِ دیگر بنا دیا ہے۔ یہاں مجھے دلّی کے ایک مسلمان رہنما سے حالیہ ملاقات یاد آ رہی ہے کہ جب میں نے دہلی زبان میں مسلمانانِ ہند' پرانی دلّی اور اردو کی حالتِ زار کے بارے میں چند افسردہ مشاہدات کا تذکرہ کیا تو انہوں نے مسکرا کر کہا "میاں' مسلمان' ہندوستان کے داماد ہیں' ان کی ناز برداری کرنا ہندوستان کی مجبوری ہے۔" سو غالبؔ کے ناز تو ہم سب اُٹھا رہے ہیں۔ عباس برمانی نے بھی اس عہد کی دلّی کے ناظر اور شاہد کے طور پر غالبؔ کو نہیں دیکھا بلکہ غالبؔ کی زندگی کے مختلف ادوار اور مراحل کے بیان میں تبدیلیوں کی زد میں آئی دلّی کی مرقع کشی کی ہے اور غالبؔ کی آخری سانسوں کے ساتھ ہی یہ کتھا ختم کی ہے' گویا وہ غالبؔ کو اس عہد کی دلّی کا مرکزی کردار ہی نہیں' تہذیبی ہم زاد اور نبض شناس بھی خیال کرتا ہے۔ تاہم یہ خیال ضرور آتا ہے کہ سفرنامہ نگار عباس برمانی نے دلّی کے دو چار سفر بھی کیے ہوتے اور وہ واردات بھی اس کتاب شناس کے اظہار میں شامل ہو جاتی تو شاید معنویت کی ایک اور سطح بھی اس کتاب میں پیدا ہو جاتی' کیا پتا اس نے یہ سفر کیے ہوں' عالمِ خیال میں یا سچ مچ مگر اپنے مخصوص انکسار کے سبب اس کا ادعا مناسب خیال نہ کیا ہو۔

انوار احمد

۲۳/اپریل ۲۰۰۶ء

غالب بقلم خود

اسد اللہ خاں غالب تخلص عرف مرزا نوشہ قوم کا ترک سلجوقی سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے۔ اس کا دادا قوقان بیگ خان شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلّی میں آیا۔ پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا۔ پہاسو کا پرگنہ جواب سمرو بیگم کو سرکار سے ملا تھا' وہ اس کی جاداد میں مقرر تھا۔ باپ اسد اللہ خاں مذکور کا عبداللہ بیگ خان دلّی کی ریاست چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہا۔ اسد اللہ خان اکبر آباد میں پیدا ہوا۔ سال ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ ہجری بروز یک شنبہ۔ عبداللہ بیگ خان الور میں راؤ راجا بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا۔ جس حال میں کہ اسد اللہ خاں مذکور پانچ چھ برس کا تھا۔ اس کا حقیقی چچا نصراللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبے دار تھا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جنرل لیک صاحب اکبر آباد پر آئے تو نصراللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی۔ جرنیل صاحب نے چار سو سواروں کا بریگیڈیئر کیا اور ایک ہزار سات سو کی تنخواہ مقرر کی۔ پھر جب اس نے اپنے زور بازو سے سونک سونسا دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہولکر کے سواروں سے چھین لیے' جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بہ طریق استمرار عطاء فرمائے مگر خان موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے کے بعد ناگاہ ہاتھی سے گر کر مر گیا۔ جاگیر سرکار میں بازیافت ہوئی اور اس کے عوض نقدی مقرر ہو گئی اور شرکاء کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپے سال اس شخص کی ذات کو اس زرِ معافی میں سے ملتے ہیں۔ اس نے شاعری میں بڑا کمال پیدا کیا۔ نہ فقط شعر بلکہ نثر میں بھی دستگاہ رکھتا تھا۔ نثر کی تین کتابیں ہیں۔ پنج آہنگ' مہر نیم روز' دستنبو۔ فارسی زبان کا کلیات دس ہزار بیت کا بالفعل "اودھ اخبار" لکھنؤ میں چھاپا ہوا ہے۔ گورنمنٹ میں اس کی بڑی عزت ہے۔ اشرفیوں کے عوض قصیدۂ مدح نذر دیتا ہے اور سات پارچے' جیغہ' سرپیچ موتیوں کی مالا خلعت پاتا ہے۔ اب کی بار جو لاہور میں لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق سابق کے درباروں کی فہرست کے صاحب کمشنر بہادر حصار نے کہ دریں والا قائم مقام صاحب کمشنر دہلی بھی ہیں مثل اور رئیسوں کے اور رئیس زادوں کے اس کو بھی خط لکھا۔ بے چارہ بہ سبب تہی دستی اور بے مقدوری کے لاہور نہ جا سکا..... اس شخص نے ۱۸۵۵ء کے آخر

میں قصیدۂ مدح ملکہ معظمہ ولایت کو بہ سبیل ڈاک لارڈ الن برا گورنر سابق کی معرفت بھیجا ہے۔[1]

میرے دادا ماوراء النہر سے تھے اور میرے باپ کی ولادت دہلی میں ہوئی اور میں آگرے میں پیدا ہوا۔[2] جن لوگوں نے خانِ خجستہ گہر (دادا) کو دیکھا ہے وہ کہتے تھے کہ وہ سب بات چیت ترکی میں کرتے تھے اور انہیں ہندوستانی زبان نہیں آتی تھی؛ مگر ادھر میں ہوں کہ ترکی کے حروف تہجی سے بھی واقف نہیں۔[3]

میرے چچا نصر اللہ بیگ خان کے وارثوں میں یوسف علی خاں میرا بھائی ہے جو مرحوم کا بھتیجا ہے۔ نیز آپ کا یہ درخواست گزار ہے۔ میرا نام محمد اسد اللہ خاں ہے اور عُرف مرزا نوشہ۔[4]

میں نے آج تک اپنے والد مرحوم کے ترکے کو بیچ بیچ کر زندگی بسر کی ہے۔ اس کے علاوہ میرے نانا خواجہ غلام حسین نے بھی کچھ جاداد چھوڑی تھی۔ وہ آگرہ کے چوٹی کے عمائد میں سے اور نواب نجف خان کے دربار کے مشہور امراء میں سے تھے۔ میں نے بسر اوقات کے لیے والد اور نانا کی متروکہ جاداد بیچ ڈالی اور اس کے باوجود مجھ پر آج بیس ہزار کا قرض ہے۔[5]

پانچ برس کی عمر تھی میری کہ میرا باپ عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہ مہاراجا بختاور سنگھ کی رفاقت میں مارا گیا۔ سرکار سے میرے باپ کی تنخواہ میرے نام پر جاری ہوئی اور ایک گاؤں جس کا تالڑا نام ہے' مجھ کو برائے دوام ملا..... چار برس کے بعد نصر اللہ بیگ خاں میرا چچا مر گیا۔ نو برس کی عمر میں سرکار انگریزی سے بہ عوض چچا کی جاگیر کے نقدی مقرر ہوئی۔ ابھی تک اس پر معاش کا مدار ہے۔ عمر بھر نوکری کی تو بہادر شاہ سے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب پایا۔

کچھ دنوں بادشاہ کا مصاحب رہا پھر استاد کہلایا۔ اب ایک کم ستر برس کی عمر ہے۔ کانوں سے بہرہ ہو گیا ہوں۔ بغیر لاٹھی کے چل نہیں سکتا' تکیہ یا دیوار کے آسرے کے بغیر بیٹھ نہیں سکتا۔ دنیادار نہیں فقیر ہوں۔ انگریز کا پنشن دار اور خیر خواہ بعد غدر کے پنشن جاری' گورنمنٹ اور حکامِ دلّی سے ملاقاتیں بدستور' خطوط کی آمد و رفت جانبین سے بدستور۔[6]

باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ میں جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا' بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ وہ نوکری خانہ جنگی کے ایک بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔[7]

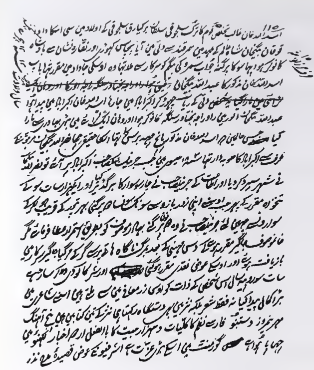

اسد اللہ خاں غالب تخلص قوم کا ترک سلجوقی سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے اسکا دادا
توقان بیگ خان شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلی میں آیا پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے بادشاہ
کا نوکر ہوا پہاسو کا پرگنہ جناب سمرو کی بیگم کو سرکار سے ملا تھا وہ اوسکی جاداد میں مقرر تھا باپ
اسد اللہ خان مذکور کا عبد اللہ بیگ خان [illegible]
[illegible] یہ شخص دلی کو رہا چھوڑ کر اکبرآباد میں جا رہا اسد اللہ خان اکبرآباد میں پیدا ہوا
عبد اللہ بیگ خان الور میں راو راجہ بختاور سنگہ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں مارا
گیا جس حالت میں اسد اللہ خان مذکور پانچ برس کا تھا اسکا حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خان مرہٹوں کی
طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب اکبرآباد پر آئے تو نصر اللہ بیگ خاں
نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا برگیڈیر کیا اور ایک ہزار سات سو کی
تنخواہ مقرر کی پھر جب اوسنے اپنی زور بازو سے سونک سونسا فتح کر لیے پھر تمہید کی قریب [illegible]
سواروں سے چھڑا لیے جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بحال موصوف کو بطریق استمرار عطا فرمائے مگر
خان موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے کے بعد ناگاہ ہاتھی پر سے گر کے مر گیا جاگیر سرکار میں
بازیافت ہوئی اور اوسکے عوض نقدی مقرر ہو گئی [illegible] اور سرکار کمپنی سے [illegible]
سات سو روپیہ سال اس شخص کی ذات کو اوسی زرمعاف میں سے ملتے ہیں اسنے عربی
[illegible] کمال پیدا کیا نہ فقط شعر بلکہ نثر میں بھی دستگاہ رکھتا ہے نثر کی تین کتابیں ہیں پنج آہنگ
مہر نیمروز دستنبو فارسی نظم کا کلیات دس ہزار بیت کا بالفعل از روئے اخبار لکھنؤ میں
چھاپا ہوا ہے [illegible] گورنمنٹ میں اسکی بڑی عزت ہے اشرفیوں کے عوض قصیدہ مع نذر

مرزا غالب کے خود نوشت حالات زندگی ('اردو' اورنگ آباد، جولائی ۱۹۲۸ء)

دیتا ہے اور شاہ ہار جیغہ سرپیچ موتیوں کا مالا خلعت پاتا ہے ایک بار جو [illegible] میں لارڈ صاحب
دربار ہوا تو موافق سابق کے دربار ہونے کا فہرست سے صاحب کمشنر بہادر حصار نے [illegible]
قائمقام صاحب کمشنر دہلی بھی تھے میں مثل اور رئیسوں کے اور رئیس زادوں کے اسکو بھی خط لکھا
بیچارہ بسبب تہیدستی اور جمعیت [illegible] کے لاہور نجا سکا مجھ سے کہتا تھا ہم ستر برس کا آدمی
کانوں سے بہرا ہوں اور اکثر بیمار رہتا ہوں لیکن اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں ان عوارض کو
تماما اور [illegible] لارڈ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا خیر آخر عمر میں یہ ایک داغ حسرت رہا
حق بات کو ظاہر کرنا خداپرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے اسی شخص نے ۱۸۵۵ع
کے آخر میں قصیدہ مدح ملکہ معظمہ ولایت کو بسبیل ڈاک [illegible] لارڈ ڈالہوزی گورنر
کے معرفت بھیجا ہے اور اوائل ۱۸۵۶ع میں تین خط انگریزی بواسطہ انڈیا گورنمنٹ
ولایت سے اسکو ڈاک میں آئے ہیں اب ہم ان تینوں خطوں کے خلاصے لکھ کر اسکے
ذکر کو ختم کرتے ہیں

اور اسکے مشہور عہدہ رسالت [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

آپ حضرات والدہ صاحبہ قبلہ وکعبہ حضرت عزت النساء بیگم صاحبہ مدظلہ العالی کے ساتھ حویلی کے رہن اور قرض کے لین دین کے معاملے میں کسی امر ناگزیر کی صورت میں میری جانب سے دل جمعی چاہتے ہیں۔ لہٰذا تحریر کیا جاتا ہے کہ خدائے جہاں آفریں بیگم صاحبہ یعنی والدہ صاحبہ کو دیر گاہ سلامت رکھے۔ وہ دونوں حویلیوں کی تنہا مالک ہیں۔ اگر خدانخواستہ امر ناگزیر کہ لازم ذات انسان ہے پیش آتا ہے تو جو بھی املاک مملوکہ ومقبوضہ جناب ممدوحہ اس گنہگار کے تصرف میں آئیں گی' پہلے آپ صاحبان کا قرض ادا کیا جائے گا.....خیال رہے کہ جناب والدہ صاحبہ لکھنا پڑھنا جانتی ہیں لہٰذا ہر وہ تمسک جو ممدوحہ کے دستخطوں کے بغیر ہوگا پایۂ اعتبار سے ساقط قرار پائے گا[8]۔

میرے چچا کے کوئی اولاد نہ تھی' وفات کے وقت ان کے ورثاء حسب ذیل تھے (۱) میں (۲) میرا چھوٹا بھائی (۳) میری دادی (۴) میری تین پھوپھیاں۔ اس وقت میری عمر نو برس کی تھی اور میرے بھائی کی سات' میری دادی ستر برس کو پہنچ چکی تھیں[9]۔

اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ.....سات بچے پیدا ہوئے لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی[10]۔

میں نے ایامِ دبستان نشینی میں ''شرح مأتہ عامل'' تک پڑھا' بعد میں اس کے لہو ولعب اور آگے بڑھ کر فسق وفجور وعیش وطرب میں منہمک ہوگیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر وسخن کا ذوق فکری وطبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص.....کہ ساسان پنجم کی نسل میں سے' معہذا منطق وفلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن و صوفی صافی تھا میرے شہر میں وارد ہوا اور لطائف فارسی بحث اور غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے میرے حال ہوئے سونا کسوٹی پر چڑھ گیا[11]۔

تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا' کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے[12]۔

شاعری میں تلمیذ الرحمٰن ہوں اور معنی کی تاریکی کو اپنے گوہر استعداد کی روشنی سے دور کرتا ہوں۔ عدم سے تشکیل پایا ہوا میرا تلمذ ادا شدنی قرض کی طرح میرے لیے بارگراں نہیں اور نہ ہی میں کسی اتالیق کے

احساس کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں[13]۔

میں اور وہ ہم عصر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں' باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت' آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔۔ایک کٹرا کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑایا کرتا تھا اور راجا بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے[14]۔

بارہ برس کی عمر سے نظم و نثر سے کاغذ مانند اپنے نامہ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں' باسٹھ برس کی عمر ہوئی' پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔ اب جسم و جاں میں تاب نہیں۔ نثر فارسی لکھنی یک قلم موقوف' اردو سواس میں بھی عبارت آرائی متروک' جو زبان پر آوے وہ قلم سے نکلے[15]۔

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیئے[16]۔

میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زباں سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعۃ تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمتہ اللعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام

بریں زیستم هم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تا کہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی اور امامت مرتضوی اس میں جلیں[17]۔

دس بارہ برس سے اس تکنا میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بہ ماہ چار روپیہ دیا گیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپے یک مشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا اس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام

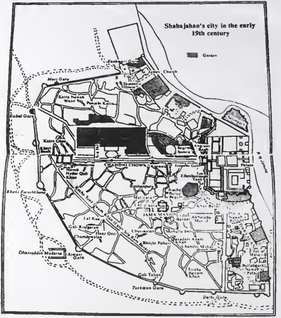

نقشہ شاہ جہان آباد

کیا کہ مکان خالی کر دو مکان کہیں ملے تو؟[18]

دو قسم کی انگریزی شراب ایک تو کاس ٹیلن اور ایک اولڈ ٹام یہ میں ہمیشہ پیا کرتا تھا اور یہ دونوں قسم بیس روپے حد چوبیس روپے درجن آتی تھی۔ اب یہاں پہلے تو نظر نہیں آتی تھی اب پچاس اور ساٹھ روپے درجن آتی ہے۔ وہاں تم دریافت کرو کہ اس کا نرخ کیا ہے اور یہ بھی معلوم کرو کہ بطریق ڈاک پہنچ سکتی ہے یا نہیں؟ یہ دونوں امر مجھے دریافت کر کے جلد لکھو۔ اگر بہ قیمت مناسب ہاتھ آئے اور اس کا بھیجنا ممکن ہو تو یہاں سے روپے کی ہنڈوی بھیج دوں اور تم خرید کر بیل گاڑی کی ڈاک پر روانہ کر دو۔

جاڑوں میں مجھ کو بہت تکلیف ہے اور یہ گڑ چھال کی شراب میں نہیں پیتا مجھ کو مضرت کرتی ہے اور مجھے اس سے نفرت ہے ضروری جواب طلب.....از غالب جاں بلب[19]

بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر بس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔

دریغا که عهد جوانی گزشت
جوانی گو زندگانی گزشت[20]

میں اب انتہائے عمر ناپائیدار کو پہنچ کر آفتاب لب بام اور ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یاد خدا بھی چاہیے۔ نظم و نثر کے قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی رہے گا[21]۔

ہرگز میں ایسا نہیں کہ خدا نے مجھ سے پہلے کوئی ایسا پیدا نہ کیا ہو۔ غایت مافی الباب یہ ہے کہ سخنوران گذشتہ کا طرز شناس اور ان کی نازک خیالیوں کا پیرو ہوں۔ مبدء فیاض سے مجھ کو ان کی تقلید میں پایۂ تحقیق ملا ہے اور میں صاحب طرز جدید ہوں۔ (مکتوب بنام مولوی نعمان احمد)

وائے میری سوختہ سامانی.....آزادوں کی طرح در ویشانہ زندگی گزار رہا تھا کہ ذوق سخن نے رہبری کی اور مجھے یہ سمجھایا کہ آئینے کو جو چکا کر صورت معنی کو چمکانا بھی بڑا کام ہے.....مجبوراً میں نے اپنا سفینہ بحر شعر میں ڈال دیا جو بحر نہیں سراب ہے۔ قلم میرا علم بن گیا مگر شاید میرے زمانے میں دیدہ وری تھی ہی نہیں یا تھی تو میرے حصے کی نہیں تھی میرے کلام کی ندرت زمانے سے چھپی رہی۔ (پنج آہنگ غالب)

بندہ پرور میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے 22۔ (بنام ہرگوپال تفتہ ۲۳ دسمبر ۱۸۵۹ء)

جس میں یہ دو صفات ثبوتی جمع ہوں گی یعنی حقیقت زبان فارسی سے آگہی اور انصاف کا ملکہ مع ہذا۔ یہ دو صفات سلبی بھی معاً موجود ہوں گی یعنی مردہ پرست نہ ہوگا اور حسد پیشہ نہ ہوگا تو وہ غالب کی قدر جانے گا اور اس محقق مدقق کے قول کو مانے گا اور ایسے لوگ دنیا میں کم ہوں گے' پس صغریٰ و کبریٰ کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت غالب کے منافقین و منکرین ہزار در ہزار پیدا ہو جائیں گے۔ ہرچند اہل حق انہیں سمجھائیں گے لیکن وہ انکار سے باز نہ آئیں گے۔ جہل مرکب کا علاج محال ہے۔ (لطائف غیبی: غالب)

روح سخن کی جستجو میں میری عمر کے باون برس گزر چکے ہیں اور اب میری عمر چھیاسٹھ کی ہو چکی۔ میں اس نعمت کلام عطا کرنے والے خداوند کریم کا شکر گزار ہوں کہ کمالات فن سے نوازنے والے مالک نے ان باون برسوں میں مجھ پر کیسے اعلیٰ خیالات اور معنویت کے دروازے کھول دیئے ہیں اور میرے فکر و خیال کی کرسی کو معرفت و آگہی کی کس بلندی پر جگہ دی ہے' وہ بیان نہیں کر سکتا۔ افسوس تو یہ ہے کہ میرے دور کے لوگوں نے میری شاعرانہ خوبیوں کو نہیں پہچانا۔ ایسے لوگوں کی کج فہمی اور کوتاہ نظری سے میرا دل جل رہا ہے۔ نظر کی روشنی بخشنے والے کمالات کو جن کو میں نے اپنی نظم و نثر میں صرف کیا ہے ان کی خوبیوں کو دیکھ کر یہ لوگ پیچ و تاب میں پڑ گئے۔ (درفش کاویانی: غالب)

حوالہ جات

1- مرزا غالب کی خود نوشتہ سوانح عمری کا ورق... مجموعہ نثر مرتبہ غالب خلیل الرحمٰن داؤدی۔
2- درفش کاویانی مجموعہ اکمل المطابع ۱۸۶۵ء ترجمہ کالی داس گپتا رضا۔
3- ایضاً
4- عرضی دعویٰ پنشن۔ فسانہ غالب: مالک رام۔
5- ایضاً
6- خط بنام میر بندہ علی خاں ۱۸۶۴ء: خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔

7- خط بنام میر حبیب اللہ ذکا ء فروری ۱۸۶۷ء۔ خطوط غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔
8- متن دستاویز از فسانہ غالب از مالک رام۔ ترجمہ عباس برمانی۔
9- عرض دعویٰ پنشن 28 اپریل 1828ء۔ فسانہ غالب از مالک رام۔
10- مکتوب بنام میاں دادخاں سیاح ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء خطوطِ غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔
11- خط بنام مولوی ضیاء الدین خان ضیا دہلوی فروری ۱۸۶۶ء خطوطِ غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔
12- مکتوب بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر اپریل ۱۸۵۹ء خطوطِ غالب مرتبہ۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔
13- مرزا غالب: نتالیا پری گارینا ترجمہ اسامہ فاروقی۔
14- مکتوب بنام منشی شیو نارائن آرام ۱۱۹ کتوبر ۱۸۵۸ء خطوطِ غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔
15- مکتوب بنام غلام حسین قدر بلگرامی ۲۳ فروری ۱۸۰۷ء خطوطِ غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔
16- خط بنام عبدالرزاق شاکر یکم اگست ۱۸۵۶ء خطوطِ غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔
17- مکتوب بنام علاؤ الدین احمد خان علائی جولائی ۱۸۶۲ء خطوطِ غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔
18- مکتوب بنام منشی ہرگوپال تفتہ ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء خطوطِ غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔
19- مکتوب بنام منشی ہرگوپال تفتہ ۲۰ دسمبر ۱۸۵۹ء خطوطِ غالب غلام رسول۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔
20- مکتوب بنام چودھری عبدالفضل سرور ۱۸۶۰ء خطوطِ غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔
21- مکتوب بنام عبدالرزاق شاکر خطوطِ غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔
22- خطوطِ غالب غلام رسول مہر۔

سیرِ دلّی...کوچہ و بازار عمارات

’’در دہلی بہ اسد اللہ رسد‘‘ کافی ہے مگر اب لال کنواں نہ لکھا کرو محلّہ بلی ماراں لکھا کرو۔‘‘(بنام تفتہ)[1]

’’میں بلی ماراں میں رہتا ہوں۔ الملی کا محلّہ یہاں سے بے مبالغہ آدھ کوس ہے۔‘‘(بنام تفتہ)۔

’’سو روپے کی ہنڈی بل جو کچھ کہیے وہ ملا ایک آدمی رسید میری لے کر نیل کے کٹڑے میں چلا گیا۔ سو روپیہ چہرہ شاہی لے آیا۔‘‘(بنام تفتہ)[2]

’’بساون کی گلی میں جو حکیموں کی گلی کے قریب ہے جواش صاحب کی کوٹھی انہوں نے مول لی ہے۔‘‘(بنام تفتہ)[3]

’’دوپہر کے وقت شیخ مشرف علی رہنے والے استاد حامد کے کوچہ کے میرے پاس آئے اور انہوں نے تمہارا لکھا ہوا خط ۱۵ اجمادی الثانی کا دیا۔‘‘(بنام میر مہدی)[4]

’’میرزا قربان علی بیگ کے مکان میں مولوی مظہر علی رہتے ہیں، میرے ان کے مسکن میں ایک میر خیراتی کی حویلی درمیان میں ہے۔‘‘(بنام میر مہدی)[5]

’’جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس گز گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ خان چند کا کوچہ شاہ مولا کی بڑ تک ڈھبے گا۔‘‘(بنام میر مہدی)[6]

’’نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچہ کی سڑک دیکھ جاؤ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھینا سن جاؤ۔ دریبہ اور چاوڑی اور اجمیری دروازے کے بازار اور بلاقی بیگم اور خان دوراں کی حویلی کے کھنڈر گنتے پھرو۔‘‘(بنام میر مہدی)[7]

’’یہ نہیں جانتا کہ آغا جان کہاں رہتے اب میر احمد علی کی بی بی پاس حبش خاں کے پھاٹک آدمی بھیجوں گا۔‘‘[8]

’’مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازہ کے باہر صدر بازار تک ان کو پہنچانے گئے۔‘‘(بنام میر مہدی)[9]

''جامع مسجد واگذاشت ہوگئی۔ چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔''[10]

''قاری کا کنواں بند ہوگیا' لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ جامع مسجد سے راج گھاٹ تک کا بے مبالغہ ایک صحرا لق ودق ہے۔ مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی کوس نشیب تھا۔ وہ اب باغیچے کے صحن کے برابر ہوگیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہوگیا۔''[11]

''کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہوگیا۔ پنجابی کٹرا' دھوبی واڑا' رام جی گنج' سعادت خاں کا کٹرا' جرنیل کی بیوی کی حویلی' رام جی داس گودام والے کے مکانات' صاحب رام کا باغ حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا.....اردو بازار نہ رہا.....اردو کہاں'' (بنام میر مہدی)[12]

''روشن الدولہ کا مدرسہ جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی جس میں مغل علی خان مرحوم رہتے تھے وہ اور خواجہ صاحب کی حویلی یہ املاک حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی قرار پا کر ضبط ہوگئی۔'' (بنام میر مہدی)[13]

''فیل خانہ' فلک پر' لال ڈگی کے محاذی کے مکانات سب گرائے گئے ہیں۔'' (بنام حسین مرزا)

''بھائی فضلو عرب سرا میں رہتے ہیں۔ پرسوں سے آئے ہیں عرضیاں دیتے پھرتے ہیں کوئی سنتا نہیں۔'' (بنام حسین مرزا)[14]

''بڑے بڑے نامی بازار خاص بازار' اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔'' (بنام عبدالغفور سرور)[15]

''قلعے کے آگے جہاں لال ڈگی ہے ایک میدان نکالا جائے گا جو ب کی دکانیں' ہملیوں کے گھر' فیل خانہ بلاقی بیگم کے کوچے سے خاص بازار تک یہ سب میدان ہو جائے گا۔ یوں سمجھو کہ اموجان کے دروازے سے قلعے کی خندق تک.....'' (بنام یوسف مرزا)[16]

''دریبہ کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا۔ کشمیری کٹرے کی مسجد زمین کا پیوند ہوگئی۔ سڑک کی وسعت دوچند ہوئی۔ فیض اللہ خان بنگش کی حویلی پر جو گلہ ستے ہیں جن کو عوام گمری کہتے ہیں انہیں ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنیاد ڈھادی۔''[17]

''قاسم جان کی گلی میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خان کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں اگر آبادی ہے تو یہ کہ غلام حسین خان کی حویلی میں ہسپتال ہے۔'' (بنام عزیز الدین بدایونی)[18]

غالب نے اپنے مکاتیب میں دلّی کے بازاروں' گلی کوچوں' عمارات' باغات' کنوؤں' باؤلیوں اور حویلیوں کا ذکر کیا ہے۔ اکثر خطوط غدر کے بعد کے ہیں اور ان میں عمارات وا ماکن کی بربادی اور محلوں کے بے چراغ ہونے کا ذکر ہے۔ کبھی یہ کوچے شاد و آباد تھے۔ جاگتے تھے۔ روشن ہوتے تھے۔ بازاروں میں کھوے

سے کھوا چھلتا تھا۔ رونقیں تھیں۔ آیئے ان دنوں کی دلّی کی سیر کریں۔

"دلّی کے شمال میں ضلع کرنال ہے۔ مشرق میں دریائے جمنا اسے میرٹھ اور بلند شہر سے جدا کرتا ہے۔ جنوب میں رہتک اور مغرب میں گڑگانواں ہے۔ ۱۸۶۸ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع دہلی کی آبادی ۶ لاکھ آٹھ ہزار آٹھ سو پچاس نفوس پر مشتمل تھی۔ جن میں چار لاکھ اڑتیس ہزار ہندو اور ایک لاکھ تیس ہزار چھ سو مسلمان تھے جبکہ دلّی شہر کی آبادی ایک لاکھ چون ہزار چار سو سترہ تھی۔ ضلع کا رقبہ ۱۲۳۷ مربع میل تھا۔"....مرزا حیرت دہلوی[19]

اس مردم شماری سے تیس سال قبل دلّی شہر کی آبادی ۱۳۳۶۶۲ تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ تیس برسوں میں شہر کی آبادی میں صرف ۲۱ ہزار کا اضافہ ہوا.....لیکن ایک وقت ایسا بھی تھا جب شہر کی آبادی کم ہوگئی تھی یعنی غدر اور مابعد جب بقول غالب دلّی شہر نہ تھا ایک کیمپ تھا.....اور مسلمانوں میں صرف اہلِ حرفہ اور حکام کے شاگرد پیشہ ہی شہر میں باقی رہے تھے اور پھر والیانِ ملک نے بہ اہتمام شہر کو مسمار بھی کیا تھا۔"جب مسلمان "ڈھونڈے کو نہ ملتا تھا۔"

اکتوبر کی مردم شماری کے مطابق آبادی کے آنکڑے کچھ یوں تھے۔[20]

	مرد	عورتیں
مسلمان بالغ	۲۱۸۶۵	۲۳۳۱۱
مسلمان بچے	۱۰۰۹۸	۸۸۹۰
ہندو بالغ	۲۴۳۳۹	۲۴۳۱۱
ہندو بچے	۹۸۱۶	۷۹۸۹
میزان	۶۶۱۵۸	۶۴۵۰۴

یہ آبادی ۲۸۰۰۶ گھروں میں رہائش پذیر تھی۔

(ASIATIC INTELLIGENCE CALCUTTA)

۱۸۱۴ء میں اس شہر کی آبادی میں ایک معتبر فرد کا اضافہ تب ہوا جب غالب آگرہ سے سکونت ترک کر کے دلّی میں آ بسے[21]۔ اس سے ۳ سال قبل غالب اس شہر کے داماد بنے تھے[22] جبکہ ۱۰ سال قبل یہاں انگریزوں کی آمد ہوئی تھی۔

۱۶ ستمبر ۱۸۰۳ء کو انگریز دلّی میں داخل ہوئے۔ وہ بینائی سے محروم معذور بادشاہ شاہ عالم کی دعوت پر آئے تھے۔ بادشاہ نے مرہٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انگریزوں سے مدد مانگی تھی۔ پت پر گنج کی لڑائی میں لارڈ لیک نے سندھیا کے لشکر کو شکست سے دوچار کیا۔ فاتحین نے شاہ عالم کو علامتی بادشاہ کے طور پر باقی رکھا۔ دلّی میں ریذیڈنسی قائم ہوئی۔ سر ڈیوڈ اکٹرلونی المعروف بہ اختر لونی صاحب پہلے ریذیڈنٹ بنے۔ جمنا کے

داہنی کنارے پر واقع کچھ علاقہ شاہی خاندان کے اخراجات کے لیے بادشاہ کو دیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ ان زمینوں کا انصرام ریذیڈنٹ کرے گا اور پیداوار کا محصول بادشاہ کو دیا جائے گا۔ برطانوی قوانین کے تحت شاہ کے نام پر عدل وانصاف کا نظام قائم کیا جائے گا۔ دو عدالتیں دیوانی اور فوج داری قائم کی جائیں گی۔ سزائے موت پر بادشاہ کی منظوری کے بغیر عمل درآمد نہیں ہو سکے گا اور اعضا قطع کرنے کی سزا بند کر کے قید میں تبدیل کر دی جائے گی۔[23]

بادشاہ اپنی زمینوں کے معاملات پر نظر رکھنے کے لیے کلکٹر کے دفتر میں ایک دیوان اور چند ادنیٰ اہلکار مقرر کرے گا۔ بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کے وظائف مقرر کیے گئے۔ انگریزوں نے اپنی ضرورت کے مطابق شاہ جہاں آباد کے اندر کشمیری دروازہ اور دریا گنج کے قریب عمارتیں تعمیر کیں اور فصیل شہر کے باہر بھی۔

شاہ عالم کی وفات کے بعد ۱۸۰۶ء میں اکبر شاہ ثانی بادشاہ بنے اور ۱۸۳۷ء تک رہے۔ ۱۸۰۹ء میں دہلی کو صوبہ بنا دیا گیا تھا۔[24]

دلّی کی عمارتوں کے بارے میں لکھی جانے والی سب سے پہلی کتاب "سیر المنازل" ہے جو ۱۸۲۴ء میں لکھی گئی یعنی "آثار الصنادید" سے کوئی ۲۳ برس قبل۔ اس کے مصنف تھے مرزا سنگین بیگ اور یہ کتاب انہوں نے چارلس تھیوفیلس مٹکاف اور مسٹر ولیم فریزر کے کہنے پر لکھی۔ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے عمارات کے ساتھ ساتھ دلّی کے کوچہ و بازار کا ذکر بھی کیا۔ جامع مسجد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[25]:

"مسجد مذکور کے تین طرف سیڑھیوں کی تعداد اس طرح ہے۔ مشرق کی طرف ۳۵ شمال کی طرف ۳۹ اور جنوب کی طرف ۳۳۔ مشرقی سیڑھیوں پر روزانہ تیسرے پہر کبوتر اور ہر قسم کے جانور ہر موسم میں شوقینوں اور بچوں کے لیے بیچے جاتے ہیں۔ شمالی سیڑھیوں کے نیچے شام کے وقت ایک داستان گو آتا ہے اور قصے سناتا ہے۔ جنوبی سیڑھیوں پر تیسرے پہر کتابیں، ہتھیار اور ہر قسم کی دوسری اشیاء بکتی ہیں۔ مسجد کے پیچھے مغرب کی طرف دال فروش، مسکرات مثلاً افیون وغیرہ بیچنے والوں کی کوٹھی اور میدہ گروں کی دکانیں ہیں اور چاوڑی کے نام سے ایک مشہور بازار ہے۔ چاوڑی بازار کے شمال میں دارالشفاء کی عمارت ہے۔ اسے شاہ جہاں بادشاہ نے بیمار مسافروں اور طالب علموں کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ یہاں ان کا علاج ہوتا تھا اور انہیں شفا حاصل ہوتی تھی۔ یہاں بہادر علی خاں کی حویلی کا دروازہ چھتا شاہ نظام الدین کے دروازے کا راستہ ان کی حویلیاں، محلہ روشن پورہ اور نواب والا جناب اعظم الدولہ معین الملک نواب محمد امیر خان بہادر قسور جنگ کا اصطبل واقع ہیں۔ یہاں برگد کا ایک درخت ہے جو بڑ شاہ بولا کے نام سے مشہور ہے۔ شاہ بولا شاہجہان بادشاہ کے زمانے میں ایک درویش تھے۔ ان کی قبر اسی جگہ واقع ہے۔ یہاں کوچہ نائی واڑہ بھی ہے۔ اس کوچہ سے کوچہ چرخ والا تنگ کسیروں کی دکانیں ہیں جہاں تانبے پیتل کے برتن بکتے ہیں۔ بازار کے بیچوں بیچ ایک کھاری کنواں

ہے۔اس بازار میں قطبی بیگم اور حکیم بقاء کی حویلیاں اور اللہ آباد کی پولیس چوکی کی عمارت ہے۔یہاں بازار کے درمیان میں حوضِ قاضی ہے۔یہاں سرکی والوں کی دکانیں ہیں۔حویلی نواب ترک جنگ اور حویلی قطبی بیگم کے عقب میں ایک کوچہ ہے اور شاہ تارا کی گلی ہے۔یہاں رعایا کے مکانات ہیں۔یہاں سے شہر پناہ کے اجمیری دروازے تک جوتے بنانے والے موچیوں کی دکانیں ہیں۔اجمیری دروازے کے متصل شہر پناہ کی فصیل کا راستہ ہے اور گولہ اندازوں کے بارک ہیں۔چاوڑی بازار سے اجمیری دروازے تک جنوب کی طرف دارالبقاء کی عمارت واقع ہے۔یہ عمارت شاہجہان بادشاہ غازی نے فقراء، مساکین اور ضرورت مند مسافروں میں صدقہ وخیرات کی تقسیم کے لیے تعمیر کرائی تھی۔اس کے بعد چتلا دروازہ ہے جس میں عام لوگوں کے مکانات ہیں۔اس کا ایک دوسرا راستہ بادشاہ محمد اکبر شاہ غازی کے ماموں میر جھوما کی حویلی کی طرف جاتا ہے۔

چتلا دروازے سے اہل حرفہ اور کاغذیوں کی دکانیں ہیں، کوچہ میر عاشق اور کوچہ بتاشے والان ہے۔راجا کیدار ناتھ کی حویلی کی طرف ایک گلی ہے۔اس میں بقالوں اور لوہے والوں کی دکانیں اور کوچہ مرغاں ہے۔اس کا دوسرا راستہ املی کے محلے میں کھلتا ہے۔اس جگہ سے مذکورہ بالا حوضِ قاضی تک اللہ آباد پولیس چوکی کے سپاہیوں کی عمارت، پنجابی گاڑی بانوں کا کٹرا، محمد شاہ کے وزیر نواب قمرالدین خان کی حویلی، کٹڑا کی کچہری کی عمارت اور ٹھنڈے اور رتن بنیوں کی دکانیں ہیں۔یہاں محلہ جٹواڑہ بھی ہے۔شہر پناہ کے اجمیری دروازے کے نزدیک خلیل اللہ خان کی مسجد واقع ہے۔

نقشہ حوض قاضی

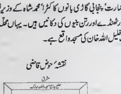

حوضِ قاضی کے شمال میں ریوڑی والے کی دکان راجا سیدھ مل کی حویلی، راجا جے سنگھ کی حویلی، نواب ترک جنگ بیدل جنگ خان مرحوم کی حویلی اور حافظ عبدالرحمٰن خان کی حویلی کا دروازہ ہے۔حافظ عبدالرحمٰن خان مرشد زادۂ برادر حضور والا یعنی مرزا نیلی کے مختارِ سرکار ہیں۔اس حویلی کے نزدیک مسماۃ بجنا طوائف کا مکان ہے۔یہ طوائف محرم کے ایامِ عشرہ میں دیو کا ایک بت بنا کر اپنے دروازے پر کھڑا کرتی ہے۔اسی راستہ میں تانبے کے برتن بنانے والوں کی دکانیں اور شادل خان مرحوم کی حویلی ہے۔اس کے بعد

نوراللہ خان کا مکان اور کوچہ پنڈت ہے۔ کوچہ پنڈت میں شاہ پسند خان اور سربلند خان کی حویلی' مرزا مینا بیگ خان اور عام لوگوں کے مکانات ہیں۔ یہاں سے ایک راستہ مذکورہ بالا کوچہ شاہ تارا میں بھی جاتا ہے۔

کوچہ پنڈت کے مقابل میاں جان صاحب مرحوم کی مسجد اور مکان ہے۔ چوڑی گروں کی دکانیں' بنجڑوں کا کٹرا' سبز مسجد اور کنواں اور آدینہ بیگ کا کٹرا ابھی اسی علاقے میں واقع ہے۔ سبز مسجد اور کنواں اور آدینہ بیگ کا کٹرا ابھی اسی علاقے میں واقع ہیں۔

سبز مسجد کے سامنے نواب فتح اللہ بیگ خاں کا بالا خانہ اور نواب سہراب جنگ قاسم خاں مرحوم کی حویلی کی جانب ایک گلی کا دروازہ ہے۔ اس گلی میں محمد خاں کٹراڑہ کی حویلی اور مسجد' نواب مغفور خاں کی حویلی اور طویلے کی عمارت' تیرانداز خاں کا مکان' نواب احمد بخش خاں کی حویلی اور فیض اللہ بیگ خان کا دیوان خانہ واقع ہیں۔ اس گلی کا راستہ بکی ماراں میں نکل جاتا ہے۔ یہاں نواب فتح اللہ بیگ کے مکان کے بعد مسجد خلیفہ بخشو علیہ الرحمۃ' کوچہ کھڑکی' فراش خانہ محلہ رودگراں' میر جملہ کے مکانات' خواجہ بھکاری صاحب کا مکان اور کاکوان صاحب کی حویلی ہے۔ خلیفہ بخشو کی مسجد کے بعد لوہاروں کی دکانیں اور تیرانداز خان کا مکان ہے۔ یہاں بازار کے بیچ میں ایک کنواں ہے جو لال کنواں کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے نزدیک کٹرا شیخ چاند ہے جہاں عام لوگوں کے مکانات ہیں.....میر جملہ کی حویلی' قاسم خاں کی پولیس چوکی کی عمارت اور کوچہ سموسہ ہے جس کا دوسرا راستہ شہر پناہ کی کھڑکی فراش خانہ کی طرف نکل جاتا ہے۔ اس کوچے میں حکیم ذکاء اللہ خاں وغیرہ کے مکانات اور نواب نجف خاں مغفور کی بنوائی ہوئی ایک حویلی ہے جو ناظر لطافت علی خاں کی حویلی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ عام لوگوں کے مکانات' مولوی قطب الدین صاحب ولد جناب مستطاب فخر العالم صدر المشائخ مولوی فخرالدین صاحب رحمتہ اللہ علیہ اور میر حامد علی صاحب پٹاباز کے مکانات ہیں۔ مذکورہ بالا کوچے کے باہر قاسم خان مرحوم کے سپاہیوں کی عمارت کے نزدیک پھول بیچنے والے کی دکان ہے۔ یہاں چابک سواروں کے دلال بیٹھتے ہیں۔ اس کے بعد مسجد فتح پوری کی جانب ایک کوچہ ہے۔ اس میں کٹرا گوندی' کٹرا ابڑیان یعنی بڑیاں بنانے والے' کلال خانہ اور رعیت کی دوسری حویلیاں ہیں۔ اس کے بعد نواب شہنواز خاں کی حویلی اور مسجد تہور خاں ہیں۔ پھر کھاری باؤلی اور نیا بانس کے بازار ہیں۔ کھاری باؤلی میں ایک باؤلی اور ایک مسجد واقع ہے۔

یہاں رعیت کی حویلیاں' دستکاروں اور ریوڑی والوں اور بتاشے والوں کی دکانیں ہیں۔

حوض قاضی کے جنوب سے شہر پناہ کے ترکمان دروازے تک دونوں طرف کی گلیوں کا ذکر سب سے پہلے حلوائی کی دکان الٰہی بازار کی گلی' کوچہ بلاقی رام' حافظ فدا کا بنگلہ' کوچہ مرغان رعیت کے مکانات' کشمیری پنڈتوں کے گھر' دودھادھاری کی حویلی پالم کے تحصیل دار لالہ گلاب رائے پنڈت کا مکان' کوچہ مائی داس اور تھان پنچ پیراں واقع ہیں۔ یہاں ایک دوسری گلی بھی ہے جو کوچہ بلاقی رام کی طرف جاتی ہے اور کوچہ شیدی

قاسم کے نام سے موسوم ہے۔ اس کوچے میں گوردھن کشمیری اور میر خان ٹنڈہ کی رہائش ہے جو ناچ گانے میں یکتا ہے۔ مرزا فتح اللہ بیگ چیلہ، مولوی فتح علی صاحب جاگیردار کی حویلی اور دیگر عام لوگوں کے مکانات ہیں۔ شہر پناہ کی فصیل کی طرف جانے والی گلی ہے۔ چرم ساز کھٹیکوں کی رہائش اور ان کی املاک ہیں۔ من سکھ رائے کاغذی کا باغیچہ، نواب مظفر خان کا حوض اور رعیت کے گھر ہیں۔

تھان پیچ پیراں سے حویلی لالہ بسنتی رام حویلی سدا سکھ پنڈت بازار سیتا رام اور جانی خان کا کٹرا ہے۔ یہاں عام لوگوں کی رہائش ہے۔ اس کے مقابل چھتہ شاہ حاجی کی طرف ایک کوچہ ہے۔ اس کے بعد دو راستے ہیں۔ ایک محلہ چوڑی گراں کی طرف اور دوسرا سیتل داس کے حمام کی طرف۔ سیتل داس شاہ عالم کے عہد کا شخص ہے۔ حویلی رائے شمبھوناتھ، مرتضیٰ خان کا طویلہ، راجا کیدار ناتھ کی حویلی، گاڑی بانوں کا کٹرا اور کھاری کنوئیں کے نزدیک ایک راستہ ہے۔ دوسرا راستہ شیدی فولاد خاں کے بنگلے کوچہ امام وغیرہ اور عام لوگوں کے مکانات کی طرف جاتا ہے۔ جانی خاں کے کٹرے سے تین راستے ہیں۔ ایک راستے پر کالی مسجد کا پچھواڑا، مظفر خان مذکور کا حوض اور جعلی داروں اور دوسرے راستے پر اہل حرفہ کی ریاست واقع ہے۔ اس سہ راہہ پر میر مرزا کی حویلی ہے جس کے دروازے پر صمد جیوسنار کی دکان ہے۔ یہاں سید حسن رسول نما کی اولاد میں سے میر علی تقی صاحب مرحوم کا مکان اور مسجد ہے۔ بھوجلہ پہاڑی اور محلہ بلبلی خانے کی طرف جانے والی گلیاں ہیں۔ یہاں شاہی توپ خانے کے داروغہ میر زا جبار بیگ خان، کشمیری پنڈتوں کے مکانات، نواب احمد بخش خان کے وکیل لالہ گوردھن داس اور عزیز اللہ خان کی حویلیاں اور عام لوگوں کے دوسرے مکانات ہیں۔

محلے کے دروازے کے سامنے باہر کی طرف شاہ حسین واعظ کی مسجد ہے۔ مسجد کے نزدیک دارالخلافے کے سابق صوبیدار شاہ حاجی بیگ صاحب کے مقبرے کا دروازہ ہے۔ اس کے بعد پہاڑی کی طرف حسن علی خان عرف میاں حسو، مرزا میر فتح علی شاہ صاحب کی حویلیاں، روشن موچی کا مکان اور چھتہ معماران کا راستہ ہے۔ مولوی محمد جان حافظ خیراتی صاحب کی حویلیاں اور عام لوگوں کے دوسرے مکانات ہیں۔ پہاڑی کے اوپر میر علی تقی صاحب کے مکان کے نزدیک سے ایک تیسرا راستہ ترکمان دروازے کی طرف نکل جاتا ہے۔ مغرب میں جنوبی بازار کی طرف کالی مسجد ہے جو دارالخلافے کی آبادی سے پہلے فیروز شاہ بادشاہ کے زمانے میں بنائی گئی تھی۔ اس کا اصل نام کلاں مسجد ہے۔ اس کے بعد حضرت شمس العارفین شاہ ترکمان بیابانی کی درگاہ ہے۔ اس علاقے میں سید نور علی خان اور دوسرے لوگوں کے مکانات ہیں۔ مظفر خان کا حوض، ترکمان دروازے کی پولیس چوکی کی عمارت اور سپاہیوں کے مکانات واقع ہیں۔ اس کے روبرو گڈریوں اور دوسرے لوگوں کی ملکیت ہے۔ ترکمان دروازے کے نزدیک ایک قدیم مسجد واقع ہے۔ اس کے بعد نواب سلیمان خان المعروف میر بھکاری کی حویلی ہے۔ پھر ترکمان دروازہ اور دروازے پر متعین سپاہیوں اور گولہ اندازوں کے مکانات ہیں۔

جامع مسجد کی جنوبی سیڑھیوں کے نیچے بساطیوں، کیول بانس والے، جوتے والوں، فتح جی اور کریم جی دستار فروشوں، دوسرے دست کاروں کی دکانیں اور امام کا کوچہ ہے۔ یہاں شیخ منگو کی حویلی اور دوسرے عام لوگوں کی رہائش ہے۔ یہاں ٹمیا محل بھی ہے، جہاں عام لوگوں کے مکانات ہیں۔ نواب احمد علی خان مرحوم کی حویلی ہے۔ ہزارہ بیگ کی حویلی اور بنگلہ شیدی فولاد خان ہیں جو محمد شاہ مرحوم کے عہد میں کوتوال شہر تھا۔ اس کے سامنے عزیز آبادی بیگم کی حویلی اور محلہ بھوجلہ پہاڑی کی طرف ایک گلی ہے۔ یہاں سے چھتہ شاہ جی اور دوسرے اطراف میں راستہ جاتا ہے۔ پہاڑی بھوجلہ کی پولیس چوکی کی عمارت ہے۔ اس کے پیچھے فیضو رکاب دار، تھانے کے سپاہیوں اور نواب مرتضیٰ خان کے مکانات ہیں۔ اہل حرفہ کی دکانیں ہیں۔ اس بازار میں ایک تراہا ہے۔ اس کا ایک راستہ ترکمان دروازے کی طرف جاتا ہے۔ اس کے شروع میں ایک مزار ہے جو چتلی قبر کے نام سے مشہور ہے۔ اس مزار کے مقابل کوچۂ پہاڑی ہے جس کے اوپر معماروں اور دوسرے عام لوگوں کی حویلیاں ہیں۔

یہاں سے ایک راستہ کوچہ بلبلی خانہ اور میر فتح اللہ شاہ مغفور کے مزار کی طرف جاتا ہے۔ اس کوچے میں میر محمدی صاحب کا مکان ہے۔ اس کے نزدیک اس کی مسجد، دستکاروں کی دکانیں اور پہاڑی کا دوسرا راستہ ہے۔ یہاں میر ہاشم صاحب کی حویلیاں اور حکیم سید قدرت اللہ خان کی مسجد ہے۔ مسجد کے نزدیک چھتا موم گراں اور میاں آفاق صاحب پیرزادہ کا مکان ہے۔ یہاں مرتضیٰ خان کی دوسری حویلی اور حکیم صاحب موصوف کا دیوان خانہ ہے۔ یہاں حضرت شاہ نظام علی صاحب کا مکان اور مرزا جانِ جاناں صاحب رحمتہ اللہ علیہ متخلص بہ مظہر کا مزار ہے۔ اس کے بعد شاہ علن کی ڈگڈگی اور ان کا مکان ہے۔ اس کے نزدیک حکیم قدرت اللہ خان اور حکیم عزت اللہ خان اور دوسرے عام لوگوں کی حویلیاں ہیں۔ حضرت شمس العارفین کی درگاہ کا راستہ ہے۔ اس کے بعد عام لوگوں کی حویلیاں اور محلہ کلیان پورہ واقع ہے، جس کا دوسرا راستہ گنج نواب میر خان کی طرف جاتا ہے۔ محلہ نوگھرہ کے مقابل گڈریوں کی رہائش گاہ کی جانب کوچہ اور ترکمان دروازے کا راستہ ہے۔ چتلی قبر سے دہلی دروازے تک دوسرے راستے پر سب سے پہلے اعظم خان کی حویلی ہے اور عام لوگوں کے اکثر مکانات ہیں۔ جفت سازوں کی املاک ہے۔ منڈی چہ بینہ اور حضرت فردوس منزل کے کلوخواص کی حویلی ہے۔ مولوی شاہ عبدالعزیز سلمہ اللہ تعالیٰ کی رہائش اور مدرسے کی عمارت ہے۔ شاہ جی کی مسجد، سوزن گردوں وغیرہ کی رہائش گاہ کا راستہ اور کوچہ چیلان ہے۔ یہاں ایک گلی نواب مہدی قلی خان مرحوم کی حویلی کی طرف جاتی ہے، جہاں دبیر الدولہ خواجہ فرید خان اور منشی خلیل اللہ خان رہتے ہیں۔ اس گلی کے نزدیک خواجہ میر درد صاحب اور عمر خان بڑھیچھ کے مکانات اور حکیم ثناء اللہ خان کی حویلی ہے۔ اس کے بعد حکیم نامدار خان اور کامدار خان کی حویلی اور مسجد ہے۔ عبدالرسول خان اور دوسرے لوگوں کے مکانات واقع ہیں۔ ایک گلی کلاں محل معروف بہ ''کالا محل'' کی جانب جاتی ہے۔ یہ نواب فیض محمد خان بہادر کی ملکیت ہے۔ یہاں فیض طلب خان کا

مکان رنگ محل وغیرہ زنانے کے مکانات اور ایک نئی مسجد واقع ہیں۔ اس گلی کا دوسرا راستہ دہلی دروازے کی طرف جاتا ہے۔ کلاں محل میں غلام احمد خان کوتوال معزول اور دوسرے لوگوں کے مکانات ہیں۔ کلاں محل کے شمال کی طرف شاہ عبدالعزیز کا قدیم مدرسہ اور میر صفدر علی صاحب جفار کا مکان ہے۔ اس کے بعد مٹیا محل کی عمارتوں کے پیچھے کوچہ چیلان کے نزدیک نواب میر خان مرحوم چھتا کا بازار ہے' محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں بہت بڑے امراء میں سے تھے۔ اس علاقے میں نواب مذکور کا گنج' نواب قلندر علی خان کی حویلیاں' باغیچہ اور قصاب پورہ واقع ہیں۔ اس کے بعد شہر پناہ کی فصیل اور میر خان کی کھڑکی ہے جو بند پڑی ہے۔

اس بازار میں نواب بیرم خان کا ترا ہا ہے۔ یہاں سے ایک راستہ نواب مہدی قلی خان کی حویلی کی طرف جاتا ہے' وہاں دو راستے ہیں ایک تھانہ گذر فیض بازار اور قاضی کی حویلیوں کی طرف اور دوسرا راستہ حکیم محسن خان رانا کے وکیل محمد علی خان' مولوی رفیع الدین صاحب مغفور اور دیگر لوگوں کے مکانات اور شاہی فوجدار میر نجف علی خان کی حویلیوں کی طرف جاتا ہے۔ اس کے قریب سید میر علی کا مکان' میرزا سلیم بہادر مرشد زادے کے مختار میرزا مغل کے مکانات اور فیض بازار کا راستہ ہے۔ تیسرا راستہ مہدی قلی خان کاسی کی حویلی سے جاتا ہے جو نواب نجف خان بہادر کے ملازمین میں سے تھے۔ حویلی کے نزدیک ایک قدیم مسجد "دائی والی مسجد" ہے۔ یہاں چھتہ لعل میاں ہے جس میں رعایا کے مکانات حکیم فیض علی خان مرحوم کی حویلی ہے۔"

اب تک ہم مرزا سنگین بیگ مرحوم کی انگلی پکڑے جامع مسجد کی سیڑھیوں سے اتر کر کوچہ و بازار کی سیر کر رہے تھے۔ اب آتے ہیں قلعۂ معلی کی جانب۔ دیکھیں! قلعہ کے اطراف مرزا صاحب ہمیں کیا کیا دکھاتے ہیں۔ قلعہ مبارک کے دہلی دروازے سے جہاں پیتل کی ایک توپ جو توپ مرنجی معروف بہ کالے خان ہے بے تخت پڑی ہوئی ہے۔ ناظر منظور علی خان کا مکان ہے اور سلطانوں اور مرشد زادوں کے مکانات ہیں جو نو محلہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے اندر اسد برج میں مرزا جہانگیر بہادر کا محل اور محمد اکبر بادشاہ غازی کے بھائی مرزا ایلیلی کی رہائش گاہ ہے۔ یہاں راستے میں ڈیوڑھی کی طرف خواص پورہ جلو خانے کا چوک اور نقار خانہ ہے۔ نقار خانے اور لاہوری دروازے کے چھتے کے درمیان چوک میں فیض نہر بہتی ہے۔ اس چھتے کے متصل ناظر عشرت علی خان کی حویلی ہے۔ لاہوری دروازے کے اوپر قلعے دار کپتان میکفارسن صاحب بہادر کی رہائش ہے اور رعایا اور شاہی ملازمین کے بیشتر مکانات ہیں۔

قلعے کے دہلی دروازے سے شہر پناہ کے اجمیری دروازے یعنی جنوب مغرب کی طرف سب سے پہلے چوک نواب سعد اللہ خان ہے جو شاہجہان بادشاہ غازی کے وزیر تھے۔ یہاں ہر سال غازی میاں اور "مدار شاہ" کی چھڑیاں کھڑی کی جاتی ہیں اور شہر کے لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔

چوک کے اردگرد مشرق کی جانب راج گھاٹ وغیرہ مغرب کی جانب خاص بازار' قلعہ مبارک کے لاہوری دروازے کی طرف شمال کی جانب نگمبو دو غیرہ۔ نواب بہادر خان کی سنہری مسجد اور اکبر آبادی

مسجد کی جانب جنوب میں کشمیری کٹرا اور دہلی دروازے کا راستہ وغیرہ۔ اس چوک کے مشرقی جانب محلہ کشتی بانان اور اسدعلی ہزاری کی حویلی' باغیچہ پائیں' پن چکی کی کھڑکی اور شہر پناہ کا راج گھاٹ کا دروازہ ہے۔ خاص چوک کی طرف دستکاروں کا بازار' دکانیں اور بازارِ خانم کا راستہ ہے۔ اس کے بعد شاہی آبدار خانے کے داروغہ عبدالرسول خان کی حویلی اور بلاقی بیگم کا کوچہ رعایا کے مکانات' بساطیوں کی دکانیں اور شاہ سرمد کے مزار کا احاطہ ہے انہیں عہد سلطان عالمگیر اورنگزیب کے دوران مجذوبیت کے عالم میں قتل کیا گیا تھا۔ اس کے متصل شاہ ہرے بھرے درویش کا مزار اور شاہی چینی خانے کی عمارت ہے جو جامع مسجد کے نیچے واقع ہے۔

سنہری مسجد کے پیچھے بھگو بیگم صاحبہ مرحوم بنت حضرت فردوس منزل کا مقبرہ ہے جو کوہ باری کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد مسجد اکبر آبادی واقع ہے جس کے نزدیک کشمیری کٹرا اور ٹکسال کی عمارت ہے۔ خان دوران خان کی حویلی اور نواب فیض محمد کے مکانات ہیں' اس کے مقابل دریا گنج کا دروازہ ہے۔ یہاں ایک دوسری گلی بھی ہے جہاں میاں صابر بخش کی سرائے اور مکانات اور نواب روشن الدولہ کی مسجد ہے۔ مسجد کے پیچھے قاضی کا مکان ہے۔

شہر پناہ کے دہلی دروازے کے نزدیک رائے پران کشن' لالہ گور پرشاد اور دوسرے لوگوں کے مکانات ہیں۔ فیض بازار کی پولیس چوکی عمارت کے نزدیک ایک گلی ہے جو نواب بہادر علی خان کے باغیچے اور دریا گنج کی طرف کھلتی ہے۔ یہاں صاحبان عالیشان کی کوٹھیاں' شہر کی پلٹن کی چھاؤنی' توپخانے کی عمارت' لمستر سودا گر' نواب احمد بخش خان بہادر کی کوٹھیاں اور زینت المساجد واقع ہیں.....

اس کے نزدیک شہر پناہ کا دروازہ ہے۔ میکوزین اور بلبھ گڑھ کے راجا کنور راج سنگھ کا مکان ہے' جو دارالخلافہ کے نواحی علاقے کے فوجدار بھی ہیں۔ یہاں پر نواب فیض محمد خان کی کوٹھی' شہر پناہ کا نیلا برج اور انگریز صاحبوں کے رہائشی بنگلے ہیں۔

سعد اللہ خان کے چوک کے شمال میں قلعہ مبارک کے لاہوری دروازے کی جانب ایک طرف قلعہ ہے اور دوسری طرف منشی نین کنول کے باغ کا دروازہ' رعیت کی رہائش مرزا ولی عہد بہادر کا فیل خانہ اور اردو بازار ہے۔

قلعہ مبارک کے لاہور دروازے سے شہر پناہ کے لاہوری دروازے تک شمالی بازار کی طرف سب سے پہلے دہنی صاحب اور کٹن صاحب اور قاضی کی مسجد واقع ہیں۔ مذکورہ مسجد کے قریب میول صاحب کی دکانیں' دولت النساء بیگم کی حویلی' بھاگ سنگھ کا مکان' زیب النساء بیگم صاحبہ زوجہ سمرو صاحب کی کوٹھی اور کاغذیوں کی دکانیں ہیں۔ یہ دکانیں سکھ چند ساہو کی ملکیت ہیں۔

سکھ چند ساہو کا مکان' گل فروشوں کی منڈی' شراب خانہ' ممتاز گنج اور شاہی توپخانہ ہے جس میں

اب گاڑی بان رہتے ہیں۔ اس کے بعد کوڑیا پل ہے۔ جس کے نیچے سے فیض نہر جاری ہے۔ ایک ترا ہا ہے جہاں سے کناری بازار، جوہری بازار اور سعد الدولہ کی مسجد کا راستہ ہے۔ مسجد کے نزدیک کوچہ ٹنڈاں ہے۔ جہاں عام لوگ رہتے ہیں۔ یہاں میر عسکری کا امام باڑہ اور چاندنی چوک بھی ہے۔ باغ بیگم کا دروازہ کوچہ قابل عطار ہے۔ کٹڑا فیل ہے۔ کوچہ برج ناتھ، کوچہ گھاسی رام اور چھتا جان نثار خان ہے۔

اس کوچے کے بعد گندھی گلی اور بازار مزید پارچہ ہے جس میں بزازوں کی دکانیں اور محمد بخش عرف موی کی حویلی واقع ہے۔ بازار کے بعد کٹڑا میدان گراں ہے اور کوچہ حبش خان ہے۔ حبش خان اورنگ زیب کے غلاموں میں سے تھے۔ ان کی عمر تقریباً ایک سو پندرہ برس کی ہو گئی تھی، لیکن اس عمر میں بھی ایک بھنی ہوئی سالم بھیڑ کھا جاتے تھے۔

اس گلی میں نواب سعادت خان کی جائیداد ہے۔ نواب صفدر جنگ کی حویلی ہے جس کے عقب میں بوسعید خان کی مسجد ہے۔ اسی گلی میں نواب عباس قلی خان کی حویلی ہے۔ یہاں کٹڑا روغن زرد اور نہر سعادت خان واقع ہے۔ نہر کے کنارے مسجد نواب غازی الدین ہے۔ اس کے نزدیک کٹڑا گاڑی بانان اور لالہ ہرنارائن کا انگریزی ڈھنگ پر بنا ہوا نیا مکان ہے۔

کٹڑا سعادت خان، نواب احمد علی خان کا مکان، خان جہاں کی حویلی اور شہر پناہ کا کابلی دروازہ ہے۔ کوچہ حبش خان کے بعد کوچہ چیلاں ہے یعنی شاہجہان بادشاہ کے چیلہ فتح محمد کا کوچہ اس کے اندر رعایا کی حویلیاں، نواب شمس الدولہ کی حویلی اور شہر پناہ کا لاہوری دروازہ ہے۔ قلعہ مبارک کے لاہوری دروازے سے شہر پناہ کے لاہوری دروازے تک جنوب کی طرف بازار کی تفصیل: اردو بازار، باغ کلاں، شاہزادہ مرزا جہانگیر بہادر کا فیل خانہ اور کوچہ بلاقی بیگم ہے۔ اس کا دوسرا راستہ دریبہ کلاں میں نکل جاتا ہے۔ اسی علاقے میں ڈاک گھر اور خونی دروازہ واقع ہیں۔ بازار دریبہ کلاں میں کٹڑا مشروع اور مہاجنوں کی حویلیاں اور کوٹھیاں ہیں۔ اس بازار میں دونوں طرف صرافوں کی دکانیں، شرف الدولہ کی مسجد اور مدرسے کی عمارت ہے۔ اس کے سامنے حکیم میر علی صاحب کا مکان اور گھنش حلوائی کی مشہور دکان ہے۔ اس کے سامنے ایک گلی ہے جو دریبہ خرد، روشن پورہ، چھتا شاہ جی، کوچہ نکی ماراں اور کوچہ جوگی داڑان کی طرف نکل جاتی ہے۔ گھنش حلوائی کی دکان سے ایک راستے پر دریبے کی پولیس چوکی، حویلی مگر سیٹھ، کوچہ انار وغیرہ اور جامع مسجد کی جانب رہٹ کا محلہ واقع ہے۔ خونی دروازے پر بساطیوں کی دکانیں ہیں۔ کوتوالی کا چبوترہ ہے جہاں قیدی بند کیے جاتے ہیں۔ چبوترے کے سامنے ایک مضبوط لکڑی نصب ہے جو لال خان کے لکڑ کے نام سے معروف ہے۔ اس لکڑی سے مجرموں کو باندھ کر مارتے پیٹتے ہیں۔ قدیم زمانے سے اس جگہ ایک چرخی اس نقشے کے مطابق قائم تھی، جہاں خونی کو قتل کیا جاتا تھا۔ کوتوالی کے چبوترے سے ملحق نواب روشن الدولہ کا مدرسہ واقع ہے۔ اس علاقے میں رعایا کی حویلیاں، راو ھاکشن وکیل کے مکانات جو تے

دہلی کا مشہور کشمیری دروازہ

پرانی دہلی کے ایک بازار کا منظر، عقب میں جامع مسجد جس کا گنبد دکھائی دے رہا ہے۔

والوں کی دکانیں مرزا اشرف بیگ کا گھڑیال' ان کا شیش محل واقع ہیں۔ دریبہ خرد کے کوچے میں حلوائیوں' کنجاحل وغیرہ صرافوں' بزازوں اور جوہریوں کے مکانات ہیں۔ یہاں چھپی اور بی جان نامی طوائفیں رہتی ہیں۔ حکیم رکن الدین خان کی حویلی اور کوچہ مالی واڑہ کا دروازہ ہے۔ اس میں حکیم اجیت سنگھ اور کپتان منویل صاحب وغیرہ کی حویلی ہے۔

دریبہ خرد کے دروازے سے علاقہ بندوں' بادلا اور ستارہ فروشوں کی دکانیں' رکن الدین خان کی حویلی کا دروازہ' لالہ سودا گرمل کی کوٹھی' لطف علی خان کے لڑکے نجف علی اور ابراہیم علی خاں کی حویلی' بزازوں کا کٹرا' کٹرا اشرفی' کٹرا انند داور کوچہ خان چند واقع ہیں۔ اس کے بعد چاندنی چوک جہاں آراء بیگم کا حمام اور باغ ہیں۔ اس چوک میں زین سازوں اور دیگر اہل حرفہ کی دکانیں ہیں۔ اس کے بعد کوچہ رائے مان اور منصور کے بھائی غلام مرتضیٰ خان کی حویلی ہے۔ اس کے علاوہ میر عظیم اللہ اور میر خرد کی حویلیاں' کرنل سکنر صاحب کی حویلی کا راستہ اور پنساریوں عطاروں کی دکانیں ہیں۔

نیچے بندوں کا کوچہ ہے جہاں نیچے بندوں اور ابریشم والوں کی دکانیں اور رعایا کے مکانات ہیں۔ عنایت اللہ خان' نواب نجف قلی خان اور میر عظیم اللہ خان عرف میر خیراتی کے مکانات' نواب حسام الدین حیدر خان کی رہائش اور حکیم میاں جان کی حویلیاں ہیں۔ ایک کوچہ نواب فیضان بیگ خان کی حویلیوں اور حکیم میر شریف خان مرحوم کی حویلی اور مسجد کی طرف جاتا ہے۔

سکنر صاحب بہادر کی بنوائی ہوئی نواب احمد بخش خان کی حویلی ہے۔ سامنے کوچہ جوگی واڑہ ہے۔ امام قلی بیگ خان کی حویلیاں اور شاہی کیلی خانے کے داروغہ مرزا قلندر بیگ کا مکان اور شیر افگن خان کی حویلی ہے۔ ایک گلی مالی واڑے کی طرف جاتی ہے۔

اس کے بعد بخشی بھوانی شنکر کی حویلی' چنے والوں کی دکانیں منشی نیک چند کا مکان' کوچہ پیپل مہادیو' صوفی اللہ یار خان' راجہ جے سکھ رائے وغیرہ کی حویلیاں' حکیم بقا کے لڑکوں کا مکان ہے۔ چنے والوں کی دکانوں سے متصل بیگن طوائف کی حویلی ہے۔ یہاں سے ایک راستہ روشن پورہ کی طرف جاتا ہے۔ اس سمت میں لالہ موہن لال کی حویلی' لالہ تن سکھ رائے کا چھتا' لالہ سکھ چند کی کوٹھی' بخشی رام گڑ والے کے مکانات' محلّہ مسجد کھجور اور لالہ سکھ چند کا بنایا ہوا کوچہ اور ڈیرہ ہیں۔ یہاں سے ایک راستہ کوچہ انار اور رعایا کی حویلیوں' لالہ فقیر چند کی کوٹھی اور لالہ سکھ لال وغیرہ کے مکانات کی طرف جاتا ہے۔

کوچہ بلی ماران سے:

چاندنی چوک کی پولیس چوکی' ریوڑی والوں کا کٹرا' نواب حیدر قلی خان کی حویلی ہے۔ یہ گاڑی بانوں کی ریاست ہے۔ یہاں شاہجہان کی خواص مسماۃ فتح پوری بیگم کی بنوائی ہوئی مسجد اور کٹرا اور دکانیں ہیں۔ مسجد کے جنوب میں بازار ہے جہاں کٹرا اغلام محمد خان' کٹرا گوندی وغیرہ اور حافظ الٰہی بخش بساطی

کی دکانیں ہیں۔ یہاں میوہ گروں کی دکانیں، کوچہ کھاری باؤلی بتاشے والوں کی دکانیں، پنساریوں کی دکانیں اور محمد امین عطار کی دکانیں واقع ہیں۔

کوچہ نیا بانس، لاہوری دروازے کی پولیس چوکی اور تھانے کی عمارت ہے جو لاہوری دروازے سے متصل ہے۔

قلعہ مبارک کے لاہوری دروازے سے مسجد فتح پوری تک:

بازار کے درمیان فیض نہر جاری ہے۔ نگم بودھ گھاٹ کا چھتا ہے۔ اس کے اندر کساتنوں کے مکان اور ٹھاکر دوار ہیں۔ یہاں ملاحوں کی ریاست ہے۔ پولیس چوکی ہے، دریائے جمنا کے گھاٹ چھتریاں اور ہندوؤں کی عبادت گاہیں واقع ہیں۔ نگم بودھ گھاٹ کا دروازہ ہے۔ شہر پناہ کی فصیل، بانس والوں کے مکانات، انگریز صاحبوں کا قبرستان، شہزادہ داراشکوہ کی حویلی، نزدیک رکھی ہوئی ایک توپ ہے۔ سارجن کا بنگلہ اور بارک ہے۔ میگزین ہے۔ گولہ اندازوں کی چھاؤنی کے الٹے ہاتھ سواروں کی خاص لین ہے۔ مرحوم صفدر جنگ کی حویلی، عقب میں کاغذیوں کے مکانات، شاہ آبادانی صاحب کا مزار بیگم سمرو کے باغ کا دروازہ ان کے سواروں کی چھاؤنی کا احاطہ اور گھسیاروں کی آبادی ہے۔ صفدر جنگ کی حویلی کے عقب میں حمام ہے اور فیض نہر ہے۔ باغ کے پیچھے قلعہ کی طرف اختر لونی صاحب کا مکان، کپتان صاحب کی کوٹھی، ریذیڈنٹ کی کوٹھی، شہر پناہ کا دروازہ اور دریا کا کنارہ ہے۔ نواب عبداللہ خان کی حویلی اور مسجد ہے۔

یہاں کٹرا بادل پورہ، ڈنڈی صاحب کی کوٹھی، انگریزی ڈاک خانے کی عمارت، ڈنڈی صاحب کی پلٹن کی چھاؤنی، نصیر گنج کی سمت راستہ، صاحبہ محل کی حویلی کا راستہ، داراشکوہ کا طویلہ، عام لوگوں کے مکانات، زینت باڑی اور ایک باغیچہ ہے جس میں شہزادوں کی قبریں اور زینت النساء بیگم کا مزار ہے۔ اس کے نزدیک کٹرا میوہ ہے جو پنجابی کٹڑے کے نام سے مشہور ہے۔ اعتقاد خان کی پولیس چوکی ہے۔ سید فیروز کا بنگلہ، حضرت شاہ مردان کا پنجہ اور معروف گلی کنجی ہے اور موری دروازے کی جانب راستہ ہے۔ اعتقاد خان کی چوکی سے محلہ دھوبی واڑہ، پیپل والا کنواں، لین خاص میں اسماعیل بیگ، رسالدار کا مکان اور کابل دروازے کی طرف ایک کوچہ ہیں۔ اس علاقے میں اسماعیل خان کی حویلی، سید رضی خان کا مکان، عام لوگوں کے مکانات اور کابلی دروازہ ہیں جہاں سے فیض نہر شہر میں داخل ہوتی ہے۔

ریذیڈنٹ صاحب بہادر کی کوٹھی کے عقب سے ایک راستہ کشمیری دروازے کی طرف نکل جاتا ہے۔ اس بازار کے درمیان میں کشمیری دروازے کی پولیس چوکی ہے۔ کرنل جیمس سکنر صاحب کی کوٹھی اور مسجد بنام فخر المساجد ہے۔ مسجد کے اوپر (نصیر گنج) تلنگوں کی پلٹن کی چھاؤنی اور کشمیری دروازے کا راستہ ہے۔

اس تمام تفصیل کو پڑھ کر قاری کو بوریت اور یکسانیت تو ضرور محسوس ہوگی لیکن اس کی اہمیت بہر حال ہے کہ اس میں دلّی کی اس عہد کی تقریباً تمام Who's Who موجود ہے۔ مزید برآں عمارات، مساجد، کوچہ و بازار، صنعت و حرفت، مراکز تجارت اور انتظامی مراکز کا ایک اجمالی جائزہ بھی ہے۔

حوالہ جات

1 تا 18 خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1993ء

19- چراغ دہلی از مرزا حیرت دہلوی، کرزن پریس دہلی۔

Historic Delhi. By H. K. KAUL Oxford Press, India -20

22-21 فسانہ غالب از مالک رام۔

Historic Delhi. H. K. Kaul, Oxford Press India. 24-23

25- سیر المنازل مرزا سنگین بیگ ترجمہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی۔ اردو اکادمی دہلی۔

قلعہ معلّٰی

’’کاش آپ یہاں ہوتے میرا حال دیکھتے تو جانتے ہر روز صبح کو قلعہ جانا‘ دوپہر کو آنا بعد کھانے کے حضرت کے مسودوں کو درست کرنا۔‘‘ (غالب بنام قدر بلگرامی ۱۸۵۷ء[1])

’’صبح کو قلعہ جاتا ہوں۔ دوپہر کو آتا ہوں۔ کھانا کھا کر پانچ چار گھڑی دم لے کر جاتا ہوں۔ چراغ جلے آتا ہوں۔‘‘ (بنام نبی بخش حقیر[2])

شاہجہان بادشاہ نے ۵ ذوالحجہ ۱۰۴۸ ہجری مطابق ۱۶۳۹ کو قلعے کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ قلعہ و محلات کی تعمیر میں ۹ سال اور تین ماہ لگے۔ شاہجہان اور اورنگ زیب کے ادوار میں اسے قلعہ مبارک یا قلعہ شاہجہان آباد کہا جاتا تھا۔ بہادر شاہ ثانی کے عہد میں یہ قلعہ معلّٰی کہلایا[3]۔ آج اسے لال قلعہ کہا جاتا ہے۔ باقی نام صرف تاریخ کی کتابوں میں ہیں۔ یہ نام آج بھی خلقِ خدا کی زبانوں پر ہے‘ کیونکہ خلق اسے ہمیشہ لال قلعہ ہی کہتی آئی ہے۔

قلعہ کی عمارت ہشت پہلو ہے۔ اس کے مشرقی اور مغربی اضلاع باقی اضلاع کی نسبت طویل ہیں۔ قلعے کی لمبائی ایک ہزار شاہ جہانی گز چوڑائی تین سو گز دیواروں کی اونچائی پچیس گز‘ زمین کے نیچے اس کی بنیادوں کی لمبائی اور چوڑائی پندرہ گز اور زمین کے اوپر کا عرض دس گز ہے۔ قلعے کا محیط تین ہزار تین سو گز ہے اور رقبہ چھ لاکھ گز[4]۔

سیر المنازل کے مطابق قلعے کی تعمیر پر ۵۹ لاکھ پانچ ہزار روپے کے اخراجات ہوئے۔ دیگر روایتوں میں ایک کروڑ۔ قلعے کے چار دروازے اور دو کھڑکیاں اور اکیس برج ہیں۔ ان میں سات مدور اور چودہ مثمن ہیں۔ قلعے کے اندر مختلف عمارات برج شمالی سے اس ترتیب کے ساتھ تعمیر کی گئی تھیں‘ باغ حیات بخش بادشاہ کی آرام گاہ‘ برج طلا امتیاز محل‘ جہاں آراء بیگم کی خواب گاہ‘ خدام کی رہائش گاہیں۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۰۵۸ ہجری (۱۶۴۸ء) کو شاہجہان دریا کے کنارے والے دروازے سے جو شاہ محل میں کھلتا ہے‘ قلعے اور دولت خانہ خاص میں داخل ہوئے۔ شہزادہ دارا شکوہ ظلِ سبحانی کے سر مبارک پر سے سونا چاندی نچھاور کرتے رہے اور کہا جاتا ہے

کہ اتنا سیم وزر نچھاور کیا گیا کہ فقرا مالا مال ہو گئے۔ مہتمم عمارات مکرمت خان کو پنج ہزاری منصب عطا کیا گیا[5]۔

لاہور دروازے سے قلعہ معلی کے اندر داخل ہوں تو سب سے پہلے نقار خانے کی عمارت آتی ہے، جہاں دن میں پانچ بار نوبت بجائی جاتی تھی۔ ہفتہ اور اتوار کو دن بھر نوبت بجتی تھی۔ نوبت خانے کے دروازہ میں کوئی شخص سوائے شہزادوں کے سوار ہو کر نہیں جا سکتا تھا۔

سب وزراء و امراء سواری سے اتر کر پیدل دیوانِ عام تک جاتے تھے[6]۔ ایک بار دہلی کے ریذیڈنٹ فرانسس ہاکنس گھوڑے پر سوار اندر چلے گئے اور اس جرم میں برخاست کر دیے گئے[7]۔

نقار خانے کے بعد دیوان عام کی عمارت ہے جہاں شاہ جہان سے لے کر شاہ عالم ثانی تک بادشاہوں کے دربار منعقد ہوتے رہے۔ دیوان عام کی عمارت سنگ سرخ سے بنی ہوئی ہے۔ اس کے صحن کے لیے ۷۰ گز لمبا ۴۵ گز چوڑا اور ۲۵ گز بلند ایک شامیانہ دل بادل ایک لاکھ روپے کی لاگت سے تیار کرایا گیا تھا۔ شامیانہ کی چوبیں اور کٹہرے چاندی کے تھے۔ اس کے نیچے دو ہزار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ دربار کے وقت تخت کے چاروں طرف سونے کا کٹہرا نصب کیا جاتا اور تخت شاہی پر جواہرات سے مرصع سونے کی چوبوں اور موتیوں کی جھالروں سے مزین ایک اور شامیانہ تانا جاتا تھا۔ دربار کے دوران بادشاہ سلامت کے سامنے گھوڑوں اور ہاتھیوں کی پریڈ ہوتی۔ جانور اور پرندے گزارے جاتے یا پیش کیے جاتے۔ ایک یا دو امراء کی فوج بھی بادشاہ کے سامنے پیش کی جاتی۔ پھر رعایا کی عرضیاں پیش کی جاتیں جن پر بادشاہ احکامات جاری کرتے[8]۔

دیوانِ عام سے ملا ہوا ایک جالی دار دروازہ تھا جس کے اندر دیوانِ خاص کا جلو خانہ تھا۔ اس جلوخانے میں انجمن دیوانِ خاص تھی جس کی چھت چاندی کی تھی۔ اس کے اندر لال پردے کا دروازہ تھا۔ یہاں بادشاہ کے امراء و ملازمین ظل سبحانی کے حضور قدم بوسی کے لیے باریاب ہوتے۔ اس کے اندر محل معلیٰ، حضور والا کے بیٹھنے کا برج مثمن، موتی مسجد، حمام کا پچھوڑا اور جامہ کن تھا۔ اندر موتی محل، پھر شاہ برج، شمالی اور جنوبی والان، ساون بھادوں کے نام سے مشہور حیات بخش باغ تھا۔ موتی محل کے سامنے اور وسط میں سنگ مرمر کے بنے ہوئے حوض تھے جو ایک ہی پتھر کے بنے ہوئے تھے۔ ان میں کوئی جوڑ نہیں تھا۔ موتی محل کے دونوں طرف نہر بہتی تھی[9]۔

باغ کا ایک حصہ جو مہتاب باغ کہلاتا تھا، اس میں ایک عمارت تھی جس میں پیغمبر اسلامؐ کے تبرکات رکھے گئے تھے۔ یہیں عدالت خانے کی عمارت بھی تھی[13]۔

دیوان عام کے شمال میں ایک دروازہ تھا، جس کے باہر بادشاہ کا اصطبل اور خاصہ کلاں وخرو تھا۔ مہتاب باغ کے عقب میں بادشاہ سلامت کی رہائش اور شاہی توپ خانے کی عمارت تھی۔

دیوانِ خاص کا طول ۹۰ کھرے فٹ اور عرض سڑسٹھ ۶۷ فٹ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی عمارت

شاہجہانی عمارات میں سب سے زیادہ خوبصورت اور آراستہ تھی۔ دیواروں اور ستونوں کے نچلے حصوں پر قیمتی پتھروں سے پچی کاری کا کام کیا گیا تھا اور اوپری حصوں پر سنہری نقاشی تھی۔ اس کی چھت چاندی کی تھی اور اس کے پھولوں پر سونے کا کام تھا۔ ۱۷۶۰ء میں جاٹوں اور مرہٹوں نے اس چھت کو اکھاڑ کر پگھلایا تو اٹھائیس لاکھ روپے کی چاندی حاصل ہوئی۔[11]

کبھی یہاں تخت طاؤس رکھا جاتا تھا جو نو کروڑ روپیہ کے خرچ سے تیار ہوا تھا۔ اس پر جواہرات سے مرصع دو مور بنے تھے جن کے درمیان ہیرے موتیوں لعل و زمرد سے جڑا ہوا ایک درخت تھا۔ تخت کی چھت کے اندر کی جانب مینا کاری کی گئی تھی اور یہ لعل و یاقوت سے جڑے ہوئے بارہ ستونوں پر قائم تھا۔ زینے چاندی کے تھے۔ یہ تخت ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ لے گیا۔ تخت طاؤس اور کوہ نور سمیت نادر شاہ کوئی ستر کروڑ روپے کے غنائم و تی سے ایران لے گیا۔ اسی دیوان خاص میں بیٹھ کر نادر شاہ نے محمد شاہ کو اس کی سلطنت واپس کی تھی۔

یہیں ۱۷۸۷ء میں غلام قادر روہیلے نے شاہ عالم کو بینائی سے محروم کیا تھا اور یہیں ۱۸۰۲ء میں نابینا بادشاہ شاہ عالم نے فاتح لارڈ لیک کا استقبال کیا تھا۔[12]

جب غلام قادر روہیلے کے حکم سے شاہ عالم کی آنکھیں نکالی گئیں تو اس نے طنزاً کہا "کیا دکھائی دے رہا ہے بادشاہ سلامت؟ شاہ عالم نے فوراً جواب دیا" قرآن جو میرے اور تیرے درمیان ہے"۔[13]

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مرہٹوں نے روہیلوں پر فتح پائی اور غلام قادر کو پنجرے میں بند کر کے ساتھ لے گئے۔ ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ درانی نے بھی دیوان خاص کو لوٹا تھا۔ احمد شاہ کے لوٹ کے مال میں ایک مغل شہزادی بھی شامل تھی۔[14]

قلعہ معلّی کے اندر کئی شاندار عمارات ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد انگریزوں نے مسمار کر دیں اور وہاں سپاہیوں کی بیرکیں تعمیر کر لیں۔

دیوانِ خاص کے ساتھ ہی شاہی حمام تھے۔ حمام کے اندر تین درجے تھے۔ پہلے درجے کو جامہ کن یعنی لباس اتارنے کی جگہ کہا جاتا تھا۔ یہاں سنگ مرمر کے دو حوض تھے۔ ایک میں گلاب کا فوارہ چلتا تھا اور دوسرے میں اعلیٰ قسم کی خوشبوئیں مہکتی تھیں۔

دوسرے درجے کے درمیان میں ایک حوض تھا' اسے حسب ضرورت سرد یا گرم حمام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں سنگ مرمر کی ایک نہایت نفیس اور خوبصورت جا نماز رکھی تھی جس پر غسل کے بعد بادشاہ نماز ادا کرتے تھے۔

تیسرا درجہ گرم خانہ تھا' اس کے مغرب میں انگیٹھی تھی۔ مشہور ہے کہ یہ سوا سومن لکڑی سے گرم ہوتا تھا۔ اس میں موجود حوض کے چاروں کونوں پر طلائی فوارے لگے تھے جن میں سے پانی چھوٹتا تھا اور بیچ کا فوارہ چاندی کا تھا جس میں سے پانی اور عرق گلاب کا محلول نکلتا تھا۔[15]

عہد شاہ جہانی میں قلعہ میں کوئی مسجد نہ تھی۔ وہ جامع مسجد جایا کرتے تھے۔ اورنگ زیب نے ۱۶۶۲ء میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے کے مصرف سے قلعہ میں موتی مسجد بنوائی۔

باغ حیات بخش کے جنوب میں ساون اور بھادوں نام کی دو عمارتیں تھیں۔

یہ عمارتیں سنگ مرمر سے بنی تھیں اور دونوں میں ایک حوض تھا جن میں ایک نہر داخل ہوتی تھی اور آبشار کی مانند گرتی تھی اور پھر حوض سے ایک آبشار نکل کر دوبارہ نہر کی شکل اختیار کرلیتی تھی۔ ساون میں پانی کی آمد اور زور وشور سے بہاؤ ساون کی بارش کا تاثر دیتا تھا جبکہ بھادوں میں اتنا زور وشور نہیں ہوتا تھا۔ نہر بہشت سے آئے ہوئے پانی کی چادر حوض میں پڑتی تھی۔ پانی نسبتاً پرسکون ہوجاتا اور پھر باہر نکل کر گرتا۔ گویا بھادوں کی بارش کا سماں ہوتا[16]۔

اگر کوئی حیات بخش باغ کی آبشاروں کے پاس کھڑے ہوکر نگاہ اوپر اٹھاتا تو ایک بانکی نظر آتی جس کے اختتام پر شاہ برج تھا۔ یہاں بادشاہ اپنے وزراء کے ساتھ انتہائی اہم مجالس مشاورت منعقد کیا کرتے تھے۔ اس میں سنگ مرمر کا ایک خوبصورت دالان ایک حوض اور آبشاریں تھیں۔ اس کی چھتری نما چھت تھی جس میں قیمتی پتھر جڑے تھے۔

روہیلوں نے پتھر نکال لیے اور اسے توڑ پھوڑ دیا۔ پھر ۱۸۵۷ء میں برطانوی فوج نے اس میں تبدیلیاں کیں۔ یہاں ایک چھوٹا برج اکبر شاہ ثانی نے بھی تعمیر کیا۔ اکبر شاہ اور بہادر شاہ ظفر اکثر یہاں بیٹھا کرتے تھے۔ ۱۷۸۷ء میں شاہ عالم ثانی کے فرزند اور ولی عہد شہزادہ جہاندار بخت اسی برج سے ایک رسی کے ذریعے اتر کر فرار ہوگئے اور دلّی سے دکن چلے گئے[17]۔

قلعہ معلّٰی کے آخری مکین انگریزوں کے پنشن خوار بادشاہ بہادر شاہ ظفر تھے انہیں بتایا گیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد کو قلعہ خالی کرنا پڑے گا لیکن یہ نوبت نہ آئی۔ غدر کی ناکامی کے بعد بادشاہ انگریزوں کے قیدی بن گئے اور جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیئے گئے۔

بہادر شاہ ظفر کے ایک دربار کا ذکر بزم آخر کے مصنف منشی فیض الدین کی زبانی:

''دیکھو سب امراء نقارخانے کے دروازے پر سے اتر کر پیدل دیوانِ عام میں چلے آتے ہیں۔ یہ پہلی آداب گاہ ہے۔ دیوانِ عام میں جالی کے دروازے میں دیکھنا کیسی موٹی سی لوہے کی زنجیر آڑی پڑی ہوئی ہے کہ آدمی سیدھا نہیں جاسکتا۔ سب جھک جھک کر زنجیر کے نیچے سے جاتے ہیں۔ یہ دوسری آداب گاہ ہے۔ اے لو! دیوان خاص کے دروازے پر کیا بڑا سا پردہ لال بنات کا کھنچا ہوا ہے۔ یہ لال پردہ کہلاتا ہے۔ مردھے پیادے دربان سپاہی قلار ہاتھوں میں لال لال لکڑیاں لیے کھڑے ہیں جو کوئی غیر آدمی اندر جانے کا ارادہ کرے تو قلاروہی لال لکڑی آنکڑے دار گردن میں ڈال کھینچ کر باہر نکال دیتے ہیں مگر جشن کے دن حکم عام تھا کہ جس کا جی چاہے پگڑی باندھ کر چلا آئے۔ دربار کی سیر دیکھے۔ دیکھو لال پردے کے پاس کھڑے ہوکر

پہلے مجرا کرے کہ یہ تیسری آداب گاہ ہے۔ پھر دیوان خاص میں تخت کے سامنے آداب بجا کر اپنی اپنی جائے پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دیکھو دیوان خاص میں فرش وفروش کیا ہوا ہے باناتی پردے کھنچے ہوئے ہیں۔ بیچوں بیچ میں سنگ مرمر کے ہشت پہلو چبوترے پر تخت طاؤس لگا ہوا ہے۔ اس کے آگے دلدا پیش گیر کھنچا ہوا ہے۔

دیکھنا کیا خوبصورت تخت بنا ہوا ہے۔ چاروں طرف تین تین در کیسے خوشنما محرابوں کے ہیں۔ گرد کٹہرا پشت پر تکیہ' آگے تین سیڑھیاں اوپر بنگلے نما گول چھت محراب دار' اس پر سونے کی کلیاں' سامنے محراب پر دو مور آمنے سامنے موتیوں کی تسبیحاں منہ میں لیے ہوئے کھڑے ہیں۔ سر سے پاؤں تک سونے میں لپا ہوا جگمگا رہا ہے۔ بیچ میں رومی مخمل اور زربفت کا مسند تکیہ لگا ہوا ہے۔ دو خواص ہما کے مورچھل لیے اہلو پہلو میں کھڑے ہیں۔ پیچھے ایک جاء نماز بچھی ہے۔ معتبر الدولہ اعتبار الملک بہادر وزیر' عمدۃ الحکماء حاذقِ زماں احترام الدولہ بہادر' شمس الدولہ بہادر' معین الدولہ بہادر' سیف الدولہ بہادر' انیس الدولہ بہادر' راجہ مرزا بہادر' راجہ بہادر' غیاث الدولہ بہادر' سبحان زمان' نجم الدولہ بہادر (غالب) وقار الدولہ بہادر' مصلح الدولہ بہادر' علاء الدولہ بہادر' موسس الدولہ بہادر' سرفراز الدولہ بہادر' میر عدل بہادر' میر منشی' دارالانشاء سلطانی' میر توزک وغیرہ اپنے اپنے مرتبے اور قاعدے سے دونوں ہاتھ جریب پر رکھے دائیں بائیں کھڑے ہیں۔ مردھے' نقیب' چوبدار' عرض بیگی سامنے آداب گاہ کے پاس کھڑے ہیں۔

دیوان خاص کے صحن میں ایک طرف خاصے گھوڑے چاندی سونے کے ساز لگے ہوئے ایک طرف ہاتھی مولا بخش' خورشید گج' چاند مورت وغیرہ رنگے ہوئے ماتھے پر فولاد کی ڈھالیں' سونے کے پھولوں کی' کانوں میں ریشم اور کلائیوں کے گچھے اور لڑیاں کارچوبی جھولیں پڑی ہوئی' ایک طرف ماہی مراتب' چتر نشان روشن چوکی والے جھنڈیوں والے ڈھیٹ جے کھڑے ہیں۔ حبشی قلار چاندی کے شیر دہاں سونٹے۔ خاص بردار بندوقیں لیے ہوئے کٹہرے کے نیچے کھڑے ہیں۔ دیوانِ عام کے میدان میں ساری پلٹن جمی کھڑی ہیں۔ احتشام توپ خانے کی توپیں لگی ہوئی ہیں۔ اے لو! وہ جسولسنی نے اندر سے آواز دی خبردار ہو' نقیب چوبداروں نے جواب دیا' اللہ رسول خبردار ہے۔ اوہو وہ بادشاہ برآمد ہوئے۔ نقیب چوبدار پکارے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ رسول کی امان دوست شاد دشمن پائمال بلائیں رد' کہاروں نے جھٹ ہوادار کہاریوں سے لے لیا۔ پہلے بادشاہ نے تخت کے پیچھے اتر کر نماز کی دو رکعتیں کھڑے ہو کر پڑھیں۔ دعا مانگی۔ پھر ہوادار میں سوار ہوئے۔ کہاروں نے ہوادار تخت طاؤس کے برابر لگا دیا۔ بادشاہ نے تخت پر جلوس فرمایا۔ جھنڈیاں ہلیں۔ دھنا دھن توپیں چلنے لگیں۔ سب فوج نے سلامی اتاری۔ شادیانے بجنے لگے۔ گوہر اکلیل سلطنت معین پور خلافت ولی عہد بہادر بائیں طرف تخت کے اور شاہزادگان نامدار والا تبار قرۂ باصرۂ خلافت غرہ ناصیہ سلطنت دائیں طرف تخت کے برابر امیر امراء کے آگے کھڑے ہو گئے۔

دیکھو پہلے ولی عہد نذر دینے کھڑے ہوئے۔ وہ آداب گاہ پر آئے مجرا کیا' نقیب پکارا جہاں پناہ

چاندنی چوک

جامع مسجد

بادشاہ سلامت' عالم پناہ بادشاہ سلامت مہابلی بادشاہ سلامت! مجرا کر کے بادشاہ کو جا کر نذر دی۔ بادشاہ نے نذر لے کر نذر نثار کو دے دی۔ پھر الٹے پاؤں آداب گاہ پر آئے۔ مجرا کر خلعت پہنا' جیغہ سرپیچ گوشوارہ بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے سر پر باندھا۔ موتی مالا سپر تلوار گلے میں ڈالی۔ اسی طرح آداب گاہ پر الٹے پاؤں آ کر مجرا کیا۔ خلعت کی نذر دی' پھر الٹے ہی پاؤں آداب گاہ پر آ مجرا کر کھڑے ہو گئے۔

دیکھو اب اسی طرح اور شہزادے اور سارے امیر امراء اپنے اپنے رتبے سے نذریں دے رہے ہیں۔ جواہر خانے میں سے خلعت پہن پہن کر آتے ہیں۔ بادشاہ اپنے ہاتھ سے شہزادوں کے سر پر جیغہ سرپیچ گوشوارہ اور معزز امیروں کے سر پر گوشوارہ باندھ دیتے ہیں۔ آداب مجرے ہو رہے ہیں۔ نقیب چوبدار پکار رہے ہیں۔ ملاحظہ آداب سے کرو مجرا جہاں پناہ بادشاہ سلامت' عالم پناہ بادشاہ سلامت مہابلی بادشاہ سلامت۔ لو بادشاہ نے تکیہ سرکایا' فاتحہ کو ہاتھ اٹھا دیا۔ عرض بیگی پکارا در بار برخاست کہاروں نے ہوادار تخت کے برابر لگا دیا۔ بادشاہ سوار ہوئے۔ خاص ڈیوڑھی پر سے کہاریوں نے ہوادار لے لیا۔ بادشاہ محل میں داخل ہوئے۔ سب لوگ رخصت ہوئے۔ چالیس دن تک روز دربار اور خلعت اور نذریں ہوں گی اور انعام واکرام سب کارخانوں کے دروغاؤں اور آدمیوں کو حیثیت کے موافق ملیں گے۔" [18]

حوالہ جات

1-2- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔

3- تفریح دہلی۔ نواب قزلباش وثیقہ دار شاہی فیض آباد یوپی 1936ء۔

4- سیر المنازل از مرزا سنگین بیگ۔ اردو اکادمی دہلی۔

5- تفریح دہلی۔ سیر المنازل۔

6- Delhi, Its Monuments and History. By T.G.P. SPEAR, Oxford: India.

7- تفریح دہلی نواب قزلباش۔

8- تفریح دہلی۔ Delhi Its Monuments and History.

9- تفریح دہلی/ نواب قزلباش۔ سیر المنازل۔

10- تفریح دہلی۔

11-ایضاً۔

Delhi, Its Monuments and History. By T.G.P. Spears -12

Twilight of Mughals. By Percival Spears. -13

14- تفریح دہلی۔

15- ایضاً

16-ایضاً۔

Delhi, Its Monuments and History -17

18- بزم آخر از منشی فیض الدین' اردو اکادمی' دہلی۔

دہلی کے بازار..... جامع مسجد' ذکر چاندنی چوک کا

"دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پہ تھی۔ قلعہ' چاندنی چوک' ہر روز مجمع جامع مسجد کا' ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی' ہر سال میلہ پھول والوں کا' یہ پانچوں باتیں اب نہیں' پھر کہو دلّی کہاں؟"

غالب بنام میر مہدی مجروح ۲ دسمبر ۱۸۵۹ء[1]

دلّی جو کہتے ہیں سات بار بسی اور سات بار اجڑی۔ اس کا سب سے پہلا نام اندر پرستھ تھا۔ پرستھ سنسکرت میں دونوں ہاتھوں کے ملے ہوئے لپوں کو کہتے ہیں۔ اساطیر میں ہے کہ یہاں اندر دیوتا لپیں بھر بھر کر موتی وان کیا کرتے تھے' چنانچہ شہر کا نام پڑ گیا اندر پرستھ..... اندر پرستھ کی حدود وہ چاندنی چوک میں دریبہ کے سامنے واقع خونی دروازے سے لے کر پرانے قلعے تک تھیں..... یعنی چاندنی چوک وہ جگہ تھی جہاں اندر جی موتی لٹایا کرتے تھے.....[2]

"آثار الصنادید" میں ہے: "قلعے کے لاہوری دروازے سے چار سو اسی گز پر ایک چوک ہے' اسی گز کا مربع۔ اس چوک میں کوتوالی چبوترا ہے۔ اس چوک سے چار سو گز آگے ایک اور چوک ہشت پہل سو گز سے سو گز ہے۔ اس چوک کو چاندنی چوک کہتے ہیں۔ اس کے آگے ۴۶۰ گز لمبا اردو بازار ہے۔ اس بازار کے سرے پر فتح پوری مسجد ہے۔"[3]

ایک وسیع وعریض بازار تھا جس کے بیچوں بیچ نہر بہتی تھی۔ دو رویہ گھنے سایہ دار درخت تھے' برگد' پیپل' نیم' جامن' مولسری اور پھلوں کا بادشاہ آم۔ ان کے سائے میں ٹریفک رواں دواں رہتا تھا..... پالکیاں' پنس' ہوادار' رتھ' اکے' گھوڑے اور ہاتھی.....شاہی سواری بھی تو یہاں سے گزرتی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کی سواری کی گاڑی میں سولہ گھوڑے لگائے جاتے تھے جبکہ نواب زینت محل بیگم کی سواری میں آٹھ گھوڑے۔[4]

شاہی ہاتھی زربفت اور بانات کے جھولوں سے مزین اور موتی جڑے سنہری ہودے' گزرگاہ کے دائیں بائیں دکانیں دیسی اور بدیسی مال واسباب سے بھری ہوئیں.....ایران' عراق' وسط ایشیا اور یورپ سے

درآمدہ سامان..... غیر ملکی مال کی منڈی خصوصاً فیض بازار کو سمجھا جاتا تھا۔ یہاں بھی وہی چاندنی چوک والا نقشہ تھا۔ نہر، ہرے بھرے درخت، دورویہ دکانیں اور پھر خاص بازار جہاں درخت اس کثرت سے تھے کہ یہ بازار سے زیادہ باغ لگتا تھا۔ جامع مسجد کے عقب میں غلّے اور اناج کی منڈی اور اردو بازار تھا۔

لیڈی کلائیو بیلی لکھتی ہیں:

''مجھے دہلی کے بازاروں سے سواری میں بیٹھ کر گزرنے میں بڑا لطف آتا تھا اس لیے کہ میرے لیے یہ چیزیں اور غیر معمولی تھی۔ سنگ مرمر اور سنگ سرخ کی شاندار عمارتیں، مرصع دکانیں، کھڑکیوں سے باہر بازار کی جانب لہراتے ہوئے خوش رنگ پردے، دیدہ زیب لباس اور لوگوں کا ہجوم۔''[5]

غالب کے بقول ایک اور ہنگامہ ''ہر روز مجمع جامع مسجد کا'' ..... اور یہ مجمع محض نمازیوں کا ہی نہیں ہوتا تھا..... شاہ جہاں کی بنا کردہ جامع مسجد..... ایک پہاڑی پر تعمیر کی گئی تھی..... مسجد کے تین بڑے دروازے تھے اور ہر دروازے کے سامنے ایک بازار..... بازار تک پہنچنے کے لیے بڑے بڑے زینوں کا ایک سلسلہ..... ون ڈھلتے ہی ان سیڑھیوں پر چہل پہل کا آغاز ہو جاتا..... جنوبی دروازہ چتلی قبر کے بازار کی جانب کھلتا' یہاں پینتیس سیڑھیاں تھیں..... ان سیڑھیوں پر بساطیوں نے بساطیں بچھائی ہوتیں' فالودہ بک رہا ہوتا' کبابی سیخ کباب بناتے اور اصیل مرغ اور رنگا رنگ پرندے فروخت ہوتے۔

شمالی دروازے کے سامنے ۳۹ سیڑھیاں تھیں اور یہ پائے والوں کے بازار کی طرف کھلتا تھا۔ ان سیڑھیوں پر مداریوں اور قصہ خوانوں کا قبضہ تھا۔ ''داستان امیر حمزہ''، ''قصہ حاتم طائی'' اور ''بوستان خیال'' کہی جارہی ہوتیں۔ کہیں مداری اپنے کرتب دکھا رہے ہوتے۔ مشرقی دروازہ خاص بازار کی سمت کھلتا اور اس کے سامنے ۳۵ سیڑھیاں تھیں۔ یہ سیڑھیاں گزری بازار کے لیے مشہور تھیں۔ ہر طرف رنگوں کی بہار' رنگ برنگ کپڑوں کے تھان سجے ہوئے۔ کسی سیڑھی پر کوئی خوش گلو فقیر گا رہا ہے تو کہیں کوئی واعظ وعظ کہہ رہا ہے۔ کہیں کوئی عطائی دوائیں بیچ رہا ہے۔[6]

لال قلعہ کی تعمیر کے دو سال بعد دس لاکھ روپے کے مصرف سے یہ مسجد تعمیر ہوئی۔ پانچ ہزار معماروں اور مزدوروں نے چھ برس میں اسے مکمل کیا۔ اسے سنگ سرخ سے تعمیر کیا گیا۔ تین بڑے دروازے' دو بلند بالا مینار' چار کونوں کی چار شاندار برجیاں' تین بڑے برج' مرکزی بڑے دروازے کی بلند محراب مل کر اسے بے حد خوشنما بنا دیتے ہیں۔ بڑے دروازے کے آگے چار سو مربع فٹ کا صحن ہے جس کا فرش سنگ سرخ کا ہے' اس کے بیچ میں سنگ مرمر کا پندرہ ضرب بارہ گز کا حوض ہے۔ سنگ مرمر کا شاندار منبر ہے۔ میناروں کی بلندی ایک سو تیس فیٹ ہے۔

غدر تک مسجد کے اندر ایک دارالشفاء اور ایک مدرسہ بنام دارالبقاء بھی تھا اور اس میں مفتی صدرالدین آزردہ درس دیا کرتے تھے۔[7]

مسجد کے پچھواڑے اناج کی منڈی کے پیچھے ایک اور بازار تھا' جہاں ودائے دل فروخت ہوتی تھی اور دلوں کے روگ بھی بکتے تھے۔ جب دوسرے بازار بند ہوتے تو یہ کھلتا..... رنگ خوشبو..... ساز و آواز..... رقص و نغمہ..... اہلِ طرب کا بازار..... مان بائی' جدن بائی' مغل جان' نواب جان' چنا جان اور کئی جانیں..... کچھ عام شرفا کی "جانیں" تو کچھ نوابوں اور والیانِ ریاست کی۔ بعض تو قلعہ معلیٰ تک بھی پہنچیں۔ سے ۱۸۴۷ء میں خود حضرت بہادر شاہ ظفر نے بہتر سال کی عمر میں ایک مطربہ مان بائی سے نکاح فرمایا اور اسے اخترمحل بیگم کے خطاب سے نوازا۔ احسن الاخبار کی ایک خبر:[8]

"حضور انور نے راکھی سلونوں کی تقریب میں راجا بھولا ناتھ کو پچاس روپے اور تختِ خاص کے سواروں کو ایک اشرفی مرحمت فرمائی۔ اس عیش وعشرت کے وقت حضور انور نے ایک مطربہ زہرہ پیکر ماہ طلعت کو شرفِ مناکحت بخشا اور امتیاز و اعتبار کا رتبہ عطا فرمایا۔ اخترمحل خطاب دیا۔ دو سو روپیہ ماہوار مقرر فرمایا۔ ایک خواجہ سرا اور خدمت گار ڈیوڑھی پر مقرر کیے اور اعلیٰ اعلیٰ قسم کے بہت سے زیور عطا کیے۔"

بادشاہ سلامت اہلِ طرب کے رقص سے بھی حظ اٹھایا کرتے تھے۔ "احسن الاخبار" کی ایک خبر:

"مرزا غلام فخرالدین بہادر شاہزادے نے اپنے بچے کے دودھ چھٹنے کی خوشی میں رنڈیوں کے چار طائفوں کا ناچ کرایا تھا۔ حضور انور اس محفل میں شریک ہو کر بہت محظوظ ہوئے۔"[9]

غالب بھی اہلِ طرب کے ساتھ اپنے اختلاط کا ذکر کرتے ہیں۔ مرزا حاتم علی بیگ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بھائی تمہاری طرح واری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا جس زمانے میں وہ حامد علی خان کے نوکر تھی اور ان میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا تو اکثر مغل سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اس نے تمہارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھے دکھائے تھے۔" (اپریل ۱۸۵۹ء۔)[10]

"پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں' ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے' کیسی اشک افشانی کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ' غم نہ کھاؤ۔ اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی' منا جان سہی۔" بنام حاتم علی بیگ' مہر ۱۸۶۵ء[11]

چرخِ کج رفتار کو دہلی کے ان بھرے پرے بازاروں کی رونق نہ بھائی اور اس نے مئی ۱۸۵۷ء میں

دہلی پر بلائیں نازل کرنا شروع کیں۔ پہلے باغیوں یا مجاہدین کی صورت میں اور پھر انگریزوں کی شکل میں۔ اس کے بعد دلی کا نقشہ غالب کے الفاظ میں.....

''لوسنو اب تمہاری دہلی کی باتیں' چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے جو کنواں تھا' اس میں سنگ وخشت وخاشاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔'' بنام سید سرفراز حسین ۲۳ دسمبر ۱۸۵۹ء۔[13]

''بڑے بڑے نامی بازار خاص' اردو بازار اور خانم بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا۔ اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔'' (بنام عبدالغفور سرور ستمبر ۱۸۶۰ء۔)[14]

''قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے.... پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا' جامع مسجد ہوتا ہوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا۔ جامع مسجد سے راج گھاٹ تک بلا مبالغہ ایک لق ودق صحرا ہے..... یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی کوس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا.....[15]

کشمیری دروازے کا حال تم دیکھو گے۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرا' دھوبی واڑا' رام جی گنج' سعادت خان کا کٹرا' جرنیل کی بیوی کی حویلی' رام جی گوداموالے کے مکانات' صاحب رام کا باغ حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی نایاب ہو گیا تو یہ صحرائے کربلا ہو جائے گا..... اردو بازار نہ رہا' اردو کہاں؟ دلی واللہ اب شہر نہیں کیمپ ہے.....(بنام میر مہدی ۱۸۶۰ء۔)[16]

جامع مسجد سکھ پلٹنوں کے قبضے میں رہی پھر فوج تو نکل گئی لیکن مسلمانوں کا داخلہ تب بھی ممنوع رہا۔ آخر ۱۸۶۲ء کے آخر میں کہیں مسجد واگزاشت ہوئی۔ یکم دسمبر ۱۸۶۲ء کو غالب میر مہدی مجروح کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''مسجد جامع واگزاشت ہو گئی۔ چٹلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔[17] انڈا مرغی کبوتر بکنے لگا۔ عشرہ مبشرہ دس آدمی ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش' مولوی صدرالدین' تفضل حسین خان تین یہ سات اور۔''

غالب کے زمانے کی دلی کو کئی یورپین اور امریکن سیاحوں نے بھی دیکھا۔ آیئے دیکھیں وہ دلی کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

''میں دلی کی معروف جامع مسجد کی سیر کو گیا' جو ۱۶۵۰ء میں مکمل ہوئی۔ اسے شاہجہان بادشاہ نے دس لاکھ روپے یعنی ایک لاکھ پاؤنڈ کے مصرف سے تعمیر کرایا۔ ایسی عمارت اگر انگلستان میں تعمیر کی جاتی تو اس پر چار گنا زیادہ خرچ آتا۔ شاہ جہان کی تعمیر کردہ دیگر عمارات کی طرح یہ مسجد بھی عمدہ طرز تعمیر اور اعلیٰ ذوق کا

نمونہ ہے۔ میرے ساتھ بادشاہ کا ایک ملازم اور تین ہندو تھے۔ میں عمارت میں اس قدر منہمک ہو گیا تھا کہ واپسی تک مجھے علم نہ ہو سکا کہ مسجد کے خادموں نے میرے ہندو ساتھیوں کو باہر روک دیا تھا۔ اگر چہ انہوں نے گزارش کی تھی کہ وہ جوتے اتاریں اور دیگر تمام آداب کو ملحوظ خاطر رکھنے کے لیے تیار ہیں لیکن انہیں بتایا گیا کہ بت پرستوں کو مسجد میں داخلے کی اجازت نہیں۔ ان کا آقا کیونکہ اہل کتاب میں سے ہے اور اس کے عقیدے میں کچھ سچائی موجود ہے اس لیے وہ مسجد میں داخلے کا اہل ہے۔ (اگر چہ بدقسمتی سے اس کا دل قرآن کے لیے نہیں کھولا گیا)۔"

Rambles and Recollections. W.H.Sleeman.(۱۸۴۴ء)

"چاندنی چوک میں ہر قسم کی اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ ہندوستان' کشمیر' فارس اور تبت کی مصنوعات۔ یہاں پرندوں اور جانوروں کی منڈی بھی ہے جہاں پرندے' ایرانی بلیاں' مختلف نسلوں کے کتے' یہاں تک کہ چیتے اور شکاری تیندوے بھی فروخت ہوتے ہیں۔ بگھیاں' ٹم ٹم' بیل گاڑیاں' پالکیاں' گھوڑے اور ہاتھی بڑی تعداد میں آ جا رہے ہیں۔ وہ دیکھئے سامنے آٹھ گھوڑوں کی بگھی میں بادشاہ کے فرزند شہزادہ بابر برطانوی جنرل کی یونیفارم میں ملبوس گزر رہے ہیں۔ ایک اور شہزادے مرزا صالح اپنی محبوب شریک حیات کے ساتھ پردے والی گاڑی میں گزرے۔ شہزادی کے حسن کا دور دور تک چرچا ہے لیکن بے تاب ہجوم پردے کی وجہ سے ان کی جھلک تک نہیں دیکھ پاتا۔ یہاں بھکاریوں کا ہجوم ہے اور گرد و غبار بھی خاصا ہے۔ حالانکہ درمیان میں ہی دورویہ درختوں سے گھری نہر بہہ رہی ہے اور بہت آسانی سے اس گرد و غبار پہ قابو پایا جاسکتا ہے۔

Scenes and Characteristics of Hindustan. Emma (۱۸۳۷ء) Roberts

"دلّی تجارت کا ایک بڑا مرکز ہے۔ یہاں کی شالیں ایک بڑا برآمدی آئٹم ہیں۔ دلّی اور کشمیر کے مابین مسلسل تجارتی رابطہ رہتا ہے۔ تمام مہذب دنیا میں مقبول شال کا اونی کپڑا کشمیر سے دلّی آتا ہے جہاں اس کے حاشیے بنتے ہیں۔ سونے اور ریشم کے تاروں سے کشیدہ کاری ہوتی ہے' چنانچہ انہیں دلّی کی شالیں کہا جاتا ہے۔ دلّی کی سوزن کاری ایشیا میں سب سے عمدہ ہے اور طبقہ امراء کے مرد و زن میں بے حد مقبول ہے۔ مردوں کے کفتان کے کنارے مخمل کے ہوتے ہیں جن پر عمدہ کشیدہ کاری کی جاتی ہے۔

یہاں کے صراف ہندوستان میں سب سے بہتر ہیں۔ اگر چہ قیمتی پتھروں کی تراش خراش میں وہ بہت زیادہ مہارت نہیں رکھتے' لیکن وہ بہت تیزی سے سیکھ رہے ہیں۔ پتھر اور ہاتھی دانت پہ کھدائی کر کے نقش و نگار بنانے کے ماہر بھی دلّی میں موجود ہیں لیکن انہیں ابھی اپنے فن میں کمال حاصل کرنا ہے۔ انگریز خواتین کے ذوق کو دیکھ کر ہندوستانی کاریگر نئی نئی چیزیں بنا رہے ہیں۔ وہ ہاتھی دانت کے ٹکڑوں پر دلّی کی

عمارتوں قطب مینار وغیرہ کے نقش بناتے ہیں اور انہیں زیورات میں استعمال کرتے ہیں جو یورپی لوگ ایک دوسرے کو بطور تحائف دیتے ہیں۔'' Emma Roberts

''دلّی کے کاریگر خوبصورت سکارف' زردوزی اور سوزن کاری سے مزین شالیں' عمارات کی تصاویر اور زیورات بناتے ہیں۔ وہ ہاتھی دانت پر مسلمان بادشاہوں کی مینا توری تصاویر' تلواریں' ڈھالیں' ہاتھی دانت کے شطرنج کے مہرے بھی تیار کرتے ہیں۔ یہ سب اشیاء موزوں قیمتوں پر حسب دلخواہ مقدار میں دستیاب ہیں۔ سڑکوں پہ یورپی طرز کی بگھیاں دکھائی دیتی ہیں۔ دکانوں پر مغرب کی مصنوعات موجود ہیں۔ یہاں تک کہ دکانوں کے انگریزی بورڈ بھی دکھائی دیتے ہیں۔''

A Hand Book of India. J.H.Stockqueler

۱۸۵۸ء میں چھپنے والے ایک امریکی سیاح کے سفرنامے میں دلّی کی مطربائوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

''ناچنے والی لڑکیاں تعداد میں دس تھیں۔ ایک وقت میں دو سے زیادہ لڑکیاں فن کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ وہ ریشم یا کمخواب کے پاجاموں میں ملبوس تھیں جن کے پائینچے ٹخنوں سے نیچے تک تھے اور وہ فرش پر گھسٹتے تھے۔ یہ عموماً پندرہ سے بیس گز کپڑے کے بنے ہوتے ہیں' بالائی جامہ تن زیب کا ہوتا ہے۔ ان کے رنگ سبز یا سرخ ہوتے ہیں۔ اکثر لباسوں پہ زردوزی کی جاتی ہے۔ سب لڑکیوں نے طلائی زیورات از قبیل بازوبند' بازبیں' جھمکے' ہنسلیاں اور بندیاں پہن رکھی تھیں۔ وہ ننگے پاؤں تھیں' ہاتھ اور پیر حنا سے رنگے ہوئے تھے اور آنکھوں میں سرمے کی دھاریں تھیں۔

انہوں نے جو گیت گائے وہ فارسی میں تھے۔ کچھ تو بہت سادہ سے تھے مثلاً اے میری ساس! دریا پہ جاؤ پانی لے آؤ.... یا او میرے محبوب شہزادے' مجھے ہاتھی کے ہودے میں بٹھا کے کلکتہ لے چل۔

کچھ گیت جورات کے آخری حصے میں گائے گئے وہ کوسنوں اور گالیوں پر مشتمل تھے' یہ گیت دو لڑکیاں گاتی تھیں حملے اور جوابی حملے کی صورت میں۔ ان میں اتنی بری زبان استعمال کی گئی تھی کہ ہندوستان سے باہر اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہر لڑکی کے ساتھ دو تین سازندے تھے جو طبلہ اور ستار بجاتے تھے۔ وہ عموماً مسلمان ہوتے ہیں۔ موسیقی دھیمی اور یکسانیت کا شکار تھی اور ایسے ہی لڑکیوں کی حرکات بھی تھیں جنہیں رقص ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ لڑکیاں اپنے جسموں کو آگے پیچھے حرکت دیتی تھیں اور ہاتھوں کو کلائیوں پر گھماتی تھیں۔ موسیقی کی تال پر وہ اپنے پیر فرش پر مارتی تھیں جس سے ان کے ٹخنوں میں باندھے گئے چاندی کے گھنگھرو زور سے بجنے لگتے تھے۔ ناچنے والی لڑکیاں ایک خاص طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی زندگیاں شراب نوشی میں گزرتی ہیں اور یہ مردوں سے بھی زیادہ کچی شرابیں پیتی ہیں۔ اس طبقے کی عورتیں بچے پیدا نہیں کرتیں بلکہ بردہ فروشوں اور اغوا کنندگان سے بچیاں خرید کر ان کی تربیت کرتی ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں

غلامی قانوناً ممنوع ہے لیکن یہ اب بھی ایک گھریلو ادارے کے طور پر باقی ہے۔

ان بچیوں کو شروع سے ہی پیشہ ورانہ تربیت دی جاتی ہے۔ ناچ گانا اور اس پیشے کے آداب سکھائے جاتے ہیں جب یہ بلوغ کو پہنچتی ہیں تو عفت و پاکدامنی کے مفہوم سے مطلق ناآشنا ہوتی ہیں۔

کرنل سکنر کے گھر میں چند رقاصائیں میں نے دیکھیں' ان میں سے بعض کے ساتھ دو دو تین تین بچیاں تھیں جو بظاہر پانچ چھ سال کی باتمیز خوبصورت بچیاں تھیں لیکن جب انہوں نے گفتگو کی تو انہوں نے ایسے ایسے الفاظ استعمال کیے اور ایسی حرکات کیں جو تجربہ کار رقاصاؤں کو بھی شرمانے پر مجبور کر سکتی تھیں۔

Newyork to Delhi by Robert Brown Mintern

حوالہ جات

1- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔

2- میرے زمانے کی دتی۔ ملا واحدی۔

3- آثار الصنادید از سرسید احمد خان

4- داستان غدر از ظہیر دہلوی۔

5- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔

Historic Delhi. H.K.kaul -5A

6- دتی تھا جس کا نام از انتظار حسین۔ سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور

7- چراغ دہلی از مرزا حیرت دہلوی۔

Historic Delhi. H.K.kaul -7A

9-8 بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔

10-11 خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔

13 تا 17 ایضاً

Historic Delhi. H.K.kaul- -12

پھول والوں کی سیر

''اس شہر میں ایک میلہ ہوتا ہے۔ جو پھول والوں کا میلہ کہلاتا ہے۔ بھادوں کے مہینے میں ہوا کرتا ہے۔ امرائے شہر سے لے کر اہلِ حرفہ تک قطب جاتے ہیں۔ دو تین ہفتے تک وہیں رہتے ہیں۔ مسلمان و ہنود دونوں فرقوں کی شہر میں دکانیں بند پڑی رہتی ہیں۔'' (غالب بنام غلام غوث خان بے خبر ۱۸۶۴ء)[1]

دلّی سے گیارہ میل کے فاصلے پر واقع مہرولی کو صحت افزا مقام سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہیں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ شریف واقع ہے اس لیے اسے قطب صاحب بھی کہتے ہیں۔ اہلِ دہلی یہاں زیارت کے علاوہ تفریح کے لیے بھی آتے تھے اور کئی کئی روز یہاں قیام کرتے تھے۔ میلے نے اسے ایک باقاعدہ رسم بنا دیا۔ کیا امیر کیا غریب سبھی قطب صاحب کھنچے چلے آ رہے ہیں۔ تونگروں کے اپنے گھر ہیں یا پھر کرائے پر لیے ہیں۔ غریبوں نے چھولداریاں لگا رکھی ہیں یا پھر قدیم عمارتوں کے کھنڈروں اور مزاروں میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔[2]

پھول والوں کے میلے کا آغاز حضرت اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ہوا۔ ان کے ایک فرزند تھے مرزا جہانگیر، قوی ہیکل، خوبصورت لیکن اکھڑ اور بدمزاج۔ نیزہ بازی، تیر اندازی میں طاق، گھڑ سواری اور چوگان میں مشتاق۔ رات کے علاوہ دن میں بھی شراب پیتے۔ انگریزوں کے ساتھ سوار ہو کر نکلتے اور گھوڑے کو مہمیز کر کے بڑی بڑی کھائیاں اور خندقیں پھلانگ جاتے اور انگریزوں کو چیلنج کرتے، ان کے احتراز کرنے پر ان کا مضحکہ اڑاتے۔ انہوں نے کئی انگریز افسروں کے بطور تفنن نام رکھے ہوئے تھے۔ اگرچہ بادشاہ کے ولی عہد ابوظفر تھے لیکن بادشاہ مرزا جہانگیر کو ولی عہد بنانے کے خواہش مند تھے۔ شاید وہ اس دلیر اور اکھڑ شہزادے میں ایک تیمور یا ایک بابر دیکھتے ہوں جو خاندان تیموریہ کی کھوئی ہوئی عظمت کو پھر سے بحال کر دے گا۔ انگریز شہزادے کے بارے میں کئی تحفظات رکھتے تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں شہزادہ علمِ بغاوت بلند کر ہی نہ دے۔ قلعہ معلیٰ میں تعینات ریذیڈنٹ اور جنرل آکٹرلونی کے نائب مسٹر سٹین Seton سے ایک روز اس سترہ سالہ شہزادے کا آمنا سامنا ہوا تو شہزادے نے اس کی بھد اڑاتے ہوئے کہا: ''لولو ہے بے لولو ہے'' سٹین سمجھ تو گیا

کہ شہزادہ صاحب اس کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے شہزادے کے ہمراہیوں سے دریافت کیا:

"صاحب عالم کیا کہتا ہے؟"

ساتھیوں نے کہا: "حضور صاحب عالم آپ کو لولو یعنی موتی کہہ رہے ہیں۔"

سٹین نے زہرخند کے ساتھ کہا: "ہم صاحب عالم کو لولو بنائے گا۔"

صاحب عالم کا یہ سن کر پارہ چڑھ گیا۔ جھٹ طمانچہ نکال کر ریذیڈنٹ پر داغ دیا۔ اس کی زندگی باقی تھی بچ گیا۔ انگریزوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ شہزادے کو گرفتار کر کے فوج کی ایک رجمنٹ کے ہمراہ سیاسی قیدی کی حیثیت سے الٰہ آباد بھیج دیا گیا۔ بادشاہ سے کہا گیا کہ شہزادہ کو آداب و اطوار سکھانے اور تربیت دینے کی ضرورت ہے۔ نظر بندی کے دوران شہزادہ نے مثالی رویے اور عمدہ چال چلن کا ثبوت دیا' چنانچہ جلد ہی ان کی نظر بندی اور جلاوطنی ختم کر کے دہلی واپس بھیج دیا گیا اور انہیں دوبارہ اپنے دستے کی کمان بھی سونپ دی گئی۔[3]

اس جلاوطنی کے دوران شہزادے کی والدہ نے منت مانی کہ جب فرزند ار جمند رہا ہو کر آئیں گے تو وہ قطب صاحب پر پھولوں کا چھپر کھٹ اور غلاف چڑھائیں گی۔ جب شہزادہ واپس آیا تو ان کا شاندار استقبال ہوا اور ملکہ معظمہ نواب ممتاز محل بیگم نے اپنی منت بھی چڑھائی۔ بادشاہی خیمے سے قطب صاحب کی درگاہ تک دو رویہ قناتیں کھڑی کی گئیں۔ نواب ممتاز محل بیگم نے پچاس خوان اندرسے کی گولیوں اور پھینیوں سے آراستہ کیے۔ ایک چاندی کی کشتی میں سونے کا پنکھا جس میں نیلم یاقوت پکھراج پنا اور سچے موتی جڑے تھے رکھا اور وہ کشتی شہزادے کے سر پر رکھی۔ غلاف شریف کی سینی بادشاہ نے اور صندل اور عطردان بیگم نے سر پر رکھے۔ مٹھائیوں کے خوان شہزادیوں اور بیگمات نے سروں پر اٹھائے۔ آگے نفیریاں بجاتی لونڈیاں چلیں۔ مزار شریف پہ غلاف اور صندل چڑھایا گیا۔ شیرینی تقسیم ہوئی۔ نذرانہ بھرا گیا۔ شہزادے کو قدم بوس کرایا گیا۔ بعد ازاں رعایا نے پھولوں کا چھپر کھٹ مزار پر چڑھایا۔ پھول والوں نے پھولوں کا ایک پنکھا چھپر کھٹ پر لگا دیا۔ بادشاہ کو یہ تقریب اس قدر پسند آئی کہ یہ میلہ ہر سال ہونے لگا۔ دربار سے پھول والوں کے دو سو روپے سالانہ مقرر ہوئے۔ یہ میلہ پھول والوں کی سیر کہلایا۔[4]

رفتہ رفتہ یہ عوامی میلہ بن گیا۔ بازار' ڈھول تاشے' پہلوانوں کے اکھاڑے' تلوار' خنجر' بنوٹ' بانک کے کرتب' آتش بازیاں' پھولوں کے پنکھے کا جلوس' قریب ہی جوگ مایا کا مندر تھا' وہاں بھی یہ رسم ہونے لگی' ایک روز جوگ مایا کے مندر پر پنکھا چڑھایا جاتا' اگلے روز قطب صاحب پر۔[5]

بادشاہ کے حکم کے بموجب مسلمانوں کے پنکھے میں ہندو اور ہندوؤں کے پنکھے میں مسلمان شریک

ہوا کرتے تھے۔

راقم الدولہ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں: ''یہ میلہ بھادوں کی پندرہ تاریخ کو منایا جاتا۔ شمسی تالاب سے پنکھا اٹھتا اور مہرولی کے بازار سے گزرتا ہوا جنگلی محل پر آ جاتا' جہاں وہ بادشاہ کو سلامی دیتا۔ اس کے بعد پہلے دن کا پنکھا جوگ مایا کے مندر پر اور دوسرے دن کا قطب صاحب کے مزار پر چڑھایا جاتا۔ جب بہادر شاہ ظفر پھول والوں کی سیر کے لیے قلعے سے نکلتے تو راستے میں صفدر جنگ کے مقبرے پر ضرور رکتے اور وہاں خاصا نوش کرتے..... بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں اس میلے میں تقریباً لاکھ ڈیڑھ لاکھ آدمی جمع ہوتے تھے۔ یہ میلہ بدھ سے جمعہ تک تین دن رہتا تھا۔ کہا گیا ہے کہ اس میلے کا خرچ اس زمانے میں ڈھائی تین لاکھ تک پہنچ جاتا تھا۔''[6]

اکبر شاہ ثانی کے فرزند بہادر شاہ ظفر کے روزنامچوں سے چند اقتباسات اس میلے کے حوالے سے:

''حضرت بادشاہ سلامت نے پھول والوں کے چودھری کی درخواست پر ۵ شعبان کو پھول والوں کی سیر کے میلے میں شرکت کا وعدہ فرمالیا ہے۔ اس میلے میں طرح طرح کے عمدہ چھوٹے بڑے پنکھے اور رنگارنگ کے پھول حضور قطب صاحب کے مزار انور پر چڑھائے جاتے ہیں اور نیاز دلائی جاتی ہے۔ ایک سو روپے اس میلے کے خرچ پر بادشاہ سلامت کی طرف سے مرحمت کیے گئے۔'' (۷ اگست ۱۸۴۶ء)[6]

''کلید خانے کے داروغہ احمد بیگ سے ارشاد فرمایا کہ پھول والوں کی سیر میں ہمارا بھی جانے کا ارادہ ہے۔ بیگمات کے آنے جانے کی بھی کوئی صورت ہونی چاہیے۔ میرے خیال میں مناسب یہ ہے ڈیوڑھی عدالت سے لے کر لال پردہ تک قناتیں ایستادہ کی جائیں۔ حسین مرزا کو حکم ہوا کہ شہر سے جوہری بچوں اور صنعت پیشہ لوگوں کے لڑکوں کو بلا کر مہتاب باغ میں مینا بازار اور جوہری بازار لگایا جائے۔'' (۱۵ اکتوبر ۱۸۴۷ء)[7]

''حضرت بادشاہ سلامت نے پھول والوں کی سیر کے دن زبان گوہر فشاں سے فرمایا کہ بارگاہ شاہی سے میلے تک عمدہ عمدہ قناتیں اور قیمتی خیمے نصب کیے جائیں اور صرافوں' جوہریوں' میوہ فروشوں اور ہر قسم کے دکان داروں کو اطلاع دے دی جائے کہ دکان داری کا مال لے کر وہ اپنی بارہ بارہ تیرہ تیرہ سال کی لڑکیوں کو خیمہ گاہ میں بھیج دیں۔ اور یہ تاکید کر دیں کہ عمدہ عمدہ قسم کے مال لے کر آئیں اور دکان کو اچھی طرح سے سجائیں۔ شاہی بیگمات میلے میں سیر و تفریح کی غرض سے تشریف لے جائیں گی تو عمدہ اور نفیس چیزیں خریدیں گی۔'' (۱۴ اکتوبر ۱۸۴۷ء)[8]

''گل فروشوں کے میلے کی سیر کرنے کے لیے حضور والا نے اپنے صاحبزادوں اور صاحبزادیوں کو کچھ روپیہ عنایت فرمایا اور گل فروشوں کے چودھری غلام علی کو بھی سو روپے عطا فرمائے..... شام کے وقت

پھولوں کے پانچ چھ پنکھے بنائے گئے۔ درگاہ میں نیاز ہوئی۔ مسٹر کالون اور صاحب ایجنٹ بھی میلے میں شریک ہوئے۔ شہزادے مرزا بنو نے حاضر ہو کر پچاس بٹیریں نذر میں پیش کیں۔ درگاہ کے خادموں نے آم نذر کیے۔ حضور والا نے دس دس روپے انعام میں دیئے۔" (۲۰ جولائی ۱۸۴۹ء)[9]

حوالہ جات

1- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
2- اجڑا دیار از شاہد احمد دہلوی۔
3- قلعہ معلّی کی جھلکیاں از عرش تیموری۔

Twlight of Mughals. By P. Spear

4- شاہد احمد دہلوی از اجڑا دیار۔
5- بزم آخر۔
6- داستان غدر از ظہیر دہلوی۔
7-8-9 بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین لاہوری

عیدین، ہولی، دیوالی، نوروز اور محرم

"پس جب عید ہے اور روزِ سعید ہے تو کیا بعید ہے کہ خلافِ شہورِ ثلاثہ ماضیہ اس مہینے میں تم آسکو۔ ہے ہے میں تو کہتا ہوں کہ نہ آسکو۔ اس ماہ مبارک میں امضائے حکم سرکار کا وہ ہنگامہ گرم ہو کہ پارسیوں کی عید کوسہ برنشین کا گماں گزرے۔ دور کیوں جایئے! ہولی کی دھلینڈی کا سماں لوہارو میں بندھ جائے۔ ایک خرسوار کی سواری بڑے دھوم سے نکلے۔ حسن اتفاق یہ کہ وہی موسم ہے۔ ہولی اور عید..... کوسہ برنشین کا زمانہ باہم ہے۔ حوت کے آفتاب میں یہ دونوں تہوار ہوتے ہیں۔ کل آفتاب حوت میں آیا ہے۔ کوسہ برنشین اور ہولی کا مژدہ لایا ہے۔ خیر میں چند روز اور ستم کش فراق اور تیرے دیدار کا مشتاق ہوں۔ تو کوسہ برنشین اور ہولی کی رنگ رلیاں منالے اور خرسوار ہو کر بضرب تازیانہ دوڑا لے۔"[1]

غالب نے ۲۶ رمضان ۱۲۸۱ھ مطابق ۲۳ فروری ۱۸۶۵ء کو اپنے فرزند معنوی علاؤالدین احمد خان علائی کے نام لوہارو بھیجے گئے خط میں ان تین تیوہاروں کا ذکر کیا تھا۔

دتی میں کوسہ برنشین کے منائے جانے کے حوالے سے میرے محدود مطالعہ میں کچھ نہیں آیا۔ بمبئی میں خاصی تعداد میں پارسی آباد تھے۔ وہاں یہ تہوار بڑے پیمانے پر منایا جاتا تھا۔ دہلی میں کچھ پارسیوں کی شراب کی دکانوں کا غالب ذکر کرتے ہیں:

"یہاں جو پارسیوں کی دکانوں میں فرنچ اور شام پین کے درجن دھرے ہیں....."[2]

ہوسکتا ہے دہلی میں یہ تہوار منایا جاتا ہو اور غالب نے تازیانہ بدست خرسوار خود ملاحظہ فرمایا ہو۔

کوسہ ایسے آدمی کو کہتے ہیں جس کی بڑی عمر تک داڑھی نہ نکلے۔ ایسے آدمی کے بدن پر گرم دوائیاں مل کر اسے گدھے پر بٹھا دیا جاتا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں کوڑا اور دوسرے میں پنکھا تھما دیا جاتا تھا۔ وہ ہائے گرمی ہائے گرمی چلاتا اور تیزی سے پنکھا جھلتا۔ تماشائی اس پہ ٹھنڈا پانی اور برف پھینکتے رہتے۔ جب وہ سردی کے مارے کانپنے لگتا تو لوگوں پہ کوڑے برسانے لگتا۔ بھگدڑ مچ جاتی اور وہ کوڑا گھماتا ہوا لوگوں کا تعاقب کرتا۔

وہ ایک طرف رخ کرتا تو دوسری طرف سے ٹھنڈے پانی کی بوچھاڑیں آنے لگتیں۔ لوگ چوٹیں بھی کھاتے اور قہقہے بھی لگاتے۔ اس ہنگامے کے بعد اسے نذرانے پیش کیے جاتے۔ لوگ گھروں کے دروازوں میں نذریں ہاتھ میں لیے کھڑے رہتے۔ یوں تو اسے یہ استحقاق بھی حاصل تھا کہ وہ کسی بھی پارسی کی دکان میں گھس کر جو جی چاہے اٹھالے۔[3]

مجھے یقین ہے کہ کوئی "رندکوسہ" ضرور کسی شراب خانے میں گھس کر شامپین اور فرنچ کی ان بوتلوں میں سے ایک آدھ اٹھالیتا ہوگا جنہیں حضرت غالب للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ہولی کا تہوار مارچ میں منایا جاتا۔ یہ آمد بہار کا جشن ہوتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی فرماتے ہیں:

ہولی کی نظیر اب جو بہاریں ہیں اہاہا
محبوب رنگیلوں کی قطاریں ہیں اہاہا
کپڑوں پر جمی رنگ کی دھاریں ہیں اہاہا
سب "ہولی ہے ہولی" ہی پکاریں ہیں اہاہا
کیا عیش ہے کیا رنگ ہے کیا ڈھنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

لوگ ایک دوسرے پر گلال چھڑکتے اور ایک دوسرے کو رنگین پانی سے شرابور کردیتے۔ ایک دوسرے پہ رنگوں کی پچکاریاں چلائی جاتیں۔ ڈھول، شہنائی اور بانسریوں کی تانیں اور رقص..... قلعہ معلّی کی ہولی کا ذکر "دلی کا آخری دیدار" میں یوں آتا ہے:

"رہی ہولی تو یہ بھانت بھانت کے سانگ نے دل لگی کی چیز بن جاتی۔ بازاروں، گلیوں، گھروں میں رنگ کھیلے جارہے ہیں۔ دف، جھانجھ، نفیری بج رہی ہے۔ جابجا طائفے ناچ رہے ہیں۔ شہر کے سارے رنگ ایک ایک کرکے قلعے پہنچے۔ حضور عالم پناہ ہندو مسلمان ایک طرف، بادشاہ زادیاں اور امیر زادیاں دوسری طرف جھروکوں میں بیٹھی ہیں، رنگ سانگ آرہے ہیں، انعام لے کر جارہے ہیں۔"[4]

قلعہ میں دیوالی کی رونقیں ہولی سے بھی زیادہ ہوتیں۔ "بزم آخر" کے مطابق:

"دیوالی پہ جابجا نوبت نقارے بجتے۔ کھیل بتاشوں، کھانڈ اور مٹی کے کھلونوں کی دکانیں لگتیں۔ حلوائیوں کی دکانیں رنگ برنگ کی مٹھائیوں سے سج جاتیں۔ پہلے دیے سے تیسرے دیے تک ایسی روشنی ہوتی کہ رات کو دن کا سماں ہوجاتا۔ تین دن تک محل میں سب کی آمد ورفت بند ہوجاتی تھی۔ ثابت ترکاریاں مثلاً بینگن، مولی، کدو، گاجر وغیرہ محل میں لانے کی ممانعت ہوتی تھی تاکہ کوئی جادوٹونا نہ کرسکے۔

تیسرے دیے کو بادشاہ سونے چاندی میں تلتے اور بادشاہ کے وزن کے برابر سونا چاندی محتاجوں کو

بانٹا جاتا۔ بھینسا' کالا کمبل' گز داتیل' سونا چاندی' زرنقد وغیرہ بادشاہ پر سے صدقے کیے جاتے۔ قلعے کی روشنی کا حکم ہوتا۔ ہندو امراء مٹھائی کے کھلونے اور مٹھائی بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے اور بادشاہ اس روز عام تعطیل کا حکم صادر کر دیتے۔"[6]

اب ذرا دسہرے کی رونقیں ملاحظہ فرمائیے:

"دسہرے کے دن بادشاہ ظفر صبح دربار کرتے۔ پہلے ایک نیل کنٹھ بادشاہ کے سامنے اڑایا جاتا۔ اس کے بعد باز خانے کا داروغہ باز اور شکرا لے کر آتا۔ باز اور شکرے کو لے کر ہاتھ پہ بٹھاتے۔ باز شکرے کا جانی دشمن ہوتا ہے۔ اس لیے باز اور شکرے کو ایک ساتھ اپنے ہاتھوں پر بٹھانے سے غالباً بادشاہ کا مقصد یہ ہوتا کہ ان کے دربار میں شیر اور بکری ایک گھاٹ سے پانی پیتے ہیں۔ تیسرے پہر کے قریب ہندو امراء نذریں پیش کرتے اور بادشاہ جھروکے میں آ بیٹھتے۔ نو دن تک رام لیلا کے جلوس نکلتے۔ دسویں دن بھرت ملاپ ہوتا اور اس طرح دسہرے کا تہوار خیر سگالی کے جذبات کے ساتھ ختم ہو جاتا۔"[6]

نوروز عالم افروز اصلاً ایرانی تہوار ہے۔ دہلی میں بادشاہ سے فقیر تک سب یہ تہوار مناتے:

"قلعہ معلی میں دیوان عام' دیوان خاص' ہوا محل' موتی محل' باغ حیات بخش' مہتاب باغ' ساون بھادوں غرض ہر عمارت کو خوب سجا دیا جاتا۔ نجومی پنڈت جو رنگ سال کا بتاتے۔ وہی نوروزی رنگ کہلاتا۔ بادشاہ' شہزادے' بیگمات' شہزادیاں' سب اسی رنگ کی پوشاکیں پہنتے۔ بادشاہ حضرت علیؓ کے دسترخوان پر نیاز دیتے۔ پہلے ذرا سا خود چکھتے' اس کے بعد ولی عہد' شہزادوں اور معزز امیروں کو اپنے ہاتھ سے تبرک دیتے۔ نوروز ہی کے دن سلاطین بادشاہ سلامت کے سامنے سبز دار مرغی کے انڈے لڑاتے۔ طرح طرح کے کھیل ہوتے۔ بادشاہ سلامت نوروزی لباس زیب تن کر کے قطب صاحب بھی جاتے۔ محل سرا میں چاندی کی کرسی پر بیٹھ کر دربار کرتے اور اراکین سلطنت سے نذرانے قبول کرتے۔"

نوروز کے دسترخوان پر سات طرح کے پلاؤ' سات طرح کی مٹھائیاں' سات طرح کے پھل اور سات طرح کی ترکاریوں سے پکا ہوا سالن ہوتا اور ساتھ میں جو کی روٹی' ساگ کی بھجیا اور ستو یہ ہوا حضرت علیؓ کا دسترخوان۔[7]

نوروز کی اسی رسم کے ساتھ کچھ شگون بھی وابستہ ہو گئے۔ پنکھا جھلنے کا شگون' سونا چاندی اچھالنے کا شگون اور آخر میں انڈے لڑانے کا کھیل' اس کھیل پہ نوروز کا جشن تمام ہوتا۔

عید الفطر

اگر عید کا چاند انتیس کا ہوتا تو اس عید کو جوان عید کہا جاتا تھا۔ چاند دکھائی دینے کی پچیس توپیں داغی جاتیں۔ اس کے بعد شادیانے بجتے۔ اس طرح عید کا اعلان ہوتا تھا۔ راتوں رات توپیں' ڈیرے' خیمے فرش

فروش عیدگاہ پہنچ جاتے۔

صبح بادشاہ غسل کرتے' پوشاک بدل کر دودھ سویاں نوش کرتے' ہوادار کی مدد سے ہاتھی پر سوار ہوتے پھر اکیس توپوں کی سلامی کے بعد جلوس عیدگاہ روانہ ہوتا۔

عیدگاہ کے احاطے میں بادشاہ اور ولی عہد تو پالکی میں بیٹھ جاتے باقی لوگ پیدل ہی چلتے۔ نماز سے فارغ ہو کر بادشاہ قلعے میں واپس آتے' دیوان خاص میں دربار ہوتا' نذریں لیتے' پھولوں کے طرّے اور ہار تقسیم کرتے' اس کے بعد خاصا کھاتے' آرام فرماتے۔[8]

بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۳۶ء کے مطابق:

''بروز عیدالاضحیٰ بادشاہ سلامت زرق برق لباس زیب تن فرما کر بہت عمدہ گھوڑے پر سوار ہو کر عید گاہ تشریف لے گئے۔ نماز سے فراغت حاصل کرنے کے بعد خلعت شفق پارچہ' دو رقم جواہر' ایک قبضہ شمشیر مع پرتلہ خطیب صاحب کو اور کمخواب کی قبا' سہ رقم جواہر اور قبضہ شمشیر وقارالدولہ ناظم امور خانسامانی کو مرحمت فرمائے۔ اس کے بعد اونٹ کی قربانی کی گئی اور حاضرین مجلس نے نان و کباب کا شغل کیا۔ اس وقت نہایت شادمانی اور فرحت کا ساز و سامان تھا۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے میں معروف نظر آتا تھا۔ چاروں طرف سے مبارک باد مبارک باد کی صدائیں آ رہی تھیں۔

جس راستے سے بادشاہ سلامت کی سواری گزری' امراء و رؤساء و اراکین سلطنت نے عید کی مبارک بادیں پیش کیں اور نذریں بھی گزرانیں۔ جب بادشاہ سلامت محل معلّیٰ میں تشریف لے گئے تو تمام خاندان کی بیگمات' جن میں خاندان تیموریہ کی خواتین بھی شامل ہیں' مبارک باد عرض کرنے کے لیے بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور حسب حیثیت نذر پیش کرنے کی عزت حاصل کی۔ آتے جاتے شاہی اور انگریزی توپ خانے سے نہایت بلند آواز کے ساتھ سلامی کی توپیں چھوڑی گئیں۔''[9]

اونٹ کی قربانی کا حال منشی فیض الدین یوں بیان کرتے ہیں:

''ایک اونٹ' بانات کی جھول پڑی ہوئی' سینے پر چونے کا نشان کیا ہوا' رسیوں میں جکڑا ہوا' فراش پکڑے کھڑے تھے۔ دیکھو اب اونٹ کی قربانی ہو رہی ہے۔ بادشاہ اونٹ کے پاس آئے۔ فراش نے ایک بڑی سی چادر بادشاہ اور اونٹ کے بیچ تان لی۔ قدر خانے کے داروغہ نے بادشاہ کے ہاتھ میں برچھی دی۔ قاضی نے اونٹ کی قربانی کی دعا پڑھوائی۔ بادشاہ نے دعا پڑھ کر چونے کے نشان پر اونٹ کے ٹاک کے برچھی ماری۔ قاضی نے اسے ذبح کیا۔ بادشاہ سوار ہو کر خیمے کی سہ دری کے پاس آئے۔ اے لو یہاں ایک دنبہ مہندی میں رنگا کھڑا ہے۔ بادشاہ نے اس کی قربانی کی۔ خیمے میں آئے۔ مسند پر بیٹھے۔[10]

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران بھی دو عیدیں آئیں۔ مخبر جیون لال اپنے روزنامچے میں ان کا حال یوں بیان کرتا ہے:

۲۵ مئی

''بادشاہ نے آج جامع مسجد میں عید کی نماز ادا کی۔ شاہزادگان بھی ہمراہ تھے۔ نماز کے وقت راجہ بلب گڑھ کی طرف سے ایک سانڈنی سوار آیا اور یہ اطلاع دی کہ مہاراجہ نے انگریزی فوج دیکھی ہے جو سیدھی دہلی کی جانب پیش قدمی کر رہی ہے۔ اس خبر نے بے حد ہیجان پیدا کر دیا۔ سپاہی اور بادشاہ کے مشیر ادھر اُدھر پھر رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کیا کارروائی اختیار کی جائے اور شہر کو چھوڑ دینا چاہیے یا نہیں۔ دیسی سواروں نے اپنے گھوڑوں کے زین کسنے شروع کر دیے۔ شہر کے بدمعاش ان کا مذاق اڑاتے رہے کیونکہ جلد جلد تیاری کرنے میں ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے..... بعد میں معلوم ہوا کہ انگریز فوج کی پیش قدمی کی خبر غلط ہے اور یہ کہ سانڈنی سوار کو عید کے جلوس کو دیکھ کر انگریزی ہراول فوج کا دھوکہ ہوا تھا۔ جب ذرا جوش دھیما پڑ گیا تو شہر کے عمائدین بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جیسا کہ عید کے موقع پر ان کا دستور تھا محل میں یہ خبر پہنچی کہ جھجمر اور باغیوں کے درمیان، بمقام ریتک جنگ برپا ہوئی جس میں باغی فتح یاب ہوئے اور یہ کہ وہ اب خزانہ کا کچھ حصہ ساتھ لے کر جسے انہوں نے لوٹا تھا واپس آ رہے ہیں۔''[11]

یکم اگست ۱۸۵۷ء

بادشاہ اعیانِ سلطنت کی معیت میں عید کی نماز ادا کرنے کی غرض سے مسجد میں تشریف لے گئے اور جامع مسجد، چھوٹی مسجد اور عیدگاہ کے مولویوں میں کپڑوں کے چھ جوڑے اور موتیوں کی تین مالائیں تقسیم کیں۔ مرزا احمد سلطان اور مرزا جہان داد خان کو چار چار خلعت اور تین تین مالائیں عطا فرمائیں۔ بادشاہ نے عیدگاہ میں بھیڑ کی قربانی بھی ادا کی۔ مرزا جواں بخت، حکیم احسن اللہ خان، راجہ اجیت سنگھ رئیس پٹیالہ ناظر حسن، مرزا مظفر الدولہ، کپتان دلاور علی خان اور دیگر افسران نے اپنے اپنے مرتبے اور رتبے کے لحاظ سے نذریں پیش کیں جن کی مجموعی مقدار ۱۸ اشرفیاں اور ۱۲۰ روپے تھی۔ آج خبر موصول ہوئی کہ نیمچ کی فوج کا بمقام پارسی انگریزوں سے معرکہ رہا۔ جس میں بہت سے مقتول و مجروح ہوئے۔ بارش کی وجہ سے سخت تکلیف کا سامنا رہا۔ اس کے بعد بادشاہ حرم میں تشریف لے گئے۔ بیگمات نے بھی نذریں پیش کیں۔ مجھے خفیہ طریقے سے معلوم ہوا کہ انگریزوں نے علی الصبح چھ توپوں کی باڑی کے ساتھ سپاہیوں پر حملہ کیا تھا اور موخرالذکر کو پسپا کر دیا تھا۔''[12]

یہ تو تھے خوشی کے تہوار..... اب ایک نظر عشرہ محرم پر ڈالیں۔

''محرم کا چاند نظر آتے ہی قلعے میں ماتم کے باجے بجنے لگتے تھے اور شہر میں جگہ جگہ سبیلیں لگائی جاتی تھیں۔ بادشاہ خود امام حسینؓ کے فقیر بنتے۔ سبز کپڑے پہنتے اور درگاہ میں جا کر سلام کرتے۔ دس روز تک

فقیروں کو کھانا اور شربت بٹتا تھا۔ ساتویں تاریخ کو رنگ رنگ کی قندیلیں روشن کی جاتیں اور مہندی تیار ہوتی۔ رات کو مہندی امام باڑے پہنچا دی جاتی۔ محرم کی آٹھویں تاریخ کو بادشاہ حضرت عباسؓ کے سقے بنتے۔ لال کھاروے کی ایک لنگی باندھ کر شربت کی ایک مشک کندھے پر رکھتے اور معصوموں کو اپنے ہاتھ سے شربت پلاتے۔ اس کے بعد ملیدے پر نیاز دی جاتی۔

عشرے کے دن یعنی محرم کی دس تاریخ کو موتی مسجد میں بادشاہ عاشورے کی نماز پڑھتے۔ اس کے بعد دیوانِ خاص میں دسترخوان کی تیاری ہوتی۔ دسترخوان پر شیرمالیں چنی جاتیں۔ شیرمالوں پر کباب، پودینہ، ادرک اور مولیاں کتر کر رکھی جاتیں۔ بادشاہ کھڑے ہو کر ان پر نیاز دیتے۔ نیاز کے بعد ذرا سا شیرمال کا ٹکڑا کباب کے ساتھ آپ چکھتے۔ اس کے بعد ایک شیرمال اور کباب ولی عہد کو اور اس کے بعد شہزادوں اور امیرزادوں کو اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتے۔ اکثر سلاطین قلعہ تعزیہ داری بھی کرتے تھے۔ تعزیوں کے آگے ڈھول تاشے بجتے۔ مرثیے پڑھے جاتے۔ مرثیہ خوانوں کو انعام و اکرام دیا جاتا۔ اس طرح عزاداری کے دن تکمیل کو پہنچتے۔[12] (بزم آخر)

مضمون کا اختتام غالب کے لکھے ہوئے ایک مرثیے کے چند اشعار پر کرتے ہیں:

فروغِ جوہر ایمان حسین ابن علی — کہ شمع انجمن کبریا کہیں اس کو
کفیل بخشش امت ہے بن نہیں پڑتی — اگر نہ شافع روزِ جزا کہیں اس کو
مسیح جس سے کرے اخذ فیض جاں بخشی — ستم ہے کشتہ تیغ جفا کہیں اس کو
وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل سبیل — شہید و تشنہ لب کربلا کہیں اس کو
بہت ہے پایہ گردِ رہِ حسین بلند — بقدر فہم ہے گر کیمیا کہیں اس کو
ہمارا منہ ہے کہ دیں اس کے حُسنِ صبر کی داد — مگر نبی و علی پیشوا کہیں اس کو
یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں — علی سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اس کو
یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ — برا نہ مانئے گر ہم برا کہیں اس کو
علی کے بعد حسن اور حسن کے بعد حسین — کرے جوان سے برائی بھلا کہیں اس کو
نبی کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے — رکھے امام سے جو بغض کیا کہیں اس کو

بھرا ہے غالب دلخستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اس کو

(دیوان غالب کامل از کالی داس گپتا رضا)

حوالہ جات

1-2 خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
3- حواشی خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
4- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔
5 تا 8 منشی فیض الدین از بزم آخر۔
9- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔
10- بزم آخر از منشی فیض الدین۔
11-12- جنگ آزادی کے دو خفیہ روزنامچے۔
13- بزم آخر بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز
14- غالب درون خانہ از کالی داس گپتا رضا

دلّی کی زبان.....اردو، ہندی، ہندوستانی، اردوئے معلّیٰ

''اردو آگے مرکب تھا۔ عربی اور فارسی اور ہندی اور ترکی ان چار زبانوں سے۔ اب پانچویں زبان یعنی انگریزی بھی اس میں شامل ہوگئی۔ دیکھو گنجائش اردو کی کہ یہ پانچوں زبانوں کو کس لطف سے حاوی ہوگی ہے اور یہ زبانیں اس میں کس طرح سما گئی ہیں کہ کوئی زبان اوپری معلوم نہیں ہوتی۔'' (نکاتِ غالب)[1]

مسلمان جب برصغیر میں آئے تو انہوں نے بحرِ ہند کے ساحل سے لے کر ہمالہ تک پھیلے ہوئے اس پورے خطے کو ہند یا ہندوستان کا نام دیا۔ (ان سے قبل یونانی دریائے سندھ کو انڈس اور اس حوالے سے اس دھرتی کو انڈیا کہہ چکے تھے۔) یہاں کی زبانوں کو وہ سنسکرت تھی، ملتانی تھی یا دکنی.....سب کو ہندی کہہ کر پکارا گیا۔ جب باہر سے آنے والے لوگ ترک، عرب، ایرانی، افغان آپس میں اور مقامی لوگوں سے گھلے ملے تو آہستہ آہستہ ایک مقامی زبان جو اپنے اندر بیرونی زبانوں کے الفاظ شامل کیے ہوئے تھی، وجود میں آئی، اسے ہندی ہی کہا گیا۔

شاہ جہان کے عہد میں بازار اور لشکرگاہ کی زبان کا نام ترکی لفظ اردو کے حوالے سے اردوئے معلّیٰ رکھا گیا۔ گویا قلعۂ معلّیٰ کی زبان.....اور دہلی (شاہ جہان آباد) کی بولی کا ڈھنگ زبان کی صحت اور صفائی کا معیار بنا.....کچھ عرصہ بعد اردوئے معلّیٰ کی بجائے اسے زبانِ اردو اور آخر میں مختصراً اردو کہا جانے لگا۔[2]

ایک طویل عرصہ تک اردو اور ہندی ایک ہی زبان کے لیے استعمال کیے جاتے رہے۔ انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج قائم کیا تو دو الگ الگ زبانوں اردو اور ہندی کے شعبے بنا کر مولویوں اور پنڈتوں کو ان میں بٹھا دیا۔ مولویوں نے سنسکرت الفاظ اور پنڈتوں نے عربی اور فارسی الفاظ کو زبان سے نکالنا شروع کر دیا اور یوں اردو اور ہندی دو حریف زبانیں بن کر سامنے آئیں۔ بنارس اور دہلی میں کالج قائم کیے گئے تو دہلی میں ہندی اور بنارس میں اردو کی حوصلہ شکنی کی گئی۔[3]

رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ زبان اردو اس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں تک دہلی اور میرٹھ

کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس کا تعلق شورسینی پراکرت سے بلاواسطہ تھا۔ یہ بھاشا جس کو مغربی ہندی کہنا بجا ہے' زبان اردو کی اصل اور ماں سمجھی جاسکتی ہے' گو کہ اردو کا نام اس زبان کو عرصہ دراز کے بعد دیا گیا۔ زبان اردو کی صرف ونحو' محاورات اور کثرت سے ہندی الفاظ کا اس میں استعمال ہونا اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس کی ابتدا ہندی سے ہوئی اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی زبان عام بن گئی' جس کی وجہ یہ ہوئی کہ دہلی جو اس زبان کا ابتدائی مرکز تھا' مسلمان حملہ آوروں اور بادشاہوں کی جائے ورود اور ان کا دارالسلطنت بنا ہوا تھا۔ پس یہ خیال کرنا جیسا کہ میر امن اور بعض دوسرے قدیم اردو شاروں کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے جس میں وہ سب زبانیں داخل ہیں' جو کسی زمانے میں دلّی کے بازاروں میں بولی جاتی تھیں' صحیح نہیں ہے۔ یہ ضرور سچ ہے کہ لشکر یا بازار سے اس زبان کی نشو ونما اور ترقی کو اس قدر تعلق ضرور تھا کہ اس کا نام ہی ''اردو'' ہوگیا جس کو زبان ترکی میں ''لشکر'' کہتے ہیں.....

اس زمانہ میں انگریزی تقلید میں اردو کو ہندوستانی کہتے ہیں مگر یہ لفظ ہماری رائے میں گو باعتبار لفظ صحیح ہو مگر حقیقت میں صحیح نہیں' کیونکہ اس لفظ میں مشرقی ہندی' مغربی ہندی' راجستھانی سب شامل ہیں۔ اس طرح ہمارے خیال میں برج بھاشا کو اردو کا ماٴخذ قرار دینا جو کہ مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے اور جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی سمجھا ہے' صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس وجہ سے کہ برج بھاشا جو متھرا اور اس کے جوانب میں بولی جاتی تھی' گو اس بھاشا سے جو اطراف دہلی میں بولی جاتی تھی' بہت مشابہت رکھتی تھی۔ مگر پراکرت کی ایک علیحدہ شاخ ہے اور یہی شاخ یعنی دلّی بھاشا ہمارے خیال میں زبان اردو کی اصل سمجھی جاسکتی ہے.....اردو چونکہ مسلمانوں کے سایۂ عاطفت میں پلی اس لیے اس میں فارسی الفاظ کی کثرت ہوگئی۔ برخلاف ہندی کے جو اپنے اصل ماخذ یعنی سنسکرت کی طرف عود کرگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانے کی ادبی اردو اور ادبی ہندی میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا یعنی اول الذکر میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے اور آخر الذکر غیر مانوس سنسکرت الفاظ سے بھری ہوئی ہے۔''[4]

مرزا حیرت دہلوی اس موضوع پر یوں رقمطراز ہیں:

''جو لوگ ہندی کو اردو کی اصل نہیں مانتے وہ سخت غلطی پر ہیں۔ ہماری دہلی کی زبان میں صدہا الفاظ خاص زمانہ ویدک کے موجود ہیں.....آٹھویں اور نویں صدی مسیحی میں خالص ہندی زبان میں غیر قوموں کے الفاظ مخلوط ہونے لگے تھے اور اخیر یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ بارہویں صدی عیسوی میں تو ہندی بالکل دم توڑنے لگی تھی۔ اس پر بھی تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ سولہویں صدی سے پہلے اردو کی بنیادیں قائم نہیں ہوئی تھیں کیونکہ قطب الدین ایبک کے بعد کئی شہنشاہی نسلوں میں فارسی ہی دربار اور خاندان کی زبان رہی اور مفتوحہ اقوام میں اپنی اسی ہندی کا رواج تھا' جس کی عمارت اب منہدم ہوتی چلی جاتی تھی۔ جب مسلمانوں کو ہندوستان میں زیادہ دن ہوگئے تو وہ بہت صاف ہندی بولنے لگے۔ مگر ہندی میں مسلمانوں کی طرف سے

فارسی کا کوئی لفظ مخلوط نہیں ہوا۔ خود ہندوؤں نے اپنی زبان میں فارسی کے الفاظ لے کے ہندی کو بھی کھچڑی کر دیا۔ ابتدا اس کی راجہ ٹوڈرمل سے ہوئی جو وزیر مال بنایا گیا تھا اور جب جدید مال گزاری کا سلسلہ بنا ہے تو اس میں راجہ مذکور نے بہت سے الفاظ فارسی کے شامل کر دیئے۔ شاہ جہان کی سلطنت ہوئی تو اردو بجائے خود ایک مستقل زبان کی صورت میں آگئی اور بتدریج اس میں ترقی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ یورپی زبانوں کے الفاظ اس میں شامل ہونے لگے۔۔۔۔ اردو کے صرفی ونحوی قواعد بالکل انہی اصولوں پر مبنی ہیں جن اصولوں پر ہندی کے ہیں۔''[5]

غالب نے اپنی اہلیہ کے بھانجے زین العابدین خان عارف کے بچوں باقر علی خان اور حسین علی خان کو فارسی پڑھانے کے لیے ایک منظوم رسالہ لکھا جو" قادر نامہ غالب" کے نام سے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے کہیں بھی اردو کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ عربی اور فارسی کے مترادف الفاظ کو ہندی کا نام دیا ہے۔

تیغ کی ہندی اگر تلوار ہے　　فارسی پگڑی کی بھی دستار ہے
نیولا راسو ہے اور طاؤس مور　　کبک کو ہندی میں کہتے ہیں چکور
چاہ کو ہندی میں کہتے ہیں کنواں　　دود کو ہندی میں کہتے ہیں دھواں
ہندی میں عقرب کا بچھو نام ہے　　فارسی میں بھوں کا ابرو نام ہے
اسپ جب ہندی میں گھوڑا نام پائے　　تازیانہ کیوں نہ کوڑا نام پائے

ہفت سات اور ہشت آٹھ اور بیست بیس ہی اگر کہیے تو ہندی اس کی تیس:

آجل اور آروغ کی ہندی ڈکار　　مے شراب اور پینے والا میگسار
فارسی آئینہ ہندی آرسی　　اور کنگھی کی ہے شانہ فارسی[6]

مسٹر ریٹی گن کے" تذکرہ شعرائے ہند" کے حوالے سے تفتہ کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ اشعار ہندی وفارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا۔ صرف شاعر کا اور اس کے استاد کا نام' شاعر کے مسکن وموطن کا نام مع تخلص درج ہوگا۔''
(۹ دسمبر ۱۸۶۲)[7]

جبکہ اسی خط میں اپنی طرف سے ریٹی گن کو ارسال کردہ سولہ شعراء کے کوائف کا ذکر کرتے ہوئے چند شعراء کا حوالہ دیتے ہیں تو ان کے لیے اردو شاعر کا لفظ بجائے ہندی کے استعمال کرتے ہیں۔

''نواب ضیاء الدین خان بہادر رئیس لوہارو فارسی و اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے۔ فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں۔ اسد اللہ خان غالب کے شاگرد نواب مصطفیٰ خان بہادر علاقہ دار جہانگیر آباد اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں۔ اردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے ہیں۔''[8]

۱۳جولائی ۱۸۶۷ءکوتمنامرزاپوری کے نام ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

''میرا کلام کیا نظم' کیا نثر' کیا اردو' کیا فارسی' کبھی میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کی فکر تھی وہ مسوّدات مجھ سے لے کر جمع کرتے تھے۔ سوان دوستوں کا زمانہ غدر میں گھر ہی لٹ گیا۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا پھر میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں۔''[9]

اس سے قبل ۱۸۵۹ء میں یوسف علی خان عزیز کے نام خط میں اردو کی بجائے ہندی کلام لکھتے ہیں:

''غدر میں میرا گھر نہیں لٹا' مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔ بھائی ضیاء الدین خان بہادر اور ناظر حسین مرزا ہندی اور فارسی نظم اور نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سوان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئے نہ کتاب رہی نہ اسباب۔''[10]

مرزا تفتہ کے نام ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''عُرفی کہتا ہے روح را ناشتا فرستادی یعنی روح کو تو نے بھوکا بھیجا' ناشتا' اس کو کہتے ہیں جس نے کچھ کھایا نہ ہوا' ہندی اس کی نہار منہ.....تم لکھتے ہو عجب ناشتا فرستادی یعنی غذائے صبح جیسا کہ ہندی میں مشہور ہے اس نے ناشتا بھی کیا ہے یا نہیں۔

واقف کہتا ہے:

نے محرم قفس نہ بہ دام آشنا شدیم　　نفریں کنیم ساعت پرواز خویش را

یہ بھی ہندی کی فارسی ہے۔ بری گھڑی اور شبھ گھڑی' اہل زبان ایسے موقع پر طالع لکھتے ہیں:

نفریں کنیم طالع پرواز خویش را

قتیل کہتا ہے:

کشتہ برکشتہ تپاں بود دگر خاک نبود

یہاں پر ہیچ نبود کا محل ہے۔ ہندی میں کچھ نہیں کی جگہ خاک نہیں بولتے ہیں۔ (۱۴مئی ۱۸۶۵ء)[11]

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ غالب اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان کے دو نام سمجھتے تھے۔ اب آیئے ذرا زبان کے ''چٹخارے'' کے لیے دلّی کی زبان کے کچھ نمونوں سے لطف اندوز ہوں۔

''نانی..... ہاں بیٹی چار چاند ہی لگے ہوئے تھے۔ یہ میلہ بادشاہ کی سرپرستی میں ہوتا تھا اور بادشاہ خود اس میں شریک ہوتے تھے۔ وہ دھوم دھام ہی کچھ اور تھی۔ لال قلعہ کی کوکھ ہری تھی۔ الغاروں دولت بھری پڑی تھی۔ لڈو ٹوٹتا ہے تو بھورا بھورا سبھی کو پہنچتا ہے۔ یہ شہر آبادی کا ذکر ہے' غدر پڑنے سے پہلے کا' مجھے پورا سا ہوش بھی نہیں تھا۔ ہمارے ہاں ایک مغلانی آیا کرتی تھیں۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں۔ گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں.....منہ میں کوئی دانت نہ تھا۔ سر پہ روئی کے گالے سے بال' دھان پان سی آدی تھیں۔ وہ سنایا کرتی تھیں اس سیر کا حال' بادشاہی محل سے لے کر تالاب اور جھرنے اور امریوں اور ناظر کے باغ تک زنانہ ہو گیا۔ جابجا

سر وپنچے کھنچ گئے۔ سپاہی اور نوجوں کے پہرے لگ گئے۔ کیا مقدور غیر مرد کے نام ایک پشہ بھی کہیں دکھائی دے جائے۔ محل کی جنگلی ڈیوڑھی سے بادشاہ ہوادار میں اور ملکہ زمانی تام جھام میں اور سب ساتھی سواری کے جھرنے پر آئے۔ بادشاہ اور ملکہ زمانی بارہ دری میں بیٹھے اور سب ادھر اُدھر سیر کرنے لگے۔ کڑھائیاں چڑھ گئیں۔ پکوان ہونے لگے۔ امریوں میں جھولے پڑ گئے۔ سووے والیاں آبیٹھیں۔ ایک کھڑی ایک کو ہلسا رہی ہے۔

''اے بی زناخی! اے بھی شمن! اے جانِ من! اچھی چلو پھسلنے پتھر پر سے پھسلیں۔''

وہ کہتی ہے: ''اے بی ہوش میں ہو۔ اپنے حواسوں پر سے صدقے تو دو۔ اپنے عقل کے ناخن لو کسی کا ہاتھ منہ تڑاؤ گی۔'' انادوا سمجھانے لگیں۔

''واہی کہیں بیویاں' بادشاہ زادیاں بھی پتھروں پر سے پھسلتی ہیں۔ لونڈیوں اور باندیوں کو پھسلواؤ اور آپ سیر دیکھو۔'' ''چلوبی میں تمہارے بھلاسڑوں میں نہیں آتی' ہم تو آپ ہی پھسلیں گے۔'' شام ہوگئی۔ جسولنی نے آواز دی ''خبر دار ہو بادشاہ سوار ہوئے۔'' وہ سب کچھ پھینک پھانک سواری کے ساتھ ہوئیں' نوکریں جا کریں گٹھڑی مٹھری سمیت سنبھال پیچھے الوچوکرتی دوڑیں۔''[12]

اور ذرا دلی کے خوانچے والوں کی صدائیں سنیے۔

جھڑ بیری کے بیر بیچنے والے کی صدا.....گھونگھٹ والی نے توڑے ہیں بیر لگ گیا کانٹا بکھر گئے بیر فالسوں کے لیے.....سانولے سلونے لگا دیئے ہیں شربت کو اودے اودے جو بن والے شربت کو۔ گنڈیری والا.....کیا معطر ہیں گنڈیریاں پونڈے کی.....

ککڑیوں کے لیے: لیلیٰ کی انگلیاں ہیں مجنوں کی پسلیاں ہیں' کیا خوب ککڑیاں ہیں پیسے کی دو۔

آموں والا: شرطیہ پیڑ بے دانہ کرانہ کا لڈو۔ آم کی پالی ہے یہ پالوں والا لڈو لو۔

جامنوں کے لیے: کالی بھونرا جامنیں نون والا نمکین لے۔

تربوز کے لیے: لال کا ڈلا لال کا ڈلا لالوں میں آ جا چھلکوں سمیت قند کے ڈلے ہیں۔ رنگ کے گھڑے ہیں۔

پان والا: کتنوں کو شرماتی ہے' جوبن کو چمکاتی ہے۔ اچھے منہ کو سجاتی ہے۔ گوری جب چباتی ہے۔ ہونٹوں آگ برساتی ہے۔ لے گلوری گوری کے لیے۔[13]

اور یہ ان خواتین کو دیکھیے خیر سے روزہ دار ہیں۔ افطاری تیار کرتے کرتے ایک دوسرے سے الجھ پڑیں۔

ایک: ''اے بی کیوں اپنا روزہ بگاڑ رہی ہو؟''

دوسری: ''چلوبی چلو بھی ہو تم اپنے روزے کی خیر مناؤ۔ بڑی آئیں وہاں سے۔''

پہلی: ''اے بیوی تم سے تو بات کرنی بھی غضب ہے۔ میں نے کچھ کہا بھی ہو؟ روزہ رکھو خدا کا اور ظلم توڑو بندوں پر۔''

دوسری: ''میں کہتی ہوں میرے منہ نہ لگنا، ہاں ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

پہلی: ''اے ناحق میرے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑگئی ہے۔ لڑکی ہے کہ جھاڑ کا کانٹا۔''

دوسری: ''بس بی بس منہ سنبھال کر بات کرو۔ ابھی ساری شیخی کرکری کردوں گی۔''

تیسری: ''اے بی تم بھی کس سے الجھ رہی ہو۔ اس کے سر پر آج شیطان چڑھا ہے۔ چلو چلو اسے اپنے تیسے میں آپ کھولنے دو۔''

حوالہ جات

1- نکات غالب، مجموعہ نثر غالب مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی۔

2- چراغ دہلی از مرزا حیرت دہلوی۔ تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ۔

3- مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق۔

4- تاریخ ادب اردو از رام بابو صاحب سکسینہ مترجمہ مرزا محمد عسکری۔ مطبع منشی نولکشور لکھنؤ۔

5- چراغ دہلی مرزا حیرت دہلوی۔ کرزن پریس، دہلی۔

6- قادرنامہ غالب.....پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۹ء۔

7- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔

8تا11 ایضاً۔

12- بزم آخر از منشی فیض الدین۔ اردو اکادمی، دہلی۔

13- دلی تھا جس کا نام از انتظار حسین۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ اجڑا دیار از شاہد احمد دہلوی۔

14- اجڑا دیار از شاہد احمد دہلوی، مکتبہ دانیال، کراچی۔

انیسویں صدی کی دلّی کے کچھ بڑے شاعر

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود
بادور خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیر صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

(غالب)

زبانِ فارسی ہو یا اردو، ادب کا ایک بڑا حصہ درباروں کی سرپرستی میں تخلیق ہوا ہے۔ انسان فطرتاً خوشامد پسند واقع ہوا ہے۔ خوشامد ترقی کا ایک ذریعہ تھی۔ ظلِ الٰہی کے قصائد اور مدح اور ان کے اعدا کی ذم و ہجو..... بادشاہ دربار میں شعراء کی قدر دانی اور سرپرستی کرنے لگے۔ ملک الشعراء اور سلطان الشعراء کے خطابات دیے جانے لگے۔ شاعر اور دربار دونوں ایک دوسرے کی وقعت بڑھانے لگے اور لازم و ملزوم ہو گئے..... الناس علیٰ دین ملوکہم..... بادشاہ کی دیکھا دیکھی والیان ریاست، امراء و اعیانِ سلطنت بھی اپنے درباروں کو اہل سخن کے ساتھ زینت بخشنے لگے۔ اہل سخن کی قدر دانی اور عزت افزائی کی جانے لگی۔ شعرائے کرام فکر معاش سے آزاد ہو کر تمام تر توجہ صنائع و بدائع، گونا گوں تخیلات اور مضامینِ نو پر مبذول کرنے لگے۔ شہزادگان، والیان ریاست اور امراء خود بھی شاعری کرنے لگے۔ یکے بعد دیگرے قلعۂ معلیٰ کے تین تخت نشین شاعر ہوئے تو پھر ایسا ہونا ہی تھا۔ کسی بڑے استاد کا شاگرد ہونا امراء کے لیے باعث افتخار سمجھا جانے لگا.....

لیکن یہ آدھا سچ ہے، ایک اور ادارہ بھی تھا جو شعر و سخن کی پرورش کر رہا تھا۔ یہ تھیں صوفیوں کی خانقاہیں..... دربار سے تو خواص کا تعلق ہوتا ہے..... صوفی کا در تو ہر ایک کے لیے کھلا ہوتا ہے اور ہمہ وقت کھلا ہوتا ہے۔ عوامی شاعری، لوک شاعری، تادیر باقی رہنے والی، زباں زد عام ہونے والی اور قبولیت عامہ کا درجہ حاصل کرنے والی شاعری خانقاہوں میں پرورش پا رہی تھی..... جنوبی ہند کا شعر و ادب انہی صوفیوں، فقیروں، درویشوں کے ہاتھوں پروان چڑھا، الا ماشاء اللہ۔ خود دبستان دہلی میں خواجہ میر درد کو کون نظر انداز کر سکتا

ہے۔۔۔میر نے اگرچہ انہیں آدھا شاعر مانا لیکن مانا تو سہی۔۔۔دلی کا کون شاعر تھا جس کے کلام پر یہ خانقاہی رنگ نہیں چڑھا۔۔۔خود حضرت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیے۔

یہ دنیا ہے اوگھٹ گھاٹی پگ نہ بہت پھیلاؤ جی
اتنے ہی پھیلاؤ کہ جس کے سکھ سے دکھ نہ پاؤ جی
اس دنیا کے جتنے دھندے سگرے گورکھ دھندے ہیں
ان کے پھندے جانہ پڑوتم ان میں نہ من الجھاؤ جی
یہ منوا ہے مورکھ لو بھی سب ہی پر الجائے ہے
جانو ہو تو اس مورکھ کو جیسے بنے سمجھاؤ جی
عمر اکارت تم نے کھوئی کچھ تو ادھر کا دھیان کرو
بہت گئی اور تھوڑی رہی ہے یہ بھی نہ یونہی گنواؤ جی
کہیے نہ بھولا اس کو ظفر جو صبح کا بسرا شام کو آئے
چھوڑ کے سگرے جھگڑے اپنے رب سے دھیان لگاؤ جی[1]

یہ فقیر جس عہد کی دلی کا ذکر کر رہا ہے اس میں شعراء کا ایک بڑا طبقہ دربار اور اہلِ دربار سے وابستہ تھا۔ یہ عہد دہلی کا امن کا دور تھا۔ خوشحالی کا دور تھا۔ لوگ سکھی تھے۔ نادر شاہی' احمد شاہی' مرہٹہ گردی' روہیلہ گردی سے نجات مل چکی تھی۔ تاجر' اہلِ حرفہ' کسان' فنکار' کوئی بھی طبقہ مالی ابتری کا شکار نہ تھا۔ دہلی کی ثقافتی تہذیب کے نئے نقش ونگار بننا شروع ہوگئے تھے۔

افسوس کہ اس عہد امن کے آغاز سے چند برس قبل حضرت میر۔۔۔میر تقی میر۔۔۔۔۔

چور اُچکے' سکھ' مرہٹے' شاہ گدا سب خواہاں ہیں کہتے ہوئے اودھ جا چکے تھے۔۔۔۔۔اور وہاں بیٹھ کر پورب کے ساکنوں کو اپنے اس اجڑے دیار کے فضائل سنا رہے تھے کہ جہاں منتخب روزگار لوگ ہی رہتے آئے تھے۔ میر تقی میر چلے گئے۔ خواجہ میر درورہ گئے۔ لیکن وہ فقیر خانقاہ نشین تھے۔ شاہ نصیر دہلوی تھے جو استاد شاہ کے بھی استاد تھے لیکن ۱۸۰۳ء میں وہ بھی دکن چلے گئے[2]۔

شاہ نصیر الدین نصیر تخلص عرفیت کلومیاں' ایک گوشہ نشین فقیر شاہ غریب کے فرزند میر محمدی مائل کے شاگرد' سنگلاخ زمینوں کے شاعر' عجیب عجیب طرحیں نکالتے' ہر ماہ کی پندرہ اور انتیس کو مشاعرے منعقد کرتے تھے۔ خاندانی وجاہت اور شاعری کی وجہ سے شاہ عالم کے دربار میں رسائی ہوئی' خوب قدر دانی ہوئی' انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے تھے۔ سیاحت کے شوقین تھے۔ بہت پُر گو شاعر تھے۔ ساٹھ سال شاعری کی مگر افسوس کہ اکثر کلام تلف ہوگیا۔

بادہ کشی کے سکھلاتے ہیں کیا ہی قرینے ساون بھادوں
کیفیت کے ہم نے جو دیکھا دو ہیں مہینے ساون بھادوں[3]

حکیم عزت اللہ عشق تھے۔ حکیم قدرت اللہ قاسم کے فرزند تھے۔ والد کے علاوہ حکیم ثناء اللہ فراق سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حافظ قرآن، طبابت میں ید طولیٰ، خوش طبع ظریف، اساتذہ فن میں شمار تھا۔ کہتے ہیں شاہ ظفر کے استاد بھی رہے تھے۔[4]

میر کاظم حسین بے قرار، شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ استاد ذوق کے ہم سبق اور ہم سن، ولی عہد کے استاد رہے، پھر انگریز کے نوکر ہو گئے۔ مسٹر جان الفنسٹن صاحب بہادر کے میر منشی ہو کر شکار پور سندھ چلے گئے۔[5]

شیخ ابراہیم ذوق سپاہی زادے تھے۔ والد شیخ محمد رمضان نواب لطف علی خان رئیس دہلی کی حرم سرا کے خادم تھے.....ابتدائی تعلیم کے لیے ایک صاحب حافظ غلام رسول کے سپرد کیے گئے جو معمولی درجہ کے شاعر بھی تھے۔ ذوق استاد کے ساتھ مشاعروں میں جایا کرتے۔ اشعار سن کر یاد کر لیتے۔ بار بار پڑھا کرتے پھر خود شعر کہنے لگے اور حافظ غلام رسول کو دکھانے لگے۔ میر کاظم حسین ہم محلہ اور ہم درس تھے۔ ان کے ساتھ جا کر شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ استاد سے ناراض ہوئے پھر کسی کو کلام بغرض اصلاح نہیں دکھایا۔ میر کاظم حسین کے ساتھ قلعہ معلیٰ کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے۔ ان کے سندھ جانے پر ولی عہد کے کلام کی اصلاح کی ذمہ داری ذوق کے سپرد ہوگئی۔ چار روپے ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا جو بڑھتے بڑھتے سو روپیہ ماہوار تک جا پہنچا۔ ایک قصیدے کے صلے میں ہاتھی مع حوضہ نقرئی عطا ہوا۔ ایک دوسرے قصیدے کے صلے میں ایک گاؤں بطور جاگیر عنایت ہوا.....لیکن سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ عمر بھر ایک تنگ گلی کے اندر ایک معمولی سے مکان میں رہے۔ نماز روزہ اور اوراد وظائف کے سختی سے پابند تھے۔ بیشتر کلام غدر میں ضائع ہو گیا۔ حیدر آباد دکن سے دعوت نامہ آیا تو معذرت کر لی۔

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

۱۸۰۸ء میں ابوظفر سے وابستہ ہوئے اور ۱۸۵۴ء میں اپنی وفات تک ان کا دامن نہ چھوڑا۔[6]

ذوق کی وفات کے بعد کلام شاہی کی اصلاح کی ذمہ داری غالب نے سنبھالی۔

یہ بھی کہا گیا کہ ظفر کا معتد بہ کلام دراصل استاد ذوق کی فکر سخن کا نتیجہ ہے۔ شاگرد ذوق مولوی محمد حسین آزاد اس تاثر کو ہمیشہ عام کرتے رہے۔ اس پر سرسید احمد خان نے خوب تبصرہ کیا:

''دو شاہ کا کلام تو کیا لکھتا قلعے کے تعلق سے خود ذوق کو زبان آ گئی۔''[7]

اور اگر قلعہ معلیٰ کے ایک پروردہ، بیگم غالب کے چچازاد بھائی نواب شمس الدین کے فرزند نواب مرزا خان داغ کی زبان ملاحظہ کی جائے تو سید احمد خان کے کہے پر ایمان لائے بنا چارہ نہیں رہتا۔ حضرت

فراق گورکھپوری تو سرسید سے بھی چند قدم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"اردو شاعری کی تاریخ اور روایتوں میں جو فائدے استادوں نے شاگردوں سے اٹھائے ہیں۔ وہ ہمیشہ صیغہ راز میں رہے اور ظفر کوئی معمولی شاگرد نہیں تھا۔ وہ ذوق کی شاعری اور شاعرانہ ذہنیت کی فضا بن گیا تھا۔"[8]

نواب نصیر حسین خیال لکھتے ہیں: "قلعہ معلیٰ کی زبان کے حوالے سے دیکھا جائے تو ظفر اور ذوق کی زبان میں وہی فرق ہے جو شاہ و گدا میں ہوتا ہے۔" (بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز)

حکیم مومن خان مومن حکیم غلام نبی کے فرزند تھے۔ دادا حکیم نامدار خان کشمیر سے آئے اور شاہ عالم کے زمانے میں شاہی طبیبوں میں داخل ہوئے۔ چند مواضعات جاگیر میں پائے۔ انگریزی راج آیا تو پنشن مقرر ہوئی جو مومن کو بھی ملا کرتی تھی۔ باپ اور چچا سے طبابت سیکھی۔ ذہانت طباعی اور استعداد شعر بچپن سے تھی۔ بلا کا حافظہ رکھتے تھے۔ نجوم میں بھی مہارت تھی۔ شطرنج کے باکمال کھلاڑی تھے۔ زیادہ تر کلام عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور ایسا ان کے مزاج کی مناسبت سے ہے۔ خاصا عاشقانہ مزاج پایا تھا۔ درباری پن اور خوشامد سے نفرت تھی۔ ان کا دیوان مدحیہ قصائد سے یکسر خالی ہے سوائے ایک قصیدہ کے جو راجا پٹیالہ کی مدح میں ہے۔ تاریخ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ۱۸۵۲ء میں چھت سے گر کر جاں بحق ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی پیشین گوئی کر چکے تھے۔[9]

میر سودا کے کئی شاگرد حلقہ مقربین ظفر میں موجود تھے۔ مرزا عظیم بیگ' میاں شکیبا' میر غالب علی سیدٗ قمر الدین منت' برہان الدین آرزو' میر نظام الدین ممنون' عبدالرحمٰن احسان' الٰہی بخش معروف' حکیم آغا جان عیش..... یوں اہل سخن کی ایک کہکشاں جگمگائی۔ کئی اور روشن ستارے امام بخش صہبائی اور صدر الدین آزردہ ابھرے اور پھر مہتاب و آفتاب مومن و غالب طلوع ہوئے۔

انہوں نے دہلی کو ہندوستان کا شیراز بنادیا..... ان کے بعد کئی اور انجم طلوع ہوئے۔ احمد حسین میکش' ضیاء الدین احمد نیر رخشاں' نواب مصطفیٰ خان شیفتہ' غلام حسن خان محو' زین العابدین عارف' حسین علی خان شاداں' قربان علی بیگ سالک.....

یاد ش بخیر حسام الدین حیدر خان' میرزا محمد غیاث کے فرزند ذوالفقار الدولہ نجف خان کے داماد..... مبارز الدولہ ممتاز الملک میر حسام الدین حیدر خان بہادر حسام جنگ نامی تخلص میر مستحسن خلیق اور میر تقی میر کے شاگرد غالب کے بزرگ دوست غالب کے خسر الٰہی بخش خان معروف کے بھی دوست۔ معروف نے کہا:

جو تم آؤ میرے مہماں حسام الدین حیدر خاں
کروں دل نذر جاں قرباں حسام الدین حیدر خاں[10]

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ حسام الدین حیدر خاں تو عمر اسد کی ایک غزل لکھنؤ لے گئے اور اپنے استاد کو

بہادر شاہ ظفر، تخت نشینی کے بعد

ملکہ زینت محل، عہد شباب میں

دکھائی۔ میرنے پڑھ کر کہا: "اگر اسے کوئی استاد مل گیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔"[11]
غالب کہتے ہیں کہ انہوں نے گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا یعنی ۱۸۰۷-۸ء میں جبکہ حضرت میر نے ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ لہٰذا حالی کے بیان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔"
اس عہد کے ایک اور بڑے شاعر تھے داغ۔

نواب مرزا خان داغ ۱۸۳۱ء میں دتی میں متولد ہوئے۔ آپ نواب شمس الدین خان والی فیروز پور جھرکہ کے فرزند تھے۔ والد ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں سولی چڑھا دیئے گئے۔ بعدازاں والدہ نے بہادر شاہ ظفر کے فرزند میرزا فخرو سے عقد کر لیا۔ شوکت محل کا خطاب پایا۔ یوں چھ سات سال کی عمر میں داغ قلعہ معلّی میں وارد ہوئے۔ شہزادوں کی طرح پرورش پائی۔ سوتیلے والد ولی عہد میرزا فخرو حضرت ذوق کے شاگرد تھے چنانچہ داغ بھی ان کے شاگرد ہو گئے۔ مولوی احمد حسین صاحب سے عربی اور مؤلف غیاث اللغات مولوی غیاث الدین سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس دور کے رواج کے مطابق خوش نویسی شہسواری بانک اور پٹے کی تربیت بھی حاصل کی۔ ۱۸۵۶ء میں میرزا فخرو انتقال کر گئے۔ ۱۸۵۷ء میں قلعہ معلّی اجڑ گیا چنانچہ داغ خانماں برباد ہو کر رام پور چلے گئے۔ والیٔ رام پور نواب یوسف علی خان نے قدردانی کی۔ ولیعہد نواب کلب علی خان کے مصاحب مقرر ہوئے۔ داروغہ اصطبل کی خدمت بھی ان کے سپرد ہوئی۔ نواب یوسف علی خان اور نواب کلب علی خان دونوں غالب سے اصلاح لیا کرتے تھے اور غالب کو وظیفہ بھی عطا کرتے تھے۔[12]

۲۷ جولائی ۱۸۶۸ء کو نواب کلب علی خان کے نام ایک خط میں غالب لکھتے ہیں:
"میں نے کل ایک خط نواب میرزا خان کو لکھا ہے خدا جانے وہ حضرت کی نظر سے گزرے یا نہ گزرے۔[13]" داغ نے ۲۴ سال نواب کلب علی خان کی مصاحبت میں گزارے۔

نواب کے ہمراہ دتی، پٹنہ اور لکھنؤ کے سفر کیے۔ حج و زیارات سے مشرف ہوئے۔ ۱۸۸۶ء میں نواب کلب علی خان انتقال کر گئے تو داغ دتی چلے گئے پھر دو سال مختلف مقامات کی سیاحت کی۔ آخر ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد پہنچے۔ نظام کے استاد مقرر ہوئے۔ "مقرب السلطان بلبل ہندوستان جہاں استاد ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک" کے خطاب پائے۔ پھر مرتے دم تک وہیں رہے۔ ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا۔ حیدر آباد میں ہی دفن ہوئے۔

چار دیوان تحریر کیے۔ گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ اور یادگار داغ۔[14]
ان کا کلام تصنع اور تکلف سے خالی، صنائع و بدائع کی کثرت اور حشو و زوائد سے پاک ہے۔ حلقۂ تلامذہ بے حد وسیع تھا۔ مسائل دہلوی، بیخود دہلوی، احسن مارہروی، نوح ناروی، آغا شاعر دہلوی، جگر مراد آبادی۔ حضرت علامہ اقبال فرما گئے ہیں[15]:

مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغ سخندان کا

غالب ٗ چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں اپنے عہد کے چند شعراء کے کلام کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔[16]

''وہ چیز دگر'' حصے میں پارسیوں کے آئی ہے۔ ہاں اردو زباں میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے:

میر تقی علیہ الرحمہ:

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا:

دکھلایئے لے جاکے تجھے مصر کا بازار
خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

قائم:

تجھ سے طلب بوسے کی؟ کیونکر مانوں
ہے تو ناداں مگر اتنا بدآموز نہیں

مومن خان:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا''

مومن کے اس شعر کے بدلے تو غالب اپنا دیوان دینے کو تیار بیٹھے تھے۔
۱۴مئی ۱۸۵۲ء کو مومن کی وفات ہوئی تو غالب نے لکھا۔[17]

شرطست روئے دل خراشم ہمہ عمر
خوں نامہ بہ رخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

غالب کہا کرتے تھے: ''مجھے نہ فن تاریخ سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ معنی کو چھوڑ کر محض لفظی صورت گری میرا شیوہ۔'' (بنام جان جاکوب بہادر)[18]

لیکن اپنے حریف ذوق کی تاریخ وفات نکالی اور کیا خوب نکالی۔

گویند رفت ذوق ز دنیا ستم بود
کاں گوہر گراں بہ تہہ خشت و گل نہند

تاریخ فوت شیخ بود ''ذوق جنتی''
برقول من رواست کہ احباب دل نہند[19]

۱۲۷۱ہجری

حواشی

1- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز
2- ایضاً
3- تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ۔
5-4 بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔ تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ۔
6- تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ۔
8-7- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔
9- تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ۔
10- غالب درونِ خانہ از کالی داس گپتا رضا۔
11- یادگار غالب از الطاف حسین حالی۔
12- خطوط غالب غلام رسول مہر۔
14-13- تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ۔
15- اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ سنبل نگار۔
16- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
17- کلیات فارسی غالب۔
18- پنج آہنگ۔ ترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔
19- کلیات فارسی غالب۔

دلّی کا آخری بادشاہ

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالب[1]

"حق سبحانہ ہمیشہ سلامت رکھے حضرت شہنشاہی حق شناس حق آگاہ سراج الملۃ والدین ابوظفر بہادر شاہ کو جو لباس بادشاہی میں یاد الٰہی کر رہے ہیں۔

شاہی و درویش ایں جا باہم است
بادشاہِ عہد قطبِ عالم است"[2]

دلّی کے آخری بادشاہ خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار سراج الدین ابوظفر محمد بہادر شاہ ثانی ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی کے فرزند ارجمند تھے۔ ۱۷۷۵ء میں متولد ہوئے۔ ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوئے۔ غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں رنگون جلاوطن کردیئے گئے جہاں ۱۸۶۲ء میں انتقال ہوا۔[3]

شاعر عالم صوفی خوش نویس شہسوار شمشیر زن تیر انداز نشانہ باز غرض بے شمار خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ ان کا ذکر مبارک یوں تو اس کتاب میں مختلف مقامات پر آچکا ہے لیکن ناموزوں نہ ہوگا کہ ایک باب الگ سے اس باہمت بزرگ پر قائم کیا جائے جس نے جوانی سے لے کر عہد پیری تک ناموافق حالات کا سامنا کیا اور بہت عزم و ہمت سے کیا۔ وظیفہ خواری کے دور میں شاہ جہاں جیسی بادشاہی کا نمونہ پیش کیا اور ہاں عہد شباب میں بھی تو والد کی طرف سے تعدی و حق تلفی کا شکار رہے اور اپنے حق ولی عہدی کے لیے جدوجہد کرتے رہے اور جب ضعیفی میں حالات نے انہیں دنیا کی سب سے بڑی اور منظم قوت کے خلاف جنگ لڑنے پر مجبور کیا تو انہوں نے اس چیلنج کا سامنا بھی جواں مردی سے کیا۔ صوبیدار بخت خان جیسے کمانڈر کے ساتھ گزارا کیا اور دلّی کا دفاع کرتے رہے۔ وہ بادشاہ کہ جس کے سامنے وقت کی سپر پاور کے نمائندے کورنش بجالاتے تھے۔ جب صوبیدار کے ان پڑھ پوربی سپاہی دربار میں اس کے ساتھ بدتمیزی سے "بڈھو ہم نے تمہیں باسا کیا" جیسی باتیں کرتے ہوں گے تو وہ انہیں برداشت کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتا ہوگا۔

اور جب ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو معزول بادشاہ کے سامنے اس کے تین شہزادوں مرزا مغل، مرزا ابوبکر اور خضر سلطان مرزا کے سر ہڈسن قصاب نے پیش کیے تو عزم و ہمت کے اس پیکر نے کہا تو صرف یہ کہ "الحمدللہ تیموری شہزادے سرخرو ہوئے۔"

غدر کے بعد قلعہ معلیٰ ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں ایک برطانوی نامہ نگار رسل نے اسے کس حال میں دیکھا۔

"جہاں ہم اس وقت کھڑے تھے۔ وہ ایک تنگ و تاریک راستہ تھا جو ایک کھلے صحن کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا اور اس سے آگے ایک کوٹھڑی تھی جو اس جگہ سے بھی زیادہ تاریک تھی۔ اس جگہ ایک نحیف و نزار بوڑھا شخص اکڑوں بیٹھا تھا۔ جسم پر میلا کچیلا ململ کا کرتا، سر پر چھوٹی سی ایک ٹوپی منڈھی ہوئی پاؤں ننگے، ہم غلط وقت پر آئے تھے۔ اصل میں معزول بادشاہ بیمار تھا اسے قے آ رہی تھی۔ قے کرنے کی کوشش میں وہ سامنے رکھے پیتل کے تسلے پر جھک کر بالکل دوہرا ہو گیا تھا۔"[4]

اسی قلعے میں یہ بادشاہ کبھی اس انداز میں بھی رہتا تھا۔ منشی فیض الدین کی زبانی سنیے:

"دیکھو یہ چاندی کا تخت، گرد کٹہرا، پشت پر تکیہ، آگے تین سیڑھیاں، نیچے پایوں میں کیسے خوبصورت پھول بنے ہوئے تھے۔ اوپر کرکری تاش کا تخت پوش پڑا ہوا تھا۔ دائیں طرف ملکہ دوراں اپنی مسند پر سر سے پاؤں تک سونے موتی جواہر میں ڈوبی ہیں۔ ناک میں نتھ جس میں چڑیا کے انڈے کے برابر موتی پڑے ہوئے ہیں، پہنے بیٹھی ہیں۔ ان کے برابر اور بیویاں اپنی اپنی سوزنیوں پر گہنا پہنے، ناک میں نتھیں ڈالے بیٹھی ہیں۔ بائیں طرف شہزادیاں بناؤ سنگار کیے سر سے پاؤں تک گہنے میں لدی ہوئی بیٹھی ہیں۔ سامنے حبشیاں، ترکنیاں، قلماقنیاں، اردابیگیاں، حسولنیاں، خواجہ سرائے جریبیں پکڑے مودب کھڑے ہیں۔ بادشاہ محل میں داخل ہوئے جسولنی نے آواز دی، خبردار ہو، سب بیگماتیں سرو قد کھڑی ہو گئیں مجرا کیا۔ تخت پر سے تخت پوش خوجوں نے اٹھایا۔ کہاریوں نے ہوادار تخت کے برابر لگا دیا۔ بادشاہ تخت پر بیٹھے۔ خواجہ سرائے مورچھل لے کر تخت کے برابر کھڑے ہو گئے۔ پہلے ملکہ دوراں نے کھڑے ہو کر مجرا کیا۔ نذر دی پھر مجرا کر کے بیٹھ گئیں۔ اب بیویوں اور شہزادیوں نے اسی طرح اپنے اپنے رتبے سے نذریں دیں۔ بادشاہ نے سب کو بھاری بھاری دوپٹے حیثیت کے موافق اپنے ہاتھ سے دیئے۔ سب نے کھڑے ہو کر دوپٹے لیے۔ مجرا کیا نذریں دیں۔ اب ناچ گانا شروع ہوا۔ ایلو ناچنے والی تو اندر بادشاہ کے سامنے ناچ رہی ہے اور سازندے سرونچ کے پیچھے کھڑے طبلہ سارنگی تال کی جوڑی بجا رہے ہیں۔ تان رس خان آئے دو چار تانیں ان کی سنیں۔ لو اب خاصے کی تیاری ہونے لگی۔ دربار برخاست ہوا۔ ناچ گانا موقوف ہوا۔ بادشاہ نے خاصہ نوش فرما کر سکھ کیا۔ تیسرے پہر سب اسی طرح اکٹھے ہو گئے۔ بادشاہ مسند پر آ کے بیٹھے۔ مٹھائی کے خوان اور آٹھ قابیں مٹھائی کی ایک چاندی کی کشتی میں بڑا سا قلادہ، پان کے بیڑے ہری ڈوب، مصری کے کوزے چاندی کا چھلا رکھا ہوا اور کمخوابی کشتی پوش

کلا بنوتی جھالر کا پڑا ہوا۔ جیسولسنی نے عرض کیا ''حضرت صاحب تشریف لائے'' بادشاہ سروقد تعظیم کو کھڑے ہو گئے مسند پر بٹھایا۔ حضرت صاحب نے پہلی ایک قاب پر حضرت ﷺ کی' دوسری حضرت علی رضی اللہ عنہ کی' تیسری پر حضرت فاطمہؓ کی' چوتھی پر حضرت امام حسن حسینؓ کی' پانچویں پر بڑے بڑوں کی' چھٹی پر بابر بادشاہ کی' ساتویں پر اُوتوں کی' آٹھویں پر پریوں کی نیاز دی۔ حضرت فاطمہؓ کی نیاز کا سوائے بی بی زنوں کے' بابر بادشاہ کی نیاز کا سوائے ان کی اولاد کے اور پریوں کی نیاز کا سوائے پارسا عورتوں کے اور کسی کو نہیں ملتا اور باقی سب کی نیازوں کا سب کو تقسیم ہو جاتا ہے۔ دیکھو حضرت صاحب نے کشتی میں سے کلاوہ نکالا۔ پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر ایک گرہ اس میں لگائی۔ دوسری گرہ میں پان کا بیڑہ باندھا' تیسری میں ہری دوب مصری کی ڈلی' چوتھی میں چاندی کا چھلا باندھا' پانچویں گرہ بادشاہ کے سر سے چھوا کر اس کلاوے میں لگائی۔ سب نے کھڑا ہو کر مجرا کیا۔ مبارکباد دی۔ ایک سال یہ ہزار سال اور خدا نصیب کرے سال گرہ کے شادیانے بجنے لگے۔ اب مہینہ بھر تک دربار نذریں خلعت انعام ناچ رنگ مہمانداری اسی طرح ہوگی۔''[5]

شاہ ظفر کی متنوع خوبیاں بیان کرتے ہوئے راقم الدولہ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں:

''حضرت بادشاہ خط نسخ میں میر امام علی شاہ صاحب مرحوم کے شاگردِ رشید تھے۔ دونوں بزرگوار خوش نویس لاثانی تھے۔ دہلی میں اس فن کے جتنے خوش نویس تھے میرے والد کے یا بادشاہ کے شاگرد تھے۔''[6]

بہادر شاہ کی شہسواری اور مبصری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مشہور ہے کہ ہندوستان میں ڈھائی سوار تھے' ایک بہادر شاہ' دوسرے آپ کے بھائی مرزا جہانگیر جنہوں نے انگریزوں سے شرط بد کر الہ آباد کی خندق گھوڑے سے کھدائی تھی اور نصف سوار کوئی مرہٹہ مشہور تھا.... حضورِ انور جیسے شہسوار تھے اسی درجہ مبصر بھی تھے۔ گھوڑے کے عیب وصواب وقوم دور سے دیکھ کر بتا دیتے تھے اور ہر قوم کی عادت وسیرت سے از روئے تجربہ آگاہ تھے۔''[7]

بہادر شاہ کی فنونِ حرب اور طاقتِ جسمانی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''بندوق ایسی لگاتے تھے کہ باید وشاید' بال بندھا نشانہ اڑاتے' کبھی نشانہ خطا نہ کرتا۔ بارہا ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ جانور اڑتا ہوا جاتا ہے' ہوادار پر بندوق دھری ہے' اٹھائی اور جھونک دی' چھتیانے کی حاجت نہیں لوٹ پوٹ ہوا اور دریا میں آرہا۔ دریا میں مچھلی یا مگر نے منہ نکالا گولی فخرین پر پڑی اور چت ہو گیا۔''

''تیر اندازی میں آپا سنگھ کے شاگرد تھے۔ جوانی میں تیر اندازی کی مشق بڑھانے کو دیوانِ خاص میں ایک جرِ ثقیل لگا رکھی تھی۔ تین من چنوں کی پوٹ نیچے لٹکتی تھی۔ جرِ ثقیل کے ذریعے اسے چٹکی سے کھینچا کرتے تھے۔ تیس ٹانک کمان کھینچنے پر قادر تھے اچھی کمان کو کباڑہ بنا کر پھینک دیتے تھے۔''

''شمشیر زنی میں میر حامد علی صاحب کے شاگرد تھے۔ علی مد کی کثرت جو حضرت علی مرتضیٰ شیر خدا کی

ایجاد ہے وہ ان کے گھرانے کی میراث تھی۔ میں نے اپنے والد سے سنا ہے کہ بادشاہ تن تنہا آٹھ آدمیوں کے مقابل یکدم کسرت کرتے تھے اور آٹھ آدمی برابر ان پر چوٹ کرتے تھے اور بادشاہ سب کے وار روکتے تھے اور اپنی چوٹ چھوڑتے جاتے تھے۔"[8]

کثیر الاولاد تھے۔ ۱۴ فرزندان اور ۳۱ دختران ان کے ہاں متولد ہوئیں۔ فرزندان کے اسماء درج ذیل ہیں:[9]

۱۔ مرزا محمد دارا بخت بہادر میران شاہ ولی عہد اول
۲۔ مرزا محمد شاہ رخ بہادر وزیر اعظم و مختار عام
۳۔ مرزا کیومرث بہادر ولی عہد دوم
۴۔ مرزا سلطان فتح الملک بہادر ولی عہد سوم
۵۔ مرزا محمد قویش بہادر
۶۔ مرزا ظہیر الدین عرف مرزا مغل بہادر
۷۔ مرزا فرخندہ شاہ بہادر
۸۔ مرزا خضر سلطان بہادر
۹۔ مرزا بختار شاہ بہادر
۱۰۔ مرزا سہراب ہندی بہادر
۱۱۔ مرزا ابونصر بہادر
۱۲۔ مرزا احمدی بہادر
۱۳۔ مرزا عبداللہ بہادر
۱۴۔ مرزا کوچک سلطان بہادر
۱۵۔ مرزا شاہ عباس بہادر
۱۶۔ مرزا جواں بخت بہادر

دختران کے اسماء کچھ یوں تھے

۱۔ کاشفہ سلطان بیگم	۲۔ ننھی بیگم
۳۔ آغا بیگم	۴۔ مبارک النساء بیگم
۵۔ شبیہ بیگم	۶۔ کھمولی بیگم
۷۔ دبیر الزمانی بیگم	۸۔ حسن زمانی بیگم
۹۔ نواب بیگم	۱۰۔ حاجی بیگم

۱۱۔ کلثوم زمانی بیگم	۱۲۔ جمیلہ بیگم
۱۳۔ اورنگ زمانی بیگم	۱۴۔ پیاری بیگم
۱۵۔ بسیتی بیگم	۱۶۔ منھی بیگم (خورد)
۱۷۔ حمید الزمانی بیگم	۱۸۔ ثالث زمانی بیگم
۱۹۔ قطبی بیگم	۲۰۔ بلاقن بیگم
۲۱۔ مریم زمانی بیگم	۲۲۔ رابعہ بیگم
۲۳۔ حاتم زمانی بیگم	۲۴۔ قریشہ سلطان بیگم
۲۵۔ سلطان زمانی بیگم	۲۶۔ خیر النساء بیگم
۲۷۔ ستارہ سلطان بیگم	۲۸۔ افسر زمانی بیگم
۲۹۔ تہنیت آراء بیگم	۳۰۔ خاتون زمانی بیگم

ابوظفر نام کے بادشاہ تھے۔ اگرچہ ہندوستان بھر میں ان کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور سکوں پر بھی ان کا نام ضرب کیا جاتا تھا۔ منادی میں بھی اعلان بھی کیا جاتا تھا کہ ''ملک بادشاہ کا حکومت کمپنی بہادر کی۔''[10] شاہی آداب اور دربار برقرار تھا عدالتوں میں سزائیں بادشاہ کے نام پر دی جاتی تھیں لیکن عملی طور پر وہ محض ایک پنشن خوار تھے لہٰذا وہی مشاغل رہے تھے شکار اور شاعری۔

دہلی اردو اخبار کی بعض خبروں میں صاحب کلاں بہادر کے سامنے 'حضورِ والا' کی بے بسی صاف نظر آتی ہے لیکن اس کا ایک روشن پہلو بھی ہے اور وہ ہے مطلق العنانیت کی آہستہ روی سے جگہ لیتی ہوئی قانون کی عمل داری۔

دہلی اردو اخبار ۱۲ جولائی ۱۸۴۰ء دو خبریں ملاحظہ کیجیے:

''ایک لونڈی کی ناک حضور والا نے بسب مرتکب ہونے فعل شنیعہ کے کاٹ لی سو اس باب میں اظہارات محکمۂ اجنٹی میں ہوئے اور معرکۂ عظیم درپیش ہے۔''

''جیون لال منشی صاحب کلاں بہادر نے باریاب مجرا ہو کچھ کاغذات ملاحظہ کروا کے اور ایک عورت کو سامنے کر کے عرض کی کہ یہ عورت کہتی ہے کہ میری بیٹی محل حضور والا میں ہے۔ استماع فرما گئے ایک خواجہ سرا ہمراہ کر دیا کہ محل میں ہو تو فوراً دلوا دو۔ خواجہ سرا نے مع عورت کے محل میں بہت تلاش کی مگر اسے نا پایا۔''[10A]

شکار کا ایک پورا محکمہ تھا قراول کے نام سے۔ شکار پر جاتے تو پچاس ساٹھ ملازم ساتھ ہوتے' گرمیوں میں ہوادار اور سردیوں میں شیشے سے بند پالکی میں بیٹھ کر جاتے۔ دریائے جمنا کے دونوں کناروں پر شکار گاہ مقرر تھی جو دہلی سے سات آٹھ کوس دور تھی۔ ضمناً یہ ذکر کرتا چلوں کہ بادشاہ آزاد نہ صرف شہر دِلّی میں

ریذیڈنسی کشمیری گیٹ، دہلی

مٹکاف ہاؤس، غدر سے پہلے

پھر سکتے تھے یا پھر اپنی شکار گاہ تک جا سکتے۔ اگر کہیں اور جانا چاہتے تو انگریز ریذیڈنٹ کی معیت ضروری تھی۔[11] نشانہ غضب کا تھا شکار بہت کم بچ کر نکلتا تھا۔

شاعری کا تذکرہ مختلف مقامات پر ہو چکا ہے۔ یہاں صرف جناب عرش تیموری کی رائے اور چند اشعار پیش کروں گا۔

"گو محمد حسین آزاد نے داستان گوئی سے کام لیا ہے لیکن ہم انہیں معاف کرتے ہیں۔ بے شک استاد ذوق کے کلام میں استادانہ صفائی ہے لیکن وہ زبان اور وہ درد کہاں نصیب:

گل بھلا کچھ تو بہاریں اے صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اور ایک شعر لکھتا ہوں

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

اور یہ مثلث بھی ان کا قابل دید ہے

یا تو افسر میرا شاہانہ بنایا ہوتا
یا میرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

اور چند شعر ذیل میں درج کرتا ہوں۔ میں ان کی شاعری پر تفصیل سے لکھتا مگر یہ میرا موضوع نہیں اس لیے اتنا ہی کافی ہے

کبھی بن سنور کے جو آ گئے تو بہارِ حسن دکھا گئے
میرے دل کو داغ لگا گئے یہ نیا شگوفہ کھلا گئے
یہ دعا ہے دل کی نہ آئے دل کوئی بے وفا نہ دکھائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

ظفر"[12]

کلامِ ظفر کے نمونے کے یہ اشعار جناب عرش تیموری نے نقل کیے ہیں۔ دو شعر اس فقیر کی طرف سے:

خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش خاکِ درِ جاناں نہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں خرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا

۱۱مئی ۱۸۵۷ء کی صبح میرٹھ سے ۳۸ رجمنٹ کے سپاہی قلعہ کے جمنا کے رخ واقع جھروکے کے نیچے جمع ہوئے اور چلا چلا کر اپنی کارگزاری بیان کرنے لگے اور بادشاہ سے سرپرستی کا مطالبہ کرنے لگے تو بادشاہ نے کہا:

''سنو بادشاہت سو برس ہوئے ہمارے گھر سے رخصت ہو چکی۔ ہم فقیر ہیں اپنی اولاد لیے بیٹھے ہیں۔ خزانہ نہیں کہ تم کو تنخواہ دیں، فوج نہیں کہ تمہاری مدد کریں، ملک نہیں کہ تم کو تحصیل کے لیے نوکر رکھیں ہاں یہ کر سکتے ہیں کہ انگریزوں سے تمہاری صلح کرادیں۔''

سپاہی چلائے

''آپ ظل الٰہی ہیں، دین و دنیا کے بادشاہ ہیں مہابلی ہیں، دہائی ہے بادشاہ سلامت کی.... فرنگی مردہ باد بادشاہ زندہ باد۔''

بادشاہ نے وکیل غلام عباس کو بھیج کر کپتان ڈگلس کو بلایا اور صورت حال سے آگاہ کیا اور ایک سانڈنی سوار کو خط دے کر لیفٹیننٹ گورنر کے پاس آگرہ روانہ کیا۔[14] بادشاہ کی فراست اور بصیرت نے بغاوت کا انجام بھانپ لیا تھا وہ انگریزوں کی منظم فوجی قوت سے بخوبی آگاہ تھے اور باغیوں کی کمزوریوں سے بھی۔

جب بیرون شہر سے باغیوں کی بڑی تعداد شہر میں آگئی اور دلی چھاؤنی میں موجود دیسی سپاہیوں نے بغاوت کر دی اور تمام انگریز افسروں کو قتل کر دیا تو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سیاسی اور انتظامی خلا کو پر کرنے کے لیے بادشاہ کے پاس اعلان بادشاہت کے سوا کوئی اور چارہ نہ رہا لیکن بادشاہ اب بھی بے اختیار تھے۔ ان کے منع کرنے کے باوجود باغیوں نے انگریز خواتین اور بچوں کو قلعہ کے تہہ خانے سے نکال کر قتل کر دیا۔ ان کے منع کرنے کے باوجود شہر میں لوٹ مار کی اور ہندو ساہو کاروں کو یرغمال بنا کر بھاری رقوم وصول کیں۔ حکیم احسن اللہ خان کو باغی سردار مار قتل کرنا چاہتے تھے اس کی جان بچانے کے لیے بادشاہ کو خود کو اس کے اوپر گرانا پڑا۔[15]

جنگ کا جو منطقی انجام ہونا تھا وہی ہوا لیکن نتائج شاہ ظفر کو بھگتنا پڑے۔ ان کا خاندان بے خانماں ہوا۔ چار شہزادے ہڈسن قصاب کے ہاتھوں گولی کا نشانہ بنے۔ خود ان پر بغاوت مقدمہ قائم ہوا۔ قلعہ کے تہہ خانہ میں قید ہوئے۔ رنگون جلاوطنی کی سزا ملی۔ دلی سے کلکتہ بھیجا گیا۔ اس وقت تک مقام جلاوطنی صیغہ راز میں رکھا گیا۔ غالب سید سرفراز حسین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''بادشاہ، میرزا جوان بخت، میرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتہ پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہوگی دیکھئے کیپ میں رہیں یا لندن جائیں۔''

۲۳دسمبر ۱۸۵۸ء[16]

میر مہدی کے نام ایک خط میں عالم غربت میں شاہ کے انتقال پرملال کی خبریں سناتے ہیں:

۷ نومبر ۱۲ جمادی الاول سال حال (۹ ۱۲۷ھ ۱۸۶۲ء) جمعہ کے دن ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ وقید جسم سے رہا ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ (دسمبر ۱۸۶۳ء)[17]

حوالہ جات

1- مرقع غالب۔
2- دیباچہ سراج المرخت بحوالہ مجموعہ نثر اردو غالب خلیل الرحمن داؤدی۔
3- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔
4- دتی تھا جس کا نام از انتظار حسین۔
5- بزم آخر از منشی فیض الدین۔
6'7'8- داستان غدر از راقم الدولہ ظہیر دہلوی۔
9- قلعہ معلّٰی کی جھلکیاں از عرش تیموری۔
10- چراغ دہلی از شہزادہ احمد اختر گرگانی۔
10A- ہندوستانی اخبار نویسی محمد عتیق صدیقی۔
11- قلعہ معلّٰی کی جھلکیاں۔
12'13- ایضاً
14'15- بہادر شاہ ظفر اسلم پرویز۔
Twilight of Mughals. By P. Spear
16'17- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر

نصیرالدولہ کرنل جیمس سکنر بہادر غالب جنگ........ دلّی اور انگریز

بنام نامی غالب ہمی رود نامہ
ز اسکنر کہ ارادت گزین دیریں است

غالب نامور کے نام دیرینہ نیاز مند اسکنر کی جانب سے۔ یہ شعر مسٹر الیگزینڈر اسکنر نے اولڈ ٹام سکاچ وہسکی کے ایک کریٹ کے تحفے کے ساتھ غالب کو بھیجا تھا۔ ساتھ ہی ایک قطعہ علاؤالدین احمد خان علائی کا نظم کردہ تھا جس کا ایک شعر تھا:

آتش مزاج آب فرح بخش خوشگوار
سرمایہ نشاط مئی ناب اولڈ ٹام

اس کے جواب میں غالب نے شکریے کے ساتھ ایک قطعہ بزبان فارسی ارسال کیا جس کا آغاز یوں ہوتا تھا۔

از دوست بہر بندہ زہے شیشہ ہائی مے
از بندہ سوی دوست بہ ہر شیشہ یک سلام
سلطان شکوہ مسٹر الیگزینڈر اسکنر
آن آسمانِ عزد شرف را مہ تمام[1]

الیگزینڈر اسکنر جو لیلک صاحب کے نام سے مشہور تھے کرنل جیمس سکنر سی بی المعروف سکندر صاحب کے فرزند تھے۔ دلّی میں ان کا خاندان الک صاحب والوں کے نام سے مشہور رہا۔ ان کی کوٹھی اندرون کشمیری دروازہ واقع تھی[2]۔ کشمیری دروازے کے مقابل ان کے والد کا بنایا ہوا گرجا گھر تھا جو آج بھی سینٹ جیمز چرچ کے نام سے مشہور ہے، جس کے احاطے میں ان کا خاندانی قبرستان ہے۔

''تفریح دہلی'' میں ہے۔
یہ مشہور گرجا گھر کشمیری دروازے کے قریب جہاں کہ سوداگروں کی ولایتی سامان وغیرہ کی شاندار دکانات ہیں اُن کے بیچ میں لب سڑک واقع ہے۔ اس کو ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کرنل جیمز اسکنر نے ۹۰ ہزار روپیہ کی لاگت سے تعمیر کرایا تھا۔

غدر کے بعد میدان جنگ میں جبکہ وہ زخمی ہو کر خطرناک حالت میں پڑا تھا اس نے منت مانی کہ اگر وہ زندہ رہتا تو گرجا بنواتا' لہٰذا یہ گرجا اس کی منت کے مطابق اس کا عہد پورا کرنے کے لیے بنوایا۔ اس کے بنوانے والے نے گرجا کے علاوہ ایک مسجد مسلمانوں کے لیے اور ایک مندر ہندوؤں کے لیے بھی بنوایا۔''[3]

نواب قزلباش نے غلطی کی ہے کیونکہ یہ گرجا ۱۸۳۶ء میں تعمیر کیا گیا۔ مسٹر سپئیر لکھتے ہیں:

''تیس سال پہلے کی ایک مرہٹہ جنگ میں جان بچنے کے شکرانے کے طور پر بنوایا گیا۔ کہا جاتا ہے یہ چرچ سینٹ پال کیتھڈرل کے نمونے پر بنایا گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے اوپر موجود گنبد کرنل اسکنر کے اسلام سے لگاؤ کی نشانی ہے لیکن یہ وینس میں موجود ایک چرچ کے نمونے پر بنایا گیا ہے۔ اس کے معمار آرمی انجینیئرز کے کرنل اسمتھ تھے۔ کرنل اسمتھ جامع مسجد اور قطب مینار کی تعمیر نو اور تزئین کے ذمہ دار بھی تھے۔''[4]

اسکنر صاحب کی حویلی میں اب ہندو کالج قائم ہے۔[5]

جیمز اسکنر دولت راؤ سندھیا کی سرکار میں ملازم تھے لیکن جب سندھیا کی انگریزوں سے جنگ ہوئی تو انہیں برطرف کر دیا گیا۔ انہوں نے اپنی ذاتی رجمنٹ کھڑی کی جو سکنر ہارس کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۱۸۰۴ء میں دتی کا محاصرہ تڑوانے میں مسٹر سکنر کا ایک اہم کردار رہا۔ ہولکر مرہٹوں کا ایک بڑا لشکر لے کر دتی پر چڑھ آیا تھا۔ آکٹرلونی نابینا بادشاہ شاہ عالم کے ہمراہ دتی میں زیر محاصرہ تھے۔ دتی کی سات کلومیٹر طویل بوسیدہ فصلیں چند روز سے زیادہ حملے کی تاب نہ لاسکتی تھیں۔ لارڈ لیک متھرا میں خیمہ زن تھے۔ دتی صرف اسی صورت میں بچ سکتی تھی کہ لارڈ لیک جلد از جلد وہاں پہنچ جائیں لیکن ہوا یوں کہ ساٹھ ہزار بیلوں پر لدی ہوئی ان کی رسد مقامی راجاؤں نے روک لی۔ جیمز سکنر اور اس کی زرد پوش رجمنٹ سکنر ہارس نے یہ رسد چھڑا کر لارڈ لیک تک پہنچائی۔ لارڈ لیک کو رسد ملی تو وہ دتی پر چڑھ دوڑا۔ ہولکر کے لیے محاصرہ اٹھا کر فرار ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔[6]

بادشاہ نے سکنر کو نصیر الدولہ کرنل جیمس سکنر بہادر غالب جنگ کا خطاب عطا کیا۔[7]

دتی کا سکنر ہاؤس ہندوستانی اشرافیہ کے محلات کی مانند ایک شاندار محل تھا جس میں سنگ مرمر کے حمام' اونچے ستونوں پر قائم بڑے بڑے ہال اور ایک حرم (زنانہ) تھا جس میں چودہ خواتین رہتی تھیں۔[8]

جیمز سکنر کے والد برطانوی جبکہ والدہ راجپوت تھیں۔ گورنر جنرل اور ان کی کونسل نے ایک قانون بنایا تھا جس کے مطابق ہندوستانی ماں سے پیدا ہونے والے کسی بچے کو کمیشنڈ رینک نہیں دیا جا سکتا تھا چنانچہ

اپنے جیسے کئی ہندوستانی ماؤں کے بیٹوں کی طرح اس نے مقامی راجاؤں کی ملازمت اختیار کر لی۔ انگریزوں کی مدد کے صلے میں اس کا نام کئی بار اعلیٰ اعزاز کے لیے تجویز کیا گیا۔ لیکن ہر بار کلکتہ سے گورنر جنرل آفس اعتراض اٹھاتا۔ CB کے اعزاز کی بات ہوتی تو اس کا راجپوت ماں کا بیٹا ہونا آڑے آ جاتا۔ جاگیر بخشنے کی سفارش کی جاتی تو برطانوی باپ کا بیٹا ہونا اس میں رکاوٹ بن جاتا۔[9]

لیکن اس کے پاس مرہٹوں کی دی ہوئی جاگیریں موجود تھیں۔ وہ ہانسی میں باقاعدہ دربار لگاتا تھا۔ نذریں وصول کرتا تھا اور خلعتیں دیتا تھا۔ اس نے فارسی اور اردو میں شاعری کی اور بزبان فارسی اپنی یادداشتیں بھی تحریر کیں۔[10]

سیر المنازل میں مسٹر سکنر کی ایک حویلی کا ذکر آتا ہے جس کی ڈیوڑھی پر تحریر تھا: ''حویلی کپتان جیمس سکنر صاحب بہادر ۱۸۱۱ء-۱۲۲۶ھ''[11]

لیڈی کلائیو بیلی لکھتی ہیں: ''میرے والد کرنل سکنر کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ ایک دوست نواز شخص اور عمدہ سپاہی تھے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ ان کے خاندان کا مذہب کیا تھا۔ ان کا ایک بیٹا جو (JO) سکنر کہلاتا تھا' وہ ایک شاندار نوجوان تھا۔ جب میں ان کے گھر گئی تو اس نے سبز کوٹ اور قرمزی پتلون پہن رکھی تھی کوٹ کے بٹن سنہری تھے۔ شاید سونے کے ہوں۔ اس کے ہاتھ میں سونے کی موٹھ والی ایک چھڑی تھی جسے وہ اپنے بوٹوں پر مارتا رہتا تھا۔ ایک اور بیٹا ایلیک سکنر تھا جب میں اس کی بیوی سے ملنے گئی جو بظاہر انگریزی فیشن سے آگاہ اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں' اس نے میرے لیے گانا گانے کی پیشکش کی' لیکن جب اس نے پیانو سنبھالا اور گانا شروع کیا تو دھن اور بول دونوں میرے لیے اجنبی تھے۔ جب میں نے موسیقی کی کتاب دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہ Vilikins and Dinah گا رہی تھیں' لیکن اس کا لہجہ مکمل طور پر تبدیل ہو چکا تھا۔''[12]

جب غدر کے دوران باغیوں نے سینٹ جیمز چرچ پر حملہ کیا تو انہوں نے وہاں موجود سکنر خاندان اور متکاف خاندان کی قبروں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جبکہ اسی احاطے میں موجود ولیم فریزر کی قبر کو توڑ پھوڑ دیا۔ (JO) جو سکنر غدر کے دوران مارا گیا۔[13]

یورپی حاکم طبقے کے لیے ہندوستان کی جاگیردارانہ ثقافت خاصی پُرکشش تھی۔ انہوں نے دیسی طرزِ معاشرت اختیار کیا' مقامی اشرافیہ میں شادیاں کیں۔ حرم بنائے' حرم کی خواتین کو پردہ کرایا۔ عالیشان حویلیاں' باغات اور بارہ دریاں تعمیر کرائیں۔ کرنل سکنر کے حرم کا ذکر آ چکا۔ سر ڈیوڈ آکٹر لونی کی تیرہ بیویاں تھیں جو ہر شام تیرہ ہاتھیوں پر سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے نکلتی تھیں۔ مقامی نوابوں ہی کی طرح ان کے گھروں میں ملازموں کی فوج ظفر موج ہوا کرتی تھی۔ ایک متوسط یورپی خاندان کے ساتھ ۶۰ کے قریب ملازم ہوتے تھے جن میں خانساماں' آبدار' چوبدار' مشعلچی' باورچی' آیا' بھنگی' بہشتی' خاکروب' مالی' سائیس' چپڑاسی' پہرہ دار' قلی' بڑھئی' درزی' دھوبی اور متعدد دوسرے نوکر ہوتے تھے۔[14]

وہ مقامی نوابوں کے سے لباس پہنتے تھے۔ حقہ پیتے تھے۔ عطر لگاتے تھے۔ پان چباتے تھے۔ بٹیر اور مرغ لڑاتے تھے۔ کبوتر اور شکرے پالتے تھے۔ رقص و سرود کی محافل منعقد کرتے تھے۔ وہ عمدہ گھوڑوں' ہاتھیوں اور پالکیوں پر لاؤلشکر کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ مشاعرے کراتے تھے۔[15]

غالب لکھتے ہیں: ''ہائے میجر جان جیکب! کیا جوان مارا گیا' سچ اس کا شیوہ تھا کہ اردو کی فکر کو مانع آتا تھا اور فارسی میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا تھا۔ بندہ نواز یہ بھی انہی میں سے ہے' جن کا میں ماتمی ہوں۔'' (بنام حاتم علی بیگ ۲ جولائی ۱۸۵۸ء)[16]

میجر جان جیکب زین العابدین خان عارف کا شاگرد تھا۔ فارسی میں شعر کہتا تھا۔ اس نے دیوان حافظ اصلاح کے بعد شائع کرایا' جس کا قطعہ تاریخ غالب نے لکھا۔

مغلیہ سلطنت کی کمزوری اور مضبوط مرکز کے خاتمے کے بعد ہندوستان میں افراتفری' لاقانونیت' قتل وغارت اور لوٹ مار کا دور دورہ ہو گیا' چنانچہ امراء نے تحفظ کے لیے اپنی نجی افواج رکھنا شروع کر دیں۔ ایک نیا منافع بخش پیشہ وجود میں آیا..... کرائے کے فوجی..... کئی مہم جو سردار ابھرے جو زیادہ سے زیادہ معاوضہ پر جنگجو بھرتی کرتے اور کسی اصول اور نظریہ کی پاسداری نہ کرتے ہوئے محض مناسب معاوضہ پر اپنی خدمات فروخت کرتے۔ غالب کے والد عبداللہ بیگ خان' چچا نصر اللہ بیگ خان' نانا غلام حسین خان کمیدان' چچا سسر نواب احمد بخش خان ایسے ہی جنگجو سردار تھے جو کبھی مغلوں کی نوکری کرتے' کبھی مرہٹوں کی' کبھی اودھ اور میسور کی تو کبھی انگریزوں کی۔ یورپ سے آنے والے مہم جوؤں نے اس پیشہ کو سود مند پایا تو وہ بھی اپنے جتھے تشکیل دینے لگے۔ انہیں مقامی لڑاکوں پر فوجی مہارت اور تکنیک میں بالادستی حاصل تھی' لہٰذا ان کی اس منڈی میں زیادہ کھپت تھی۔''[17]

ان میں ولندیزی' فرانسیسی' جرمن' اطالوی' برطانوی سب شامل تھے۔ انہوں نے مقامی خواتین کے ساتھ شادیاں کیں اور خود کو ہندوستانی تہذیب و تمدن میں ضم کر لیا۔ ہندوستانی نام کہلوانے لگے۔ سکندر صاحب' جہازی صاحب' سمرو صاحب وغیرہ۔ سمرو صاحب جرمن تھے۔ ان کا نام رائن ہارٹ تھا۔ بادشاہ نے انہیں خطاب اور سردھنہ میں جاگیر دی تھی۔ انہوں نے مقامی خاتون زیب النساء بیگم سے شادی کرلی۔ بیگم سمرو عیسائی ہو گئیں۔ ۱۷۸۰ء میں سمرو صاحب مارے گئے تو بیگم نے سردھنہ میں رہائش اختیار کی۔ وہ چوتھائی صدی تک اس جاگیر پر قابض رہیں۔ ان کی باقاعدہ ایک فوج تھی اور وہ ایک چھوٹی سی ریاست پر حکومت کرتی رہیں۔ انہوں نے اپنی جاگیر پر ایک چرچ تعمیر کرایا اور ایک بشپ رکھا' جس کا نام جولیس سیزر تھا۔ ۱۸۳۶ء میں انتقال کے بعد اسی چرچ میں دفن ہوئیں۔[18]

''گوردوارہ سیس گنج سے آگے بڑھیں تو دائیں ہاتھ صرافہ بازار آتا ہے۔ اس کا صحیح نام دریبہ ہے

اور یہ بازار جامع مسجد جا نکلتا ہے اور آگے بڑھیں تو بائیں ہاتھ بیگم سمرو (م ۱۸۳۶ء) کی رہائش گاہ آتی ہے۔ اب وہاں بینک قائم ہو گئے ہیں۔[19]

غالب لکھتے ہیں:

"میرا دادا قوقان بیگ خان شاہ عالم کے عہد میں سمر قند سے دلی میں آیا۔ پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا۔ پہاسو کا پرگنہ جواب سمرو کی بیگم کو سرکار سے ملا تھا وہ اس کی جاداد میں مقرر تھا۔"[20]

فرانسیسی مہم جو ڈی بوئی مادھوراؤ سندھیا کا ملازم تھا۔ وہ گیارہ برس تک شمالی ہندوستان میں اس کا نائب رہا۔ اس کی فوج میں ۳۰۰ یورپین اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھاگے ہوئے سپاہی تھے۔ وہ ۱۷۹۵ء میں ریٹائر ہوا تو اس کے پاس ۴ لاکھ پاؤنڈ کی رقم تھی۔ وہ اپنی ہندوستانی بیوی اور دو بچوں علی بخش اور بانو کو لے کر فرانس چلا گیا۔

ایک اور فرانسیسی پیرون ڈی بوئی کا جانشین ہوا۔ وہ جے پور جودھپور اور راجپوتانہ سے خراج لیتا تھا' بعدازاں اس نے مغل بادشاہ شاہ عالم کو یرغمال بنالیا۔ اس سے اپنی مرضی کے فرمان جاری کراتا تھا۔ جنرل لیک نے ۱۸۰۳ء میں پیرون کو شکست دے کر دلی پر قبضہ کیا۔[21]

جنرل لیک نے جب دلی پر قبضہ کیا۔ وہ انتہائی بدامنی اور افراتفری کا دور تھا۔ دلی کے نواح میں چھ سو گاؤں بے چراغ تھے۔ اہل دیہات مسلح جتھوں کی لوٹ مار کا نشانہ بنتے تھے اور حاکموں کی چیرہ دستیوں کا بھی۔ ان کے گھر لٹتے تھے فصلیں اجڑتی تھیں اور پھر سرکاری کارندے لگان وصول کرنے پہنچ جاتے تھے۔ تب اہل دیہہ نے بھی خود کو منظم اور مسلح کرنا شروع کیا۔ لگان دینے سے انکار کر دیا۔ سرکاری کارندے پٹنے جانے لگے۔ اکادکا فوجیوں کو مار دیا جاتا۔ دیہات میں قلعہ بندیاں کی گئیں۔ تجارتی قافلوں کو لوٹا جانے لگا۔ پھر لٹنے سے بچنے کے لیے قافلوں نے انہیں محصول دینا شروع کر دیا۔ ان کی ہمت اس قدر بڑھی کہ وہ دہلی پر دھاوے بولنے لگے۔ مٹکاف ان دیہی وارلارڈز کی عملداریوں کو Little Republics کہتا ہے۔[22] چارلس مٹکاف نے ان حکومتوں کا خاتمہ کیا۔ دیہات کو غیر مسلح کیا۔ اس نے گاؤں کے مقدمین کو اہمیت دی۔ ان کے ساتھ مذاکرات کیے۔ ان کے تحفظ کے اقدامات کیے۔ کاشتکاری کے فروغ کے لیے نہر علی مردان کو نئے سرے سے کھدوایا۔ نہر کا پانی جب چاندنی چوک پہنچا تو اہل دہلی نے پھولوں کی بارش کر کے اس کا استقبال کیا۔

زیر کاشت رقبے میں اضافہ ہوا۔ دہلی کے نواح میں باغات لگائے جانے لگے۔ کاشتکاروں کی حالت بہتر ہوئی۔ محصولات میں اضافہ ہوا۔ امن و امان کی صورتحال اچھی ہوئی تو لوگ فصیل شہر کے باہر مکانات تعمیر کرنے لگے۔ ویران عمارات اور مقابر پر مشتمل مہرولی کا قصبہ جو لٹیروں کی آماجگاہ تھا' اہل شہر کی تفریح گاہ میں بدل گیا۔[23]

چارلس مٹکاف نے مقامی لوگوں کو ریونیو کی تربیت دی۔ اس کے عملے میں کم سے کم ایک اور زیادہ

سے زیادہ تین یورپی افسر رہے' ورنہ ریونیو کا تمام نظام مقامی اہلکار چلاتے رہے۔ منکاف نے سزائے موت اور ستی پر بھی پابندی عائد کردی۔

دلّی کے اطراف میرٹھ اور کرنال میں برطانوی چھاؤنیاں قیام امن میں کافی مددگار ثابت ہوئیں۔ راستے محفوظ ہوئے تو تجارت کو فروغ ملا۔ لوٹ مار اور ڈکیتی کی وارداتوں میں کمی ہوئی تو شہر اور گاؤں دونوں ترقی کرنے لگے۔ ۱۸۳۳ء تک دلّی کے نواح میں واقع ۶۰۰ بے چراغ دیہات میں سے ۴۰۰ آباد ہوگئے۔[24]

تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ علوم مشرقیہ کے ساتھ ساتھ جدید مغربی علوم کی تعلیم بھی دی جانے لگی۔ مشرقی علوم پر تحقیق کے کام کا آغاز ہوا۔ ہندوستان کی قدیم دانش کی تلاش اور تدوین کے کام کا آغاز وارن ہیسٹنگز نے کیا تھا۔

کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج نے اردو کو حیات نو بخشی۔ ہندوستانی معاشرے پر چھائے ہوئے فکری جمود کے خاتمے کا آغاز ہوا۔ افکار اور اذہان پر جمی قدامت کی برف پگھلنے لگی۔ امن وامان کی صورتحال بہتر ہوئی تو جنگجوؤں اور لڑاکوں کی اہمیت اور ضرورت کم ہوئی۔ ان کی جگہ منتظموں نے لینا شروع کی۔ زراعت اور تجارت کو فروغ ملا تو محصولات میں اضافہ ہوا۔ مقامی لوگ ریونیو افسر بھرتی ہونے لگے۔[25]

مختلف دیوانی اور فوجداری عدالتوں کا قیام عمل میں آیا۔ منصفوں' وکلاء اور عدالتی اہلکاروں کی ضرورت بڑھی۔ تعلیمی اداروں کے لیے اچھے اساتذہ کی تلاش ہوئی پھر یہی ادارے خود اساتذہ پیدا کرنے لگے۔ پریس قائم ہوا۔ اخبارات کی اشاعت شروع ہوئی تو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار رائے عامہ بنی۔ اظہار خیال وافکار کے مواقع میسر آئے۔ بینک قائم ہوئے۔ یوں ہندوستان میں جدید مالیاتی اداروں کی بنیاد پڑی۔ برصغیر پر حاکم ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی ادارہ تھا۔ تجارت کے فروغ کے لیے امن واستحکام اور لوگوں میں قوت خرید کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ چنانچہ کمپنی کے بعض حکام نے ہندوستان کے عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے معاشرتی سماجی اور تعلیمی اصلاحات کی تجاویز دیں۔ یوں پسے ہوئے عوام کے لیے مطلق العنان حکمرانوں' ساہوکاروں' جاگیرداروں اور بیوپاریوں کے چنگل سے نکلنے کی راہیں کھلنے لگیں۔[26]

انگلستان میں صنعتی معاشرے کے قیام اور جاگیرداری کی کمزوری نے نئی معاشرتی اور سماجی روایات کو جنم دیا تھا۔ انہی اقدار کو ہندوستان میں فروغ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ آخر ہندوستان انگریزوں کے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھا اور اسے صحت مند رکھنا مالکوں کے مفاد میں تھا۔

ٹائمز لندن کی ۱۸۳۷ء کی ایک اشاعت میں لکھا گیا:

''وہ دن ختم ہوئے جب ہندوستان سے ہیرے جواہرات' تخت وطاؤس اور لعل و یاقوت لوٹے جاتے تھے۔ ہندوستان کا خزانہ اب لوگوں کے اندر ہے۔ ان کی حالت کو بہتر بنایا جائے اور ان کے ذرائع اور توانائی کو استعمال کیا جائے۔ ہندوستان سے قحط ختم کرنا اور لوگوں کی جسمانی اور مالی حالت ٹھیک کرنا اس کی

پوشیدہ دولت ہے۔"[27]

لارڈ ولیم بینٹنک' چارلس منکاف اور لارڈ میکالے اصلاحات کے حامیوں میں قابلِ ذکر ہیں۔ ولیم بینٹنک نے ٹھگی کا انسداد کیا' ستی کو روکنے کی کامیاب کوششیں کیں' کمپنی کے اہلکاروں کی لوٹ مار اور رشوت خوری کا بڑی حد تک خاتمہ کیا۔ منکاف نے قائم مقام گورنر جنرل کی حیثیت سے پریس کی آزادی کے لیے اقدامات اٹھائے باوجودیکہ کمپنی کے بااثر یورپی اہلکار اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ میکالے کا نام آتے ہی تعلیمی اصلاحات کا تصور ذہن میں آجاتا ہے۔[28]

۱۸۳۸ء کی افغان جنگ نے اصلاحات کے عمل کو سست کر دیا جبکہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی نے تو اسے بالکل ہی روک دیا۔ جنگ کے بعد ہندوستانیوں سے راہ و رسم کے نئے اصول ترتیب دیئے گئے۔ وفادار شہریوں اور "خونخوار باغیوں" میں تو آخر بہت فرق ہوتا ہے۔

انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان کے لوگ بنیادی انسانی حقوق کے تصور سے مطلق نا آشنا تھے۔ تعلیمی اداروں' عدلیہ اور اخبارات نے پہلی بار انہیں حقوق سے روشناس کرایا۔ سپاہ کے ساتھ لوٹ مار کا تصور وابستہ چلا آرہا تھا۔ سپاہی عموماً دکانوں سے چیزیں مفت اٹھا لیا کرتے تھے۔ لوگوں کے مویشی پکڑ لیا کرتے تھے۔ اناج اور گھاس چھین لیا کرتے تھے۔ لیکن برطانویوں کی طرف سے ایک منظم فوج کے قیام کے بعد یہ باتیں قصہ پارینہ ہو کر رہ گئیں۔ سکھوں' مرہٹوں اور راجپوت سپاہیوں نے لوٹ مار یکسر ترک کر دی' کیونکہ اب انہیں معقول تنخواہ ملنے لگی تھی جو باقاعدگی سے ملتی تھی۔[29] اگرچہ ۱۸۵۷ء میں دلّی کی بغاوت کچلنے کے بعد انگریزوں نے اپنے تمام اصول فراموش کر دیئے تھے لیکن ان کے رویے بہرحال تیمور نادر شاہ اور ابدالی سے کہیں بہتر تھے۔

انگریزوں کا بنیادی مقصد ہندوستان کے وسائل کو زیادہ سے زیادہ اپنے استعمال میں لانا تھا۔ وہ ہندوستان کی دولت بٹور کر انگلستان لے جاتے رہے۔ اگرچہ ان کا طریق کار محمود غزنوی نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی سے مختلف تھا۔ انھوں نے ہندوستان کو محض خام مال مہیا کرنے والی سرزمین بنا کر رکھا۔ یہاں کی صنعت کو ناکام بنایا گیا۔ یوں بھی دستکاری مشینی صنعت کا کب تک مقابلہ کرسکتی تھی۔ ٹیکسٹائل کی صنعت کو ایک مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن اس کے خاتمے میں مانچسٹر کی مشینی صنعت کا اہم کردار ہے جو ہندوستانی دستکاروں کے مقابلے میں کہیں سستا کپڑا بناتی تھی۔ ہندوستانی خود اسے ملکی کپڑے پر ترجیح دیتے تھے۔

۱۹۰۱ء میں دادا بھائی نوروجی نے پہلی بار ہندوستان کے معاشی استحصال پر کھلم کھلا بات کی۔ انہوں نے لکھا کہ انگریز ہندوستان سے دولت سمیٹ کر انگلستان لے جا رہا ہے جس کی وجہ سے یہ ملک اپنے ذرائع سے محروم ہو رہا ہے۔ اس سے ہندوستانی معاشرے کی مادی ترقی رک گئی ہے اور لوگ روز بروز افلاس کا شکار ہو رہے ہیں۔[30]

برطانوی حکام کا برصغیر کے عوام کے ساتھ عموی رویہ غیر ملکی فاتحین جیسا ہی رہا' خصوصاً غدر کے بعد یہ بدتر ہوگیا۔ انگریز حاکم ہندوستانیوں کے ساتھ نسلی امتیاز برتتے تھے اور انہیں اپنا غلام سمجھتے تھے۔ ہندوستانی اشرافیہ کے ساتھ انہوں نے اچھے تعلقات رکھے۔ انہیں استعمال کیا اور اس کے صلے میں ان کی سرپرستی کی۔

ہمارے ممدوح نواب اسداللہ خان غالب کا تعلق دتی کی اشرافیہ سے تھا۔ ان کے چچا نصراللہ بیگ خان اور چچا سسر نواب احمد بخش خان نے انگریزوں کے لیے بیش بہا خدمات انجام دی تھیں' چنانچہ انگریز حکام غالب کی پذیرائی کیا کرتے تھے۔

دتی کے ریذیڈنٹس چارلس مٹکاف' ایڈورڈ کولبروک' ولیم فریزر' جیمز ٹامسن سب کے ساتھ غالب کے خوشگوار تعلقات رہے۔ غالب اپنی پنشن کی بحالی کے لیے کلکتہ گئے تو گورنر جنرل کے دربار میں انہیں کرسی دی گئی اور لارڈ صاحب نے ان کی عزت افزائی کی۔ لکھتے ہیں:

''میرا نام صف اصحاب الیمین میں درج ہوا۔ مجھے عزت کی کرسی عطا کی گئی۔ حسن اتفاق سے کرسی نمبر ا پر راجا بھوپ سنگھ نمبر ۲ پر جانشین راجا کلیان سنگھ عظیم آبادی نمبر ۳ پر سفیر شاہ دہلی نمبر ۴ پر سفیر شاہ اودھ نمبر ۵ پر ہمایوں جاہ نواب مرشد آباد کے وکیل نمبر ۷ پر وکیل راجا نیپال نمبر ۸ پر میرے قبلہ و کعبہ جناب علی اکبر خان بہادر دام اقبالہ اور دسواں نمبر فدوی کا قرار پایا.....پیر کے روز بارگاہ میں حاضر ہوا۔ چونکہ نمبر ۹ جو علی اکبر خان کا تھا خالی تھا' اسے چھوڑ کر میں دسویں کرسی پر بیٹھ گیا۔ نواب گورنر جنرل بہادر تشریف لائے۔ میں نے دو اشرفیاں نذر کیں۔ رسم کے مطابق انہوں نے معاف فرما کر چندے توقف کیا اور میری نیازمندی کو سراہا اور انتہائے شفقت سے اپنے دست خاص سے عطر اور پان عطا فرمائے۔''[31]

(اپریل ۱۸۲۸ء)

''جناب لارڈ کیننگ بہادر نے کرسی گورنری پر اجلاس فرمایا تو میں نے موافق دستور کے قصیدہ ڈاک میں بھجوایا.....اڈمنسٹن صاحب بہادر چیف سکرتر کا جو مجھ کو خط آیا تو انہوں نے باوجود عدم سابقہ معرفت میرا القاب بڑھایا۔ قبل ازیں ''خان صاحب بسیار مہربان دوستان'' میرا القاب تھا۔ اس قدر شناس نے ازراہ قدر افزائی ''خان صاحب مشفق بسیار مہربان مخلصان لکھا'' (بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر ۱۸۵۸ء۔)[32]

''ہنری سٹورارٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب ہیں۔ امن کے دنوں میں ایک ملاقات میری ان کی ہوئی تھی۔ میں نے ایک کتاب سادہ بے جلد ان کو بھیجی تھی۔ کل ان کا ایک خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا۔ بہت تعریف لکھتے تھے۔'' (بنام تفتہ ۲۷ نومبر ۱۸۵۸ء۔)[33]

''پرسوں اور کل دو ملاقاتیں جناب آرنلڈ صاحب بہادر سے ہوئیں۔ کیا کہوں کہ مجھ پر بے سابقہ معرفت کیا عنایت فرمائی۔ میں یہ جانتا ہوں کہ گویا مجھ کو مول لے لیا.....ایک دستنبو اور ایک پنج آہنگ اپنے

پاس سے ان کو نذر کر آیا ہوں۔" (بنام شیو نارائن آرام ۱۵ جنوری ۱۸۵۹ء۔)[34]

"سہ شنبہ دو مارچ کو بارہ بجے نواب لیفٹینٹ گورنر بہادر (لارڈ منٹگمری) نے مجھ کو بلایا۔ خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ لارڈ صاحب بہادر (گورنر جنرل) کے ہاں کا دربار اور خلعت بھی بحال ہے۔ انبالہ جاؤ گے تو دربار اور خلعت پالو گے۔" (بنام غلام غوث بے خبر ۱۸۶۳ء۔)[35]

حوالہ جات

2-1 سبد چین، مرزا اسداللہ خان غالب۔ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء

3- تفریح دہلی، نواب قزلباش وثیقہ دار شاہی، طبع فیض آباد ۱۹۳۶ء۔

Twilight of Mughals. Percival Spear. 5-4

Delhi its Monuments and History. Spears.

Delhi Throughs Ages. R.E.Frykenbergh -6

7- آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان، ڈاکٹر مبارک علی۔

Twilight of Mughals Spear. -8

9- آخری مغلیہ کا ہندوستان، ڈاکٹر مبارک علی۔

Twilight of Mughals + Delhi Through Ages. -10

11- سیر المنازل۔ مرزا سنگین بیگ۔

Twilight of Mughals. Spear. -13-12

15-14- آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان از ڈاکٹر مبارک علی۔

16- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔

18-17- آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان از ڈاکٹر مبارک علی۔

19- سفر نامہ ہند از پروفیسر محمد اسلم۔ ریاض برادرز لاہور۔

20- مجموعہ نثر غالب مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی۔

21- آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان از ڈاکٹر مبارک علی۔

Twilight of Mughals. Spear. -24-23-22

25-26-27- برطانوی راج' ایک تجزیہ از ڈاکٹر مبارک علی' فکشن ہاؤس لاہور۔
28- کمپنی کی حکومت از باری علیگ۔
29-30- برطانوی راج' ایک تجزیہ از ڈاکٹر مبارک علی۔
31- نامہ ہائی فارسی غالب' ترجمہ پرتو روہیلہ۔
32- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
33-34-35- ایضاً

دلّی کے مصور

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے
(غالب)

غالب اکتوبر ۱۸۵۸ء کو شیونارائن آرام کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اجڑا ہوا شہر، نہ آدمی نہ آدم زاد، ہاں مگر وہ ایک مصوروں کو آبادی کا حکم ہو گیا ہے، وہ رہتے ہیں، سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے لٹنے کے آباد ہوئے۔ تصویریں بھی ان کے گھروں سے لٹ گئیں، جو کچھ رہیں، وہ صاحبانِ انگریز نے بڑی خواہش سے خرید لیں۔''[1]

تخت طاؤس نے ہمیشہ، دیگر فنکاروں کی طرح مصوروں کی حوصلہ افزائی، قدر دانی اور سرپرستی کی۔ بلکہ تخت طاؤس کے وجود میں آنے سے قبل اعلیٰ حضرت نصیرالدین ہمایوں ایران میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد فاتحانہ دلّی میں داخل ہوئے تو ان کے جلو میں دیگر باکمال اہل ایران کے ساتھ ساتھ ایرانی مصور بھی تھے۔ فن مصوری کو وہ اس عروج پر لے گئے کہ یہ مغل آرٹ کہلایا۔ آرٹ سے دلچسپی رکھنے والا کون ایسا انسان ہوگا جو مغل منی ایچرز کا معترف نہ ہو۔

بادشاہت کمزور ہوئی، طوائف الملوکی در آئی، تخت طاؤس نادر شاہ لے گیا۔ رنگ محل کی چاندی کی چھت جاٹ اتار کر لے گئے۔ روہیلوں، مرہٹوں اور سندھیا نے دفینوں کی تلاش میں محلات کے فرش کھود ڈالے۔ فنکاروں کی قدر دانی میں بھی کچھ عرصے کے لیے کمی ہوئی..... لیکن پھر ان فن کدوں کو یورپ کے صنم کدوں سے پاسبان مل گئے۔ ۱۸۰۳ء میں جو انگریز لارڈ لیک کے ساتھ آئے ان میں متعدد ایسے تھے جو کشتگانِ طلسم مشرق بلکہ متاثرین سحر دہلی تھے۔ انہوں نے ان فنکاروں کی سرپرستی کی۔ پاؤنڈوں سے بھری جیبوں والے گوروں نے دہلی کے فن پاروں کے لیے ایک نفع بخش منڈی فراہم کی اور پھر امن کا ایک طویل دور بھی آیا جو پوری نصف صدی پر محیط تھا۔ فنون کی نشوونما میں امن کے کردار کا کون منکر ہو سکتا ہے۔

بادشاہ سلامت کی سلطنت دلّی تا پالم بلکہ بعدازاں تو محض قلعہ معلّٰی تک محدود رہ گئی۔ شاہوں کے اخراجات شاہانہ تھے لیکن وظیفہ بھی کچھ اتنا گدایانہ نہ تھا۔ محلات کی مرمت اور زیبائش و آرائش تو ہو ہی سکتی تھی چنانچہ ہنرمندوں اور فنکاروں کو پھر ان کا حصہ ملنے لگا۔

برطانوی ریذیڈنٹ نے تمام مصروفیات (اور اختیارات بھی) خود سنبھال کر شاہوں کے بوجھ ہلکے کردیے تھے اور انہیں بیشتر سردردیوں اور جھنجھٹوں سے آزاد کر دیا تھا۔ چنانچہ شعر و ادب، موسیقی اور مصوری میں ان کی دلچسپیاں بڑھیں۔ نتیجتاً ان فنون کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ فصیلِ شہر کے اندر سول حکام کی کوٹھیاں تعمیر ہونے لگی تھیں اور پہاڑی پر فوجی حکام کی۔

کوٹھیوں کی آرائش کے لیے مصوروں کی ضرورت تھی۔ دہلی کے مصور اب انگریز سرپرستوں کے لیے کام کرنے لگے۔ انگریز اشرافیہ کے انگلستان میں واقع گھروں کی آرائش کے لیے بھی اس طلسماتی دنیا کی تصاویر جانے لگیں۔ پسندیدہ موضوعات قلعہ سرخ، مسجد جامع، قطب مینار، ہمایوں اور صفدر جنگ کے مقبرے تھے۔ مصوروں نے جلد اپنے سرپرستوں کے مزاج سے آشنائی حاصل کرلی۔ ان کی تصاویر میں برطانوی ڈرائنگ کی جھلک بھی دکھائی دی جانے لگی ہے۔[2]

عمارات ہموار پس منظر کے ساتھ سیاہ حاشیے میں دکھائی دی جانے لگیں۔ انگریزی کاغذ کے بڑے تختے، قلم اور سیاہیاں، سنہری، سرخ اور سبز رنگ..... لیکن ہندوستانی فنکاروں نے اپنی جزئیات ظاہر کرنے کی روایت برقرار رکھی جس سے حیران کن شاہکار معرض وجود میں آئے جنہیں دیکھ کر یورپی شائقین انگشت بدنداں رہ گئے۔

مقامی عمارات اور یادگاروں کی تصاویر کی طلب میں اضافہ ہوا تو قدم رسول، مقبول زینت المساجد، قدسیہ باغ، دریا گنج، مقبرہ اعظم خاں کوکہ اور فیروز شاہ کے کوٹلہ کو بھی مصور کیا جانے لگا۔[3] دلّی میں محض عمارات ہی تو نہ تھیں۔ یہاں تو بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک غیر معمولی لوگوں کی ایک دلکش ہوئی کہکشاں تھی۔ بادشاہوں کی پورٹریس کی دہلی کے یورپی باشندوں، یہاں تک کہ یورپ میں بھی مانگ تھی۔ سب سے زیادہ مقبول اکبر اور ابوظفر بہادر شاہ ثانی تھے۔ اکبر تو خیر اکبر اعظم تھے لیکن بہادر شاہ ظفر کیوں؟ جواب ملتا ہے کہ ایک فلسفی اور شاعر بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک باوقار اور مہربان بزرگ بھی تھے۔ A Good Kind Old man۔ مقبول ترین تصویر دیوانِ عام میں تخت پر تشریف فرما۔ بہادر شاہ ظفر کی تھی جن کے دونوں طرف شہزادے اور وزراء و امراء دست بستہ کھڑے ہیں اور پیچھے کھڑے خدام بال طاؤس سے مگس رانی کر رہے ہیں۔[4]

ان کی بہت سی تصاویر میں برطانوی ریذیڈنٹ ڈیوڈ آکٹرلونی، آرچی بالڈ سٹین اور چارلس مٹکاف بھی موجود ہیں۔ ہاتھی کے ہودے میں براجمان، پالکی نشین اور گھوڑے پر سوار ابوظفر کی تصاویر بھی بہت مقبول

تھیں۔ برطانوی اشرافیہ کے گھروں میں شاہ کی ایک تصویر کی موجودگی تو لازمی خیال کی جاتی تھی جس میں شاہ دو شہزادوں کے ساتھ دیوان خاص میں تشریف فرما ہیں اور عقب میں سنگ مرمر میں کھدا میزانِ عدل ابھرا ہوا نظر آ رہا ہے۔

دہلی کی رقاصاؤں کی تصاویر بھی گوروں میں خاصی مقبول تھیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی آفیسر جو ہندوستان اور ہندوستانی روایات سے محبت کرتے تھے اور ہندوستانی اشرافیہ کا طرز زندگی اختیار کرتے تھے' حقہ پیتے تھے' حرم رکھتے تھے اور جو "نباب" کہلاتے تھے۔ انہوں نے مصوروں کو باقاعدہ ملازم رکھا ہوا تھا۔ مظہر علی خان' غلام علی خان' غلام مرتضیٰ خان' جیون رام اور لعل جی چند ایسے مصور تھے جو یورپین حکام کی خدمت میں رہتے تھے اور صرف انہی کے لیے کام کرتے تھے۔[5]

ڈیوڈ آکٹرلونی المعروف اختر لونی ۱۸۰۳ء سے ۱۸۲۵ء تک دلی میں رہا۔ جیون رام اس کا ذاتی مصور تھا۔ ۱۸۳۱ء میں تاریخ نگار ایملی ایڈن جیون رام سے ملیں اور اس کے کام کو سراہا۔ جیون رام نے آکٹرلونی کی ہندوستانی لباس میں ملبوس حقہ پیتے اور گاؤ تکیے سے پشت لگائے رقص دیکھتے ہوئے کئی تصاویر بنائیں۔[6]

ولیم فریزر ۱۸۰۵ء میں دلی آیا' اگرچہ وہ مختلف مہمات پر باہر جاتا رہا لیکن وہ دلی لوٹ آتا تھا اور یہیں ۱۸۳۵ء میں وہ قتل ہو کر دفن ہوا۔ فریزر دلی کے مصوروں کا ایک بڑا سرپرست تھا۔ فیض علی خان اس کے لیے کام کرتا تھا۔ ولیم فریزر کی ایک ایسی تصویر جس میں وہ ایک انتہائی حسین جاٹ لڑکی اور ایک بچے کے ساتھ موجود ہے لندن کی اشرافیہ میں بہت مقبول ہوئی۔[7]

کرنل جیمز اسکنر کے پاس تصاویر کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ وہ اپنے مہمانوں کو دلی کی رقاصاؤں کی تصاویر بطور تحفہ دیا کرتے تھے۔ غلام علی خان جو مانی و بہزاد کے ہمسر سمجھے جاتے تھے' کرنل اسکنر کے لیے کام کرتے تھے۔[8]

سرٹامس تھیوفیلس مٹکاف نے جمنا کے کنارے مٹکاف ہاؤس تعمیر کرایا۔ قطب صاحب میں ان کا دلکشا باغ تھا۔ یورپی لوگ اسے یورپی شاہ جہان کہتے تھے۔ مظہر علی خان اس کے ملازم تھے۔ مٹکاف محل کے کمرے اور ہال نیز دلکشا باغ کے اندر واقع محل سرا کے کمرے انتہائی خوبصورت اور نایاب تصاویر سے مزین تھے۔[9]

دلی کے مصوروں کا یہ زریں دور ۱۸۵۷ء تک چلا۔ پھر نہ وہ دلی کی اوراق مصور گلیاں رہیں نہ مصور اور نہ ان کے سرپرست۔ مصوری کے سرپرستوں کے محل لٹ گئے۔ تصاویر نذر آتش ہو گئیں۔ ان کے بعد جو حکام آئے وہ "نباب" نہ تھے "جنٹلمین" تھے۔ وہ دلی سے پیار نہ کرتے تھے بلکہ اہل دلی کے خون کے پیاسے تھے۔ ان نئے آنے والوں میں کوئی اسکنر' کوئی مٹکاف' کوئی فریزر نہ تھا۔ وہ سب ہڈسن جیسی ذہنیت کے مالک تھے' لیکن بہر حال مرتبے اور امارت کی نشانی کے طور پر وہ مشرقی مصوروں کی تصاویر کے خواہاں ضرور تھے' چنانچہ

سب سے پہلے اجڑی دتی میں مصوروں کی آبادی کا حکم ہوا..... آیئے، ہم ذرا لوٹ کر اپنے غالب کی طرف چلتے ہیں۔ منشی شیونرائن آرام کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ایک مصور کے پاس ایک تصویر ہے۔ (بادشاہ کی) دو تیس روپے سے کم کو نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ تین تین اشرفیوں کو میں نے صاحب لوگوں کے ہاتھ بیچی ہیں۔ تم کو دو اشرفی کی دوں گا' ہاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی نقل کاغذ پر اتار دے۔ اس کے بھی بیس روپے مانگتا ہے۔ خدا جانے اچھی ہو یا نہ ہو۔'' (۲۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء)[10]

وفات سے دو برس قبل نواب میر غلام بابا خاں کو لکھتے ہیں:

''ایک میرے دوست مصور خاکسار کا خاکہ اتار در بار کا نقشہ اتارنے کو اکبر آباد گئے وہ آ جائیں تو شغل تصویر تمام ہو کر آپ کے پاس پہنچ جائے۔'' مارچ ۱۸۶۷ء[11]

۱۱ جون ۱۸۶۷ء کو میاں داد خان سیاح کے نام ایک خط میں رقم طراز ہیں:

''تصویر کا یہ حال ہے کہ ایک مصور میرے دوست میرے چہرے کی تصویر اتار کر لے گئے' اس کو تین مہینے ہوئے آج تک بدن کا نقشہ کھینچ کو نہیں آئے۔ میں نے گوارا کر لیا آئینے پر نقشہ اتروانا بھی۔ ایک دوست اس کا کام کرتے ہیں' میں نے ان سے کہا بھائی میری شبیہ کھینچ دو۔ وعدہ کیا تھا کہ کل نہیں تو پرسوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا۔ شوال' ذی قعدہ' ذوالحجۃ' محرم' یہ پانچواں مہینہ ہے۔ آج تک نہیں آئے۔''[12]

اور اب تو گورے مصور اور فوٹو گرافر بھی دتی میں آ گئے تھے۔ غالب ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء کو ایک خط میں میاں داد خان سیاح کو لکھتے ہیں:

''تصویر کھینچنے والا جو ہندوستانی ایک دوست تھا شہر سے چلا گیا' ایک انگریز ہے وہ کھینچتا ہے۔ مجھ میں استادم کہاں کہ کوٹھے پر سے اتروں' پالکی میں بیٹھوں اور اس کے گھر جاؤں اور گھنٹہ دو گھنٹہ کرسی پر بیٹھوں اور تصویر کھنچوا کر جیتا جاگتا اپنے گھر پھر آؤں۔''[13]

غالب اپنے خطوط میں دتی کے دو ہنر مند فنکاروں کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک مہر ساز اور ایک خوش نویس۔

۲۹ جون ۱۸۶۵ء کو انوار الدولہ شفق کے نام خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''آج شہر میں بدرالدین علی خان کا نظیر نہیں۔ بس مہر اور کون کھود سکے گا؟''

۲ اپریل ۱۸۶۱ء کو یوسف میرزا کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''بخشی صاحبان کا حال یہ ہے کہ آغا سلطان پنجاب کو گئے..... صفدر سلطان اور یوسف سلطان وہیں ہیں..... میر جلال الدین خوش نویس ہیں اور وہ دونوں بھائی باہم رہتے ہیں۔''[14]

کاتب تو دربار کے ساتھ سینکڑوں وابستہ تھے۔ خواجہ ناصر نذیر فراق لکھتے ہیں:

"لال قلعہ کے بادشاہوں کے ہاں یہ آئین تھا کہ ایک استاد خوشنویس کے ہزار پانچ سو کم عمر غلام شاگرد کروائے جاتے تھے اور وہ مشق کرتے کرتے خوشنویسی میں کامل ہو جاتے تھے اور سب کا خط ایسا ملتا جلتا ہوتا تھا کہ زید بکر کے لکھے میں کوئی فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔ جب حضور والا چاہتے تھے سو جزو کی کتاب کا شیرازہ توڑ کر سو غلاموں کو ایک ایک جزو بانٹ دیتے اور فرما دیتے تھے کہ ہر کاتب اپنا اپنا جزو غروب آفتاب سے پہلے لکھ کر پورا کرلے اور اس تدبیر سے سو جزو کی کتاب ایک دن میں لکھی جاتی تھی پھر ساری کتاب ایک قلم ایک سیاہی کی۔ ایک کاتب کی لکھی معلوم ہوتی تھی۔ اسی طرح جدول کش، نقاش مصور بھی ساتھ ساتھ سینکڑوں ہزاروں ہوتے تھے اور ایک ہی دن میں وہ بھی کتاب کو بنا سنوار کر دلہن بنا دیتے تھے۔[15]

حوالہ جات

1- خطوطِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر۔
2- Twilight of Mughals. Percival Spear.
3- ایضاً
4- ایضاً
5- ایضاً
6تا9- Delhi Through Ages, R.E.Frykenbergh.
10- خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
11تا13 خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
14- خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
15- لال قلعہ کی ایک جھلک فراق دہلوی۔

دلّی کے موسیقار اور مطرب

میں نے سات شعر امیر خسرو کی غزل پر لکھ کر ایک مطرب کو دیے۔ وہ مجلسوں میں گانے لگا۔ اکبر آباد لکھنؤ تک مشہور ہے وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے

از جسم بجاں نقاب تا کے
ایک گنج دریں خراب تا کے

(غالب بنام غلام غوث بے خبر ۱۸۶۰ء)[1]

''تم نے تن تن کا ذکر کیوں کیا؟ میں نے اس باب میں کچھ نہ لکھا تھا۔ ''تن تن اور تن تننا اصوات ہیں تار کے ہندی اور فارسی میں مشترک۔'' ''غالب بنام تفتہ''[2]

قلعہ معلیٰ نے جہاں دیگر فنون کی سرپرستی کی وہاں فنِ موسیقی کے فروغ میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جس عہد کی جھلک ہم دکھا رہے ہیں اس عہد میں تو قلعہ معلیٰ ایک مرکزِ ثقافت ہی بن کر رہ گیا تھا۔ قلعہ میں لاتعداد جشن منائے جاتے۔ بعض صرف خواص کے لیے ہوتے تو بعض میں عوام کو بھی شرکت کا اذنِ عام تھا۔ موسیقی ہر جشن کے لیے لازم تھی بلکہ جشنوں پر ہی موقوف کیوں روزمرہ کا حصہ تھی۔ منشی فیض الدین لکھتے ہیں:

''رات ہوئی، مشعلچیوں نے روشنی کی تیاری کی۔ جھاڑ، فانوس، فتیلہ سوز، ایک شاخی، دو شاخی، سہ شاخی، پنج شاخی، پنجیاں، مشعل، لالٹینیں روشن ہوئیں۔ چار گھڑی رات آئی۔ وہ روشن چوکی کا گشت طبلہ نفیری بجتی ہوئی، مشعل کے ساتھ دیوانِ عام، دیوانِ خاص کے ساتھ ہو کر جھروکوں کے نیچے آیا، عشاء کا وقت آیا نماز وظیفے سے فارغ ہو کر ناچ گانے کی تیاری ہوئی۔ تان رس خان چوکی کے طائفے حاضر ہوئے۔ ناچ ہونے لگا۔ ایلو سازندے قنات کے پیچھے کھڑے طبلہ سارنگی تال کی جوڑی بجا رہے ہیں۔ ناچنے والی بادشاہ کے سامنے کھڑی ناچ رہی ہے۔ وہ ڈیڑھ پہر رات کی توپ چلی دھائیں پھر اس طرح خاصے کی تیاری ہوئی خاصہ کھایا......''[3]

منشی صاحب نے تان رس خان کا ذکر کیا ہے۔ ان کا نام قطب بخش تھا۔ آبا و اجداد محمد شاہ کے عہد سے دربار سے وابستہ چلے آتے تھے۔ شاہ عالم ثانی کے عہد میں پیدا ہوئے۔ اکبر شاہ ثانی تخت پہ بیٹھے تو ان کی

عمر پانچ سال تھی۔ نوعمری میں ہی شہرت ہوگئی۔ جب بہادر شاہ ظفر بادشاہ ہوئے تو قطب بخش استاد مشہور ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے دربار میں بلالیا۔ تان رس خان کا خطاب ملا۔ قلعہ معلّیٰ سے وابستہ گائیکاؤں کی تعلیم کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ اٹھارہ گلوکاراؤں کو تان رس خان سے شرف تلمذ تھا جن میں سے ہر ایک لاجواب گانے والی تھی۔ پیاری بائی' چندر بائی' مصائب بائی' سلطان بائی زیادہ مشہور ہوئیں۔[4]

غدر کے بعد تان رس خان نے الوۓ جے پور اور جودھپور میں ملازمتیں کیں۔ پھر حیدر آباد چلے گئے اور نظام میر محبوب علی خان کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ دو بیٹوں امراؤ خان اور غلام غوث خان نے بھی شہرت پائی۔ حیدر آباد میں ہی انتقال ہوا اور شاہ خاموش صاحب کی درگاہ کے قرب و جوار میں دفن ہوئے۔

کہتے ہیں ایک دن تان رس خان نظام کے حضور میں یہ ٹھمری گا رہے تھے "رات بالم تم ہم سے لڑے تھے' نظام پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے' استاد کی تانوں نے وہ سماں باندھا کہ بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے "واہ تان رس واہ... واہ تان رس واہ۔" یہ سن کر استاد لپک کر اٹھے اور چٹ پٹ ہنوز نظام کی بلائیں لے لیں۔ یہ آداب کے خلاف تھا۔ سرد و گرم چشیدہ استاد حضور کی گرم نگاہی کو بھانپ گئے اور دست بستہ بولے "قربان جاؤں مدت سے آرزو تھی کہ کسی مسلمان بادشاہ کی بلائیں لوں' ان ہاتھوں نے یا تو حضور بہادر شاہ بادشاہ کی بلائیں لیں یا آج آپ کی۔ یہ سن کر میر محبوب علی خان مسکرا دیے۔[5]

دربار سے وابستہ ایک گلوکارہ ٹڑھ موی خانم کے نام سے مشہور تھیں۔ یہ ایک خاص شاہی طائفے سے وابستہ تھیں جو بادشاہ کی تخلیق کردہ ٹھمریاں اور غزلیں گایا کرتا تھا۔ ٹڑھ موی خانم بے حد ذہین تھیں۔ فن موسیقی میں ماہر تھیں اور اس طائفے کی سربراہ تھیں۔ کہتے ہیں کہ حافظہ اس قدر بلا تھا کہ بادشاہ نے ایک بار غزل سنائی اور ادھر انہیں یاد ہو گئی۔ وجہ تسمیہ ان کی یہ ہے کہ پان میں چھالیہ بہت کھاتی تھیں اور اس کو ایک طرف کلے میں دبا لیتی تھیں۔ اس وجہ سے ایک طرف کا کلہ پھولا ہوا اور منہ ٹیڑھا معلوم ہوتا تھا چنانچہ ٹڑھ مونہی خانم کہلائیں اور یہ عرفیت اس قدر مشہور ہوئی کہ ان کا اصل نام لوگوں کو بھول گیا۔[6]

ایک اور بہت بڑے فن کار تھے بہرام خان۔ علم موسیقی میں مہارت کی وجہ سے نایک بہرام خان کہلاتے تھے۔ متعدد شہزادے بھی ان فن کاروں سے موسیقی کی تعلیم لیتے تھے۔ خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی نے بہادر شاہ کے ایک پوتے مرزا کالے کا ذکر کیا ہے جو غدر کے بعد لال قلعہ سے ستار ہاتھ میں لے کر اور گیروا لباس پہن کر نکل گئے تھے۔ اسی بھیس میں مدتوں بھٹکتے رہے پھر کسی ریاست کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ ایک روز والی کے سامنے اپنا ہنر دکھا رہے تھے۔ دربار میں بہرام خان اور ستار نواز میاں امرت سین بھی موجود تھے۔ ان کی ایک بینڈ پر جب پوری بزم واہ واہ کر اٹھی تو بہرام خان بولے "صاحب عالم آپ کی اس تان کی تعریف ہو نہیں سکتی۔ اگر آپ لال قلعہ میں پیدا نہ ہوتے اور لال پردہ کی آڑ میں اس کام پر لاکھوں روپیہ خرچ نہ کرتے تو یہ لڑ گندھا اور راگ میں ڈوبی ہوئی کبھی آپ کی انگلیوں سے نہ نکلتی۔" والیٔ ریاست نے بہرام خان سے پوچھا

''صاحب عالم کون اور لال قلعہ اور لال پردہ کیسا؟'' بہرام خان نے اپنے ہاتھ اپنی پیشانی پر مار کر کہا'' ان داتا یہ گبھرو جبھسوت ملے اور گیروا کپڑے پہنے آپ کو ستار سنا رہے تھے دلّی کا بادشاہ زادہ اور بہادر شاہ ابوظفر کا قریبی رشتہ دار ہے۔ مرزا کالے ان کا لاڈلا نام ہے۔ میں نے انہیں بادشاہ سلامت کے پہلو میں مسند پر بیٹھا دیکھا تھا۔ لاکھوں روپیہ خرچ کر کے اس ہنر کو انہوں نے استادوں سے سیکھا تھا۔ دن رات لال پردہ میں بیٹھے اس کام کو کیا کرتے تھے۔'' بہرام خان کی اس گفتگو نے اہل محفل کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ دیر تک سناٹا رہا۔ والی نے خود اٹھ کر شہزادے کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور رونے لگا اور مسند پر بٹھا کر کہا یہ آپ کے بڑوں کی بخشی ہوئی گدی ہے۔ [7]

استاد بہرام خان ایک روز کسی راجہ کی محفل میں بیٹھے تھے جو بین بھی بجایا کرتا تھا۔ راجہ اپنی بین کاری کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ استاد برداشت نہ کر سکے اور بولے'' راجہ صاحب آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ بین کس لیے بنائی گئی ہے اور کس نے بنائی ہے۔''

راجہ بولے'' استاد آپ ہی جانتے ہوں گے کہ کیوں بنائی گئی۔''

بہرام خان نے کہا'' تو سنیے بادشاہوں کی محفلوں میں گویے گاتے تھے تو انہیں تھوکنے کی اجازت نہ تھی اور اگالدان نہ ملتا تھا اور گانے میں گویے کو تھوک بہت آتا ہے اس لیے گویے کی جان پر بن جاتی تھی اور دربار میں گانا دوبھر ہو جاتا تھا۔ ناچار عقل مند لوگوں نے یہ بین بنائی اور دو تھونبیاں اس میں کھلے منہ کی ایسی لگائیں جو اگالدان کا کام دیں اور محفل میں جو لوگ بین کار کے روبرو ہوں انہیں تھوکنے کی خبر نہ ہو۔

بین ذلیل چیز ہے۔ میں تین دن میں کتوں کو بین سکھا دیتا ہوں۔'' راجہ کو سخت غصہ آیا اس نے کہا '' مجھے یہ تماشا ضرور دکھائیے کہ آپ تین دن میں کتوں کو بین کیونکر سکھا دیتے ہیں۔'' استاد نے کہا'' سرکار شاستروں میں آیا ہے کہ مورکھ آدمی بیل اور گدھے اور کتے سے بدتر ہے آپ ایسا ہی ایک مورکھ آدمی ڈھونڈیے اور تین دن کے کھانے پینے کے بندوبست کے ساتھ پہرا لگا کر انہیں ایک مکان میں بند کر دیجیے اور تین دن بعد ہم استاد شاگردوں کو طلب فرمائیے اور جلا دکو بھی بلا لیجیے اور اگر میرا دعویٰ غلط ہو تو میرا سر کٹوا دیجیے۔ چنانچہ طویلے میں سے ایک احمق سائیس کو بہرام خان کے سپرد کیا گیا اور انہوں نے تین ہی دن میں اپنا دعویٰ سچ کر دکھایا۔ تب راجہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا'' آپ میرے نزدیک تانیک کیا کرشن کنہیا ہیں۔ [8]

غالب نے اپنی ایک غزل کے لیے سر بھی تجویز کیا ہے۔ نواب امین الدین احمد خان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

'' وکیل حاضر باش دربار اسداللّٰہی یعنی علائی مولائی نے اپنے موکل کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہو کر ایک اردو غزل لکھوائی۔ اگر پسند آئے تو مطرب کو سکھائی جائے جھنجھوٹی کے اونچے سروں میں راہ رکھوائی جائے۔ اگر جیتا رہا تو جاڑوں میں آ کر میں بھی سن لوں گا۔

میں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی
۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء[9]

اصواتِ موسیقی کے ساتھ ایک فارسی غزل بھی غالب نے لکھی ہے۔ اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

بلہ من عاشق ذاتم تنہ ناہا یاہو
ناظر حسن صفاتم تنہ تاہا یاہو
ظلمتِ کفر مبیں روشنی طبع نگر
چشمہ آب حیاتم تنہ ناہا یاہو
غالبم تشنۂ تکخاب' نہ ہچوں حافظ
مایل شاخ نباتم تنہ نا ہایا ہو[10]

حوالہ جات

1-2- خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
3- بزم آخر منشی فیض الدین اردو اکادمی۔
4-5-6- قلعہ معلّٰی کی جھلکیاں عرش تیموری۔
7-8- لال قلعہ کی ایک جھلک حکیم خواجہ ناصر نذیر فراق۔ دہلوی۔
9- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
10- سبد چین مرزا اسد اللہ خان غالب۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

خسخانہ و برفاب

سامانِ خورد خواب کہاں سے لاؤں آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن خسخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں
(دیوانِ غالب)

''میرن صاحب کو دعا پہنچے۔ بھائی میرن! اب وہ خس کا پردہ کھول ڈالا۔ صافیاں جھجھر پر لپیٹتا ہوں۔ دم بہ دم بھگوتا ہوں۔ وہ لو کہاں جو پردے سے لپٹ کر صافی کو لگے آ کر اور پانی کو ٹھنڈا کرے؟ وہ پانی جو میر مہدی اور تم اور حکیم جی پیا کیے ہو اب کہاں؟ برف پندرہ دن کی اور باقی ہے۔ آئندہ خدا رزاق ہے۔''
(بنام میرن صاحب)[1]

دلّی کا موسم اپریل کے آغاز سے گرم ہونا شروع ہوتا تھا اور جولائی کے شروع میں مون سون کے آغاز تک شدید گرم رہتا تھا۔ بارشوں کی آمد سے یہ کسی حد تک خوشگوار ہو جاتا تھا۔ صاحبانِ حیثیت اہلِ دلّی گرمی سے بچاؤ کے لیے گھروں میں تہہ خانے بنواتے تھے اور جو تہہ خانے نہ بنوا سکتے وہ خسخانے بنواتے تھے.....اور گرمی کا مقابلہ کرنے کے لیے برف تو ضروری تھی ہی۔

اکثر بڑے گھروں میں بڑے بڑے تہہ خانے ہوتے تھے۔ تہہ خانوں کا درجہ حرارت اوپر کے کمروں سے دس درجے کم رہتا تھا۔ میجر اسمتھ دلّی کی ایک حویلی کا ذکر کرتا ہے جہاں تہہ خانے میں ایک مکمل گھر تھا۔ متعدد کمرے، راہداریاں، غلام گردشیں، نشست گاہ، طعام گاہ وغیرہ۔ مشرقی رخ پر آسمان کی سمت کھلنے والے دریچے، روشنی اندر لاتے تھے اور ہوا کے رخ کھلنے والی کھڑکیاں راہداریوں میں ہوا کی آمد و رفت کو یقینی بناتی تھیں۔[2]

یہ تو خیر ایک بڑے گھر کا تہہ خانہ تھا۔ عام تہہ خانے روشنی اور ہوا سے محروم ہوتے تھے۔ عام آدمی کی رسائی میں تہہ خانے نہ تھے لیکن خسخانے تو وہ بنا ہی سکتے تھے۔ کمروں کے دروازوں یا کھڑکیوں پر ہوا کے رخ خس کی ٹٹیاں لگا دی جاتیں۔ خصوصاً بالائی منزلوں پر واقع کمروں پر اور پھر ان پر وقفے وقفے سے پانی چھڑکا

جاتا تھا۔ ان ٹٹیوں سے گزر کر آنے والی لُو موسم بہار کی ہوا کی مانند خوشگوار ہوتی تھی۔ لیکن اس میں ایک قباحت تھی کہ خس اور پانی کا بندوبست تو آپ کر سکتے ہیں لیکن ہوا آپ کی دسترس میں نہیں..... ابھی آپ نے پڑھا حضرت غالب فرما رہے تھے کہ وہ لُو کہاں.....؟

سو جب ہوا نہ چل رہی ہو یا حبس آلود موسم ہو تو حسخانہ بیکار اہل یورپ جو روشنی اور تازہ ہوا کو پسند کرتے تھے اور اہل ہند کی مانند' تاریک تہہ خانوں اور کونوں کھدروں کے عادی نہ تھے اور حسخانوں کو تہہ خانوں پر ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے اس مسئلے کا حل بھی نکال ہی لیا۔ اہل ہند کے قدیم دستی پنکھوں اور امراء کے گھروں میں چھتوں سے لٹکتے ہوئے موٹی چادروں کے پنکھوں کے اصول پر جنہیں نوکر مسلسل جھلاتے رہتے تھے' انہوں نے ہوا پیدا کرنے کے لیے ایک مشین بنالی۔ اگرچہ اسے بھی نوکر ہی گھماتے تھے' لیکن بھلا ہندوستان میں نوکروں کی کیا کمی تھی؟

ہوا پیدا کرنے والی اس مشین کو تریاق حدت Thermantidote کہا جاتا تھا۔[3]

ایک بڑا سا پہیہ جس کے اوپر ہوائی چکی کے پروں جیسے پر لگے ہوتے تھے اور ایک ہینڈل..... پہیے اور ہینڈل کے درمیان لکڑی کی گراریاں جیسے رہٹ کی ہوتی ہیں' انہیں چکنا کر دیا جاتا تھا' چنانچہ معمولی جسمانی طاقت سے بہت ساری ہوا پیدا کر لی جاتی تھی۔ اس ہوا کو لکڑی کے ایک پائپ سے گزار کر خس کی جالیوں پر ڈالا جاتا تھا۔ نوکر باری باری اسے گھماتے رہتے تھے۔

قلعہ معلّٰی کے وسیع و عریض سنگ مرمر کے تالابوں کی طرز پر امراء کے گھروں میں مختلف طول و عرض کے چھوٹے بڑے سنگ مرمر کے تالاب ہوا کرتے تھے۔ سنگ مرمر کے زینے تالاب کے فرش تک اترتے' پاس ہی کنواں ہوتا تھا' نوکر کنوئیں سے ڈول کھینچ کر تالاب کو بھر دیا کرتے تھے اور آقا مزے سے ڈبکیاں لگا کر گری کا علاج کرتے رہتے[4]۔ عام آدمی کو اس کام کے لیے جمنا جانا پڑتا یا پھر سلطان جی کی باؤلی پر۔

بارے کچھ ذکر برفاب کا ہو جائے..... مغل بادشاہ کشمیر یا گڑھوال سے ڈاک کے ذریعے برف منگوایا کرتے تھے[5] بعدازاں یہ مہنگا طریقہ ترک کر دیا گیا..... برف سرد موسم میں بنا کر محفوظ کی جانے لگی۔ اس کام کے لیے مٹی کے سانچے بنائے جاتے۔ دسمبر اور جنوری کی ان راتوں میں جب ہوا کہر آلود مرطوب ہوتی' ان سانچوں میں پانی بھر کر رات بھر کے لیے باہر رکھ دیا جاتا۔ یہ کام بڑے منظم طریقے پر کیا جاتا۔ برف سازی عموماً دہلی دروازے اور ترکمان دروازے کے درمیانی علاقے میں ہوتی تھی۔ جب موسم سازگار ہوتا تو آبدار ڈھول بجاتا جسے سن کر مزدوروں کی ٹولیاں مقررہ مقامات پر پہنچ جاتیں۔ سانچوں میں پانی بھر کر انہیں باہر کھلے میں رکھ دیا جاتا۔ برف ساز بشکوئی گاؤں کے باسی ہوتے تھے۔ صبح صبح گرم چادروں میں لپٹے مزدور سانچوں میں سے برف نکال لیتے۔ عموماً ہر سانچے میں ڈیڑھ انچ موٹی برف کی تہہ جمی ہوتی تھی۔ اب مرحلہ آتا برف کو محفوظ کرنے کا..... اسے گارے سے بنے کمروں میں کھدے گڑھوں میں سٹور کیا جاتا۔ ان کمروں کی چھتیں خس و

خاشاک کی موٹی تہوں سے بنی ہوتیں۔ گڑھوں میں برادہ کوئلے اور بھوسے کی تہیں کوٹ کر یکجان کی گئی سخت برف کے ارد گرد ہوتیں۔ موسم گرما میں ان گڑھوں سے ضرورت کے مطابق برف نکال لی جاتی۔ عموماً یہ ذخیرہ اگست کے آخر تک چل جاتا تھا[5]۔

برطانوی دور میں تو باقاعدہ برف ساز کمپنیاں بن گئی تھیں جو اپنے اراکین کو ان کے حصص کے حساب سے برف فراہم کرتیں۔ عام ہندوستانی کے لیے تو برف ایک عیاشی تھی لیکن یورپی لوگوں کے لیے یہ ایک ناگزیر چیز تھی۔

۱۸۵۷ء میں دہلی کے محاصرے کے دوران انگریزوں کو جو بڑی تکالیف پیش آئیں ان میں سے ایک برف کی عدم فراہمی تھی۔

۱۸۳۳ء میں امریکہ سے ایک جہاز برف لے کر ہندوستان آیا جس کا گوروں نے خوب جشن منایا اور جہاز کے کپتان کو گورنر جنرل نے شکریے کا خط لکھا۔ بعد ازاں جہازوں کے ذریعے بھی برف منگوائی جاتی رہی[6]۔

حوالہ جات

1- خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔

2- Twilight of Mughals Percival Spear.

3- ایضاً

4- ایضاً

5- ایضاً

6- ایضاً

قلعہ معلّٰی اور شہر دلّی کے مشاعرے

''مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا' قلعے میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرعۂ طرحی کو کیا کیجیے گا اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا؟ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے اب ہی نہ ہو اب کے ہو تو آیندہ نہ ہو۔'' (غالب بنام قاضی عبدالجلیل' جون ۱۸۵۴ء)[1]

کیا یہ غالب کی پیغمبرانہ بصیرت تھی کہ انہوں نے قلعے اور شہزادگانِ تیموریہ کے انجام کو بھانپ لیا تھا۔ یا پھر یہ وجہ ہو کہ اس وقت تک قلعے میں استاد شاہ حضرت ابراہیم ذوق کا طوطی بولتا تھا اور مشاعروں میں ذوق کے حواری غالب کے کلام کو گوش و زبان بند کر کے سنا کرتے تھے یا کبھی کبھار زبان کھولتے بھی تھے تو درازیٔ طعن کے لیے' بہرحال اس خط کے تحریر کرنے سے چار سال قبل غالب' نجم الدولہ' دبیر الملک' خان بہادر اور نظام جنگ بن چکے تھے۔ ''تاریخ تیمور'' یہ لکھنے پر مقرر کیے جا چکے تھے اور قلعہ معلّٰی ان کے لیے مقام ممنوعہ نہیں رہا تھا۔

خاندان مغلیہ کے بانی ظہیرالدین بابر خود ایک اچھے شاعر تھے۔ ان کے پوتے اکبر اعظم کے دربار کے شعری معرکے تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان کے بعد بھی قلعہ معلّٰی میں شعر و شاعری ہوتی رہی۔ کئی شہزادے بلکہ شہزادیاں بھی شعر و سخن کا مشغلہ رکھتی تھیں۔

لیکن قلعے میں وسیع پیانے پر شاعری کا چلن شمشیر و سناں رخصت ہونے کے بعد عام ہوا۔ تخت طاؤس نادر شاہ ایران لے جا چکا تھا۔ رباب کے ساتھ کلام موزوں قلعہ معلّٰی کی ''تقدیر'' بن چکا تھا۔

شاہ عالم ثانی آنکھوں سے معذور اور شاہی اختیارات سے محروم تھے۔ جہانبانی کے مسائل کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ معقول پنشن کمپنی بہادر کی طرف سے ملتی تھی۔ اب شعر و سخن ان کی مصروفیت بن گیا۔ آفتاب تخلص کرتے تھے۔ بینائی سے محروم یہ آفتاب اردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ پنجابی اور برج بھاشا میں بھی اشعار تاباں تخلیق کرتا تھا۔ تصوف میں بھی دلچسپی تھی[2]۔

روہیلوں کے مظالم کے بعد انگریزوں کے زیرسایہ اپنی اس پُرسکون زندگی سے خاصے مطمئن نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

شب دل آرام سے گزرتی ہے
صبح اٹھ جام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے

ان کے بزرگوں میں بھی ایک نابینا شہزادے گزرے ہیں جو شاعر تھے۔ شہزادہ کامران جنھیں ان کے اپنے بھائی اعلیٰ حضرت نصیرالدین ہمایوں نے بینائی سے محروم کیا تھا۔ انہوں نے اس سانحے کی تاریخ کہی ہے اور کیا خوب کہی ہے [3]:

زنرگس گلاب ارچہ ناتواں کشید
کشیدند از نرگس من گلاب
اگر از تو پر سند تاریخ من
بگو کورشد دیدۂ آفتاب

اگر چہ نرگس سے گلاب کشید نہیں کیا جا سکتا لیکن میری نرگس (آنکھوں) سے (عرق) گلاب کشید کیا گیا۔ اگر کوئی تم سے اس سانحے کی تاریخ پوچھے تو کہنا (جب) سورج کی آنکھیں اندھی ہوگئیں۔

ذکر ہو رہا تھا شاہ عالم آفتاب کا۔ بینائی کھونے سے پہلے اپنے جدامجد حضرت عالمگیر کی طرح کتابت قرآن مجید روزمرہ کے مشاغل میں شامل تھی۔ ۲۴۴ صفحات کا ایک دیوان چھوڑا۔ ایک مثنوی "مضمون اقدس" کے بھی مصنف ہیں۔ میرتقی میر' مرزا رفیع سودا' شاہ نصیر جیسے اساتذہ کے علاوہ کئی بڑے شعراء اعظم' انشاء' زار' ممنون' احسان' فراق وغیرہ ان کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے [4]۔ ۱۸۰۶ء میں انتقال ہوا۔

شاہ عالم کے فرزند اور جانشین ابوالنصیر معین الدین اکبر شاہ ثانی کی علمی استعداد جنت مکانی والد کے مقابلے میں کم تھی لیکن بہرحال اسی آفتاب کی شعاع تھے۔ شعاع تخلص کرتے تھے۔ شاہ نصیر' میر نظام الدین ممنون اور غالب علی خان سیدان کے دربار کے شاعر تھے [5]۔

نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

تجھ زلف کے عہدے سے یہ دل کیونکہ بر آوے
تاحشر نہ چھوٹے یہ بلا جس کے سر آوے
واں بار شعاع ذرہ نمط ہم کو کہاں ہے
دن رات جہاں سجدے کو شمس و قمر آوے

۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو انتقال ہوا۔

ان کے ولی عہد شہزادہ ظفر کو دادا اور والد دونوں سے زیادہ شعر و سخن میں دلچسپی تھی۔ دادا کے چہیتے تھے۔ ان کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ جب دادا کا انتقال ہوا تو ان کی عمر ۳۱ سال تھی۔ یوں بھی انہیں تمام علوم و فنون کی تربیت دی گئی تھی۔ شاہ نصیر سے استفادہ سخن کیا۔ دورِ ولی عہدی میں حضرت ذوق "خاقانی ہند" کا خطاب پا کر قلعہ میں آئے تو ان کے شاگرد ہو گئے۔ ولی عہد کی سخنوری سے شعر و سخن کی محفلوں میں جان پڑ گئی[6]۔ میر سودا کے شاگرد، انشاء اور مصحفی کے ہم سر و ہم عصر، صہبائی، آزردہ اور فضل حق خیر آبادی جیسی منتخب روزگار ہستیاں قلعے کی محفلوں میں شریک ہوتی تھیں۔ غالب، مومن اور شیفتہ ابھی منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہوا تو چوہتر سالہ شہزادے ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تخت نشین ہوئے۔ استاد ذوق ملک الشعراء قرار پائے۔

قلعہ معلی کے چند مشاعروں کی روداد غالب کی زبانی سنتے ہیں[7]۔

"جمعہ کا دن جب رات میں بدل گیا تو بزمِ سخن آراستہ کی گئی چونکہ میں نے مشاعرے کے لیے غزل نہیں کہی تھی، تہی دستی کی شرم کے باعث سرگرداں تھا، لیکن نواب ضیاء الدین خان نے ایزد تعالیٰ انہیں سلامت رکھے دو فرشتے میرے لیے مقرر کر دیے یعنی زین العابدین خان عارف اور غلام حسن خان محو۔ یہ دونوں ابرام پیشہ گماشتے میرے خلوت کدۂ تنہائی میں آئے اور ہاتھی لے کر آئے اور جیسا کہ شیر کو شکار کر کے ہاتھی کی پشت پر بار کر کے لے جاتے ہیں مجھے انجمن میں لے گئے..... میرے دوستوں میں سے زین العابدین خان عارف اور جواہر سنگھ جوہر نے زمین طرح میں دو غزلیں پڑھیں اور دلوں پہ اپنی نغز گوئی کا نقش بٹھا دیا۔ میں نے وہ غزل پڑھی جو اس دن کہی تھی۔

صبح شد خیز کہ روداد اثر بنمایم
چہرہ آغشتہ بہ خوں ناب جگر بنمایم

(بنام مصطفیٰ خان شیفتہ ۱۸۴۳ء فارسی سے ترجمہ تنویر احمد علوی)

"کل کہ ستارۂ ناہید کا دن تھا (بدھ) بعد شام میں حضرت آزردہ کی بزم میں باریاب ہوا۔ اس سے پیشتر کہ حرف مدعا میری زبان پر آتا میں نے رنجوری کے آثار کو اپنے مخدوم کی پیشانی پر آشکار پایا۔ نزلہ زکام کی شکایت تھی اور اس کا اظہار یوں ہوا تھا کہ کئی راتیں انہوں نے جاگ کر گزاری ہیں۔ مختصر یہ کہ مشاعرے میں تشریف نہیں لے گئے اور مجھے جانے کی رخصت دی۔ میں نے مشاعرے میں ریختہ گویوں کا مجمع دیکھا۔ لمبی لمبی غزلیں ان لوگوں نے پڑھیں..... غزل خوانی کے سلسلے میں جب مجھ تک نوبت پہنچی تو میں نے "ملک نہ خواست فلک نہ خواست" زمین میں کہی ہوئی اپنی غزل سنائی۔ اس کے بعد طرح پر انشا کی ہوئی فارسی غزل پڑھی[8]"۔

(بنام شیفتہ ۱۸۴۳ء فارسی سے ترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

''جمعہ کا دن تھا جب بزمِ سخن کی نوید سامعہ افروز ہوئی۔ شام کے وقت ہی دو مبارک فرشتے سے آئے اور مجھے اپنے ساتھ اس انجمن میں لے گئے۔ میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی کی طبیعت ناساز تھی، اس لیے نہیں آ سکے۔ حضرت آزردہ کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا گیا۔ اگر چہ دیر سے آئے لیکن ان کی آمد نے میرے دل کو صفا اور میری زبان کو نوا بخشی۔ اس بندۂ عاجز کو ''گریستن'' والی زمین میں قصیدہ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس ورق کو ناپسندیدہ متاع کی طرح واپس لے جاؤں اور ریختہ گویوں کو دردِ سر میں مبتلا نہ کروں۔ حضرت آزردہ کے آنے سے میرا دل بڑھ گیا اور میری زباں کو زمزمہ سنجی کی اجازت مل گئی۔ سحابی بھی بن بلائے وہاں حاضر تھا اور اس زمین ''گریستن'' میں اس نے بھی ایک غزل لکھی تھی جب میرے قصیدے کو سنا تو شرمندہ ہوا اور اپنی کہی ہوئی غزل کے چند اشعار سنا کر واپس لوٹ گیا۔''[9]

(بنام شیفتہ ۲۶ مئی ۱۸۴۲ء)

''یہ بات نزدیکوں کے واسطے باعث مسرت اور دور والوں کے لیے یک گونہ بشارت ہے کہ بادشاہ سپہر پناہ نے فرمان جاری کیا اور ناظر بارگاہ نے سخن وروں کو ایوان نظارت میں اس امر کی اطلاع دی کہ جمعہ کے دن ماہ فروری کی پچیس تاریخ کو اس خجستہ نشیمن میں آئیں اور جام سخن میں سے ایک دوسرے کے ساتھ بادہ پیائی کریں۔ شہزادگان بابریہ کی ایک جماعت اور آزادگان شہر میں سے کچھ اشخاص جمع ہوئے۔

سب سے پہلے سلطان الشعراء حضرت ابراہیم ذوقؔ نے حضرت والا کی غزل اس خوش الحانی کے ساتھ پڑھی کہ زہرہ جو مغنیہ فلک ہے آسمان سے نیچے اتر آئی۔ بعد ازاں شہزادہ یوسف دیدار ہمایوں آثار مرزا خضر سلطان بہادر نے اس طرح تازہ میں اپنی غزل پیش کی گویا اپنے اشعار گوہر نثار کی صورت میں بساط بزم پرستاروں کی بارش کر دی۔ اس کے بعد میرزا حیدر شکوہؔ، مرزا نور الدین اور میرزا عالی بخت نے کہ عالیؔ تخلص کرتے ہیں، ساز سخن چھیڑا اور نغمات شعر کو بلند آہنگ کیا۔

غالب آشفتہ نوا نے کہ مرزا عالی بخت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اپنی طرف سے دس شعر اس بزمِ سخن میں پیش کیے۔ محوی نامی ایک امرد نے کہ خم کدۂ صہبائی کے مے نوشوں میں ہے، اپنی صدائے طفلانہ کے ساتھ اہل محفل کو متوجہ کیا۔ مرزا حاجی شہرت نے کم و بیش ستر شعروں پر مشتمل اپنی غزل طرح میں پڑھی اور سامعہ اہل انجمن کو اپنا یہ شاعرانہ تحفہ پیش کیا۔ میں آب گزاری کا بہانہ کر کے محفل سخن سے باہر آیا اور اپنے غم کدے کی راہ لی۔ دکانوں کے در کھلے ہوئے تھے اور چراغ روشن تھے۔ ابھی یہ کہیے نصف شب کا وقت نہیں گزرا تھا۔ میں نے بوریائے بے ریائی پر اپنی محفل سجالی۔ دو چار جام چلے اور بادۂ ناب کی جرعہ کشی کی۔ بعد صبح پھر ارک ہمایوں (قلعہ) میں گیا۔ چاروں مغل شہزادوں نے جن کے نام پہلے آ چکے ہیں، زمزمہ سنجانہ کو تازہ کیا۔ میں بھی دوبارہ غزل سرا ہوا۔''[10]

(بنام میر مہدی مجروح ترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

شاہ نصیر کے ہاں ہر ماہ میں دو بار مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔

راقم الدولہ ظہیر دہلوی نے داستان غدر میں ایک محفل مشاعرہ کا ذکر کیا ہے جس کا اہتمام حافظ قطب الدین مشیر تلمیذ شاہ نصیر نے شاہ صاحب کے مکان پر کیا تھا۔ اس میں دیگر نامور شعراء کے علاوہ خاقانی ہند ذوق اور نواب مرزا خان داغ بھی شریک محفل تھے۔ ظہیر دہلوی نے بھی اپنی غزل سنائی۔ اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی۔ اغلباً یہ محفل ۱۸۴۹ء میں ہوئی تھی [11]۔

شہر میں مختلف سخن پروروں کے ذاتی مکانوں کے علاوہ دہلی کالج میں بھی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ مفتی صدرالدین آزردہ اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے ہاں ہر ہفتے باری باری مشاعرہ ہوتا تھا جس میں امام بخش صہبائی، عبداللہ علوی، غالب، ذوق، احسان، تسکین، حکیم آغا جان عیش اور خود شیفتہ و آزردہ شریک ہوا کرتے تھے۔ [12]

حوالہ جات

1- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
2- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز
3- تاریخ سندھ از اعجاز الحق قدوسی۔
4- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز، تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ۔
5- تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ۔
6- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔
7- پنج آہنگ۔ مرزا اسداللہ خان غالب۔ ترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔
8 تا 11 ایضاً۔
12- اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ از ڈاکٹر سنبل نگار

شہزادہ جواں بخت کی شادی اور ایک ادبی معرکہ

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
(غالب)

''حضور انور نے نواب احمد قلی خان کی صاحبزادی کو ساتھ خطاب زینت محل کے ممتاز کیا اور پانچ سو روپے تنخواہ بیگم صاحبہ موصوفہ کی اور پانچ سو تنخواہ ان کے لواحقین کی مقرر کی۔ سات لاکھ روپے مہر باندھا۔''[1]
(دہلی اردو اخبار ۲۲ نومبر ۱۸۴۰ء)

اس شادی کے وقت بہادر شاہ ظفر کی عمر ۶۵ سال جبکہ زینت محل بیگم کی ۱۹ سال تھی۔ بادشاہ سلامت زینت محل پر بے حد فریفتہ تھے۔ ان کے لیے دلّی کے بازار لال کنواں میں ایک شاندار حویلی تعمیر کرائی گئی۔ ایک بار آپ مسلسل بارہ روز تک نواب زینت محل بیگم کی حویلی میں پڑے رہے اور تمام مصروفیات روزمرہ کی ترک کر دیں۔ ایک اخبار نے تو طنزیہ لکھا کہ بیگم صاحبہ موصوفہ کی حویلی کے خاکروب نے تھانے میں رپٹ درج کرائی ہے کہ بارہ روز سے بادشاہ دہلی کا قیام بیگم زینت محل کی حویلی میں ہے خدا را ان کو لال قلعہ واپس لے جایا جائے۔[2]

(خلاصۃ اخبار ۲۰ اپریل ۱۸۴۹ء)

اُن ہی بیگم زینت محل کے بطن سے ۱۸۴۱ء میں شہزادہ جواں بخت نے جنم لیا۔ کمسن شہزادے ایک بار جس تزک و احتشام کے ساتھ پانی پت تشریف لے گئے اس بارے میں بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے ۱۰ اکتوبر ۱۸۴۵ء میں تحریر ہے:

''مرزا جواں بخت بہادر شہزادۂ خورد سال نے دستار زیب سر فرما کر اور طرہ مقیش دوشالہ شالی رومال، قبائے کمخواب، سپر اور شمشیر، سہ رقم جواہر خلعت حاصل کر کے اور چار پہرہ اور بیس سوار دو ہاتھی سواری کے واسطے ساتھ لے کر مزار پُر انوار حضرت شاہ بوعلی قلندر نور اللہ مرقدہ پر حاضر ہونے کی اجازت حاصل کی۔ اجازت

دی گئی اور شہزادہ پانی پت کی طرف روانہ ہو گئے۔‘‘[3]

۱۸۴۹ء میں ولی عہد شہزادہ دارا بخت کا انتقال ہوا تو بادشاہ نے کمپنی بہادر کی منظوری کے بغیر ہی بڑے بیٹے مرزا فخر اور دس دیگر بیٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مرزا جواں بخت کو ولی عہد بنانے کا اعلان کر دیا۔ ۶ فروری ۱۸۴۹ء کو مرزا جواں بخت درگاہ قدم شریف جانے لگے تو ولی عہد کے جلوس کا سامان پچاس سوار اور چار شاہی نشان انہیں دے دیئے گئے۔[4]

۱۶ مارچ کو ولی عہد مرحوم کی سواری کی پالکی اور عماری مرزا جواں بخت کو عطا کی گئی۔ مرزا فخرو نے اپنی حق تلفی کے خلاف کمپنی حکام کو درخواست دی۔ بادشاہ سلامت سے جواب طلبی ہوئی تو انہوں نے ایجنٹ بہادر کو لکھا کہ مرزا فخرو کم اصل سے ہیں جبکہ شہزادہ جواں بخت کی والدہ زینت محل احمد شاہ ابدالی کی اولاد میں سے ہیں اور پھر میرزا فخرو مختون ہیں جبکہ امیر تیمور کے وقت سے خاندان میں رسم چلی آ رہی ہے کہ کوئی بھی شہزادہ جس کا کوئی عضو کٹا ہوا ہو تخت پر نہیں بیٹھ سکتا۔[5]

۱۸۴۹ء میں بادشاہ سلامت نے ملکہ معظمہ کو ایک خط لندن ارسال کیا، جس کے ساتھ مرزا جواں بخت کے پنجے کا نشان بھی بھیجا گیا اور لکھا گیا کہ یہ ہاتھ ملکہ کے ہاتھ میں دیتا ہوں اور دست گیری کی امید رکھتا ہوں.....لیکن ۱۸۵۲ء میں مرزا فخرو کی بطور ولی عہد تقرری کی منظوری گورنمنٹ نے دے دی[6]۔ اسی سال گیارہ برس کی عمر میں شہزادہ جواں بخت کی شادی ہوئی۔

راقم الدولہ ظہیر الدین ظہیر دہلوی شادی کی تقریبات کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

’’ہر چند کہ تقریبات بسیار ریاست ہائے ہندوستان میں نظر سے گزریں‘ مگر جیسی شادی باز یب و تجمل مرزا جواں بخت بہادر کی ہوئی ایسی رنگین محفل تقریب دل فریب باجاہ وحشم اس دریا دلی کے ساتھ کہیں نظر سے نہیں گزری۔ بیان تکلفات رسوم ساچق‘ مہندی و برات و آرائش شہر و روشنی نقار خانہ جات وغیرہ فضول جان کر قلم انداز کیا جاتا ہے۔ البتہ دو امر قابل نگارش ہیں۔ ایک یہ کہ ہر قسم محفل سب سے جداگانہ تھا۔ دیوان کی بارہ دری میں جدا جدا محفلیں ترتیب دی گئی تھیں۔ ہر در میں ایک طائفہ جدا رقص کرتا تھا۔ شاہزادگان کی محفل جدا تھی۔ ملازمین معززین کی انجمن جدا‘ فرقہ سپاہ کی بزم جدا تھی۔ اہل شہر کے لیے حکم عام تھا کہ آئیں اور تماشہ رقص وسرود سے محظوظ ہوں۔

رقاصان پری پیکر ہر طرف سرگرم ناز وادا تھیں‘ ومہ جبینان ناہید زمزمہ پرداز۔ دس بارہ روز تک یہ محفلیں گرم رہیں۔ کل ملازمین شاہی اور روسائے شہر کے لیے تورہ جات کا حکم تھا جس کا جی چاہے زر نقد روپیہ تورے کی قیمت لے‘ خواہ تورہ لے۔ جتنے قلم کے نوکر تھے نام بنام سب کے تورے تقسیم کیے جاتے تھے۔ مثلاً میرے والد کا تورہ جدا‘ میرے نام جدا‘ میرے چھوٹے بھائی کے نام جدا‘ وہ بھی نوکر تھا۔ میری والدہ کے نام جدا کیونکہ ایک تنخواہ ان کے نام کی بھی تھی۔ میں نے مہتمان تورہ بندی سے کہلا بھیجا کہ آٹھ روز بعد ایک تورہ

بھجوا دیا کرو۔ اس دریا دلی سے تقسیم تورہ جات کی ہوئی تھی کہ جس روز تورہ آتا تھا تمام عزیز و اقارب دوست احباب کے گھر کھانا تقسیم ہوا کرتا تھا۔ ایک تورے میں طعام اس قدر ہوا کرتا تھا کہ ایک محفل شکم سیر ہو کر کھالے۔ سیرے مکان کا تمام دالان بھر جاتا تھا۔ ایک ایک طباق میں پانچ پانچ سیر کھانا ہوتا تھا۔ چار چار پانچ پانچ طرح کے پلاؤ، رنگ برنگ کے میٹھے چاول، سرخ، سبز، زرد، دودے، پانچ سیر کی باقرخانی، ایک شیریں، ایک نمکین اور کئی قسم کے نان، غرض اقسام خوردنی سے کوئی شے باقی نہ رکھی گئی تھی۔ مختصر یہ کہ کسی ریاست میں ایسی پر تکلف کوئی تقریب نظر سے نہیں گزری جو اس گئی گزری سلطنت میں دیکھنے میں آئی۔ اس کے علاوہ جن شعراء نے قصائد تہنیت اور سہرے وغیرہ لکھے تھے باوجودیکہ ملازم تھے مگر سب کو صلے میں خلعت و انعام عطا ہوئے۔ شاگرد پیشہ کو جوڑے تقسیم ہوئے۔"[7]

اس گئی گزری سلطنت کو اس پُر تکلف تقریب پر جو اخراجات کرنا پڑے وہ قرض لے کر کیے گئے تھے اور اس قرض کی ادائی کے لیے مل سبحانی تک سے مدد مانگنا پڑی تھی جو افسوس کہ نہ ملی۔[8]

شعراء نے قصائد تہنیت اور سہرے لکھے وہ تاریخ کا حصہ بن گئے بلکہ ایک عظیم ادبی معرکے کی شکل اختیار کر گئے۔ غالب اور ذوق دونوں قلعہ معلّٰی کے ملازم تھے۔ ذوق استاد شاہ جبکہ غالب تاریخ نویس۔ ملکہ زینت محل نے غالب سے سہرا لکھنے کی فرمائش کی۔ غالب نے تعمیل میں یہ سہرا گزرانا:

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

مقطع تھا کہ:

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

شاہ نے سہرا دیکھا تو گمان گزرا کہ ہم پہ چشمک ہے۔ گویا استاد شاہ کو چیلنج ہے اور شاہ کے بارے میں ہے کہ وہ طرفدار ذوق ہیں جبکہ سخن فہم نہیں۔ چنانچہ استاد کو طلب فرمایا اور سہرا انہیں دکھا کر کہا' استاد تم بھی ایک سہرا لکھ دو، ذرا مقطع پہ نظر رکھنا۔

اللہ دے اور بندہ لے۔ ذوق کو موقع چاہیے تھا' بحر و ردیف اور قافیہ موجود تھے[9]۔ ذوق نے چیلنج قبول کیا اور دل لگا کر جوابی سہرا لکھا۔ آخری شعر تھا:

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دو اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

سہرا اخباروں میں چھپوا دیا گیا۔ ارباب نشاط کو دیا گیا کہ بالاخانوں پہ گائیں۔ ایک ہی دن میں سہرا زبان زد عام ہو گیا..... غالب نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ایک قطعہ بطور معذرت بادشاہ کی

خدمت میں پیش کیا۔[10]

منظور ہے گزارش احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے
استاد شہ سے ہو پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

نقاد کہتے ہیں کہ ذوق کا سہرا غالب کے سہرے سے بڑھ گیا لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ بادشاہ نے خود دلچسپی لے کر یہ سہرا لکھوایا اور سہرے کی اشاعت واہتمام ونمائش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی چنانچہ غالب کا سہرا اس مصنوعی چمک دمک کے آگے ماند پڑ گیا۔ لیکن گزارش احوال واقعی میں جس جرأت دبے باکی کا اظہار غالب نے کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ رہتی دنیا تک غالب نے شاہ اور استاد دونوں کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے۔

آیئے دیکھیں غالب خود اس قضیئے پہ کیا فرماتے ہیں۔ نواب انوارالدولہ شفق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ایک زمانہ ہو گیا کہ میں داستان سرائی سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ یہ شہریار سلیماں پیش کار کی رضاجوئی کا باعث ہے کہ میں گاہ گاہ ریختہ کی طرف مائل ہو جاتا ہوں۔ خاص طور پر ملکہ عالیہ کی فرمائش کی تعمیل کے سبب ہوتا ہے۔ اس ردیف نارِدا کے ساتھ ورنہ مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ مقطع غزل میں میں نے ایک نعرۂ

مستانہ کے طور پر "ہو" کی ہوگی' کہ اس شخص نے اپنے کمال کے زعم میں جو دراصل اسے حاصل ہی نہ تھا' یہ خیال کیا کہ میرا روئے سخن اس کی طرف ہے۔ ایک غزل کے مقطع میں ستیزہ کاری و تقاضا سنجی کے انداز میں گام فرسائی کی اور اس لہجہ میں بات کی گویا وہ مجھے اس کا جواب دے رہا ہے تو میں نے سیہ مستی کے عالم میں نو جرعے کہ میرے خامہ بے پرداخرام کے رشحات ہیں۔ محفل سخن میں پیش کیے۔ یہ مصرعہ "آنچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است" اسی سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے اس کے بعد کچھ نہیں لکھا۔"[11]

دہلی اردو اخبار ۱۸ مارچ ۱۸۵۲ء کی اشاعت میں اس معرکے کی تفصیل شائع ہوئی۔ غالب کا سہرا' ذوق کا جوابی سہرا' غالب کا قطعہ چھاپے گئے لیکن اس میں ایک مصرعہ موجودہ دیوان سے خاصا مختلف ہے۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

کی بجائے یوں ہے:

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
علم و کمال و فضل سے نسبت نہیں مجھے[12]

مرزا جواں بخت کی شادی کی تقریبات کے ضمن میں ظہیر دہلوی نے ساچق مہندی برات وغیرہ کو فضول رسوم کہہ کر قلم انداز کیا ہے۔

سید احمد دہلوی نے اپنی کتاب "رسومِ دہلی" میں ان پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

ساچق کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ قلعہ میں اس موقع پر بہادر شاہ ظفر کا بنایا ہوا جسب ذیل شادیانہ گایا جاتا ہے[13]۔

محفل شادی ظفر آج بھی ہو کل بھی ہو
گھر ترا شادی کا گھر آج بھی ہو کل بھی ہو
رات کو ہو رتجگا صبح کو صحنک شہا
دھوم یہ شام و سحر آج بھی ہو کل بھی ہو

آخر میں یہ تذکرہ خارج از موضوع نہ ہوگا کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب بہادر شاہ ظفر کو رنگون جلا وطن کیا گیا تو ان کے ساتھ نواب زینت محل بیگم کے علاوہ شہزادہ جواں بخت اور ان کی دلہن زمانی بیگم بھی تھیں۔ ۱۸۶۶ء میں شہزادے کو قید سے رہائی ملی۔ تین سو روپے ماہانہ پنشن مقرر کی گئی۔ شہزادے کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی..... ۱۰ ستمبر ۱۸۸۴ء کو شکست خوردہ بادشاہ ابوظفر کا یہ بخت جواں صرف ۴۳ سال کی عمر میں بخت اور جوانی دونوں سے محروم ہو کر جلا وطنی میں چل بسا اور دلّی سے بہت دور برما میں حولین کے مقام پر دفن ہوا[14]۔

حوالہ جات

1- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔
2-3-4 بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین لاہوری، بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔
5- بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین لاہوری۔
6- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔
7- داستانِ غدر از راقم الدولہ ظہیر دہلوی۔
8- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔
9- آبِ حیات از محمد حسین آزاد۔
10- اردو کے ادبی معرکے از محمد یعقوب عامر از ترقی اردو بیورو نئی دہلی۔
11- پنج آہنگ از مرزا اسد اللہ خان غالب۔
12- خیابانِ غالب از نادم سیتاپوری۔
13- رسومِ دہلی از سید احمد دہلوی

قلعہ معلّٰی کے القاب وخطابات

نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خان، بہادر نظام جنگ

"اس گوشہ نشینی میں جو میرا مسلک اور معمول ہے، بادشاہ سلامت نے مجھے دربار میں بلایا۔ خلعت اور خطاب عطا فرمایا اور اپنے بزرگوں کی حکومت وسلطنت کے حالات لکھنے پر مامور فرمایا۔ میں نے دل میں کہا، اے غالب آشفتہ سر منصب سخن گستری کی آبرو رکھنا ضروری ہے اور اگرچہ افسانہ سرائی آزاد مردوں کا شیوہ نہیں، طعنہ زنوں کو بھی موقع نہیں دینا چاہیے چنانچہ مبدءِ فیاض کی توفیق سے کتاب کا وہ حصہ پیشروؤں کے اسلوب کو قائم رکھتے ہوئے ختم ہو گیا جو حمد، نعت، مدح۔ سلطان، خطاب زمین بوس، سببِ تالیف اور امیر تیمور صاحب قراں، حضرت ظہیر الدین بابر اور حضرت نصیر الدین ہمایوں کے حالات پر مشتمل ہے اور یہ حصہ کاغذ کے آٹھ جزو میں آیا اور معنی نگاری کا حسین مرقع ہے۔"[1]

(مکتوب بنام تفضل حسین خان ۱۸۵۱ء)

بادشاہ سلامت کے روحانی پیشوا حضرت غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب اور معالج شاہی حکیم احسن اللہ خاں کی کوششوں سے غالب کو نجم الدولہ، دبیر الملک، خان بہادر نظام جنگ کے خطابات عطا ہوئے۔ ملک الشعراء خاقانی ہند استاد شاہ کو اس قسم کے خطاب سے کیوں نہ نوازا گیا..... شاید اس لیے کہ وہ شیخ اور سپاہی زادے تھے جبکہ غالب ترک اشرافیہ میں سے تھے؟ بہادر شاہ ظفر کے عہد پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کے ہاتھ سے سلطنت جا چکی تھی، صرف قلعہ بچا تھا اور چند باغ اور ایک لگا بندھا وظیفہ، لیکن دربار شاہی کو انہوں نے اس وضع سے چلایا جیسے کوئی صاحب سلطنت بادشاہ چلاتا۔ خطابات اور خلعتوں ہی کو لیجیے۔

۱۹ جون ۱۸۴۶ء "احسن الاخبار" کی خبر:[2]

"اب سے پہلے جہاں پناہ شاہ دہلی ریذیڈنٹ دہلی کو اس خطاب سے یاد کرتے تھے۔ فرزند ارجمند معظم الدولہ امین الملک اختصاص یار خان طامس تھیافیلس مٹکاف بہادر فیروز جنگ۔ آج ارشاد عالی ہوا چونکہ

انھوں نے قلعہ کی مرمت و درستی کا کافی انتظام کر دیا ہے' شاہی دیہات کے انتظام و انصرام اور بعض دوسرے کاموں کے سرانجام دینے میں امید سے زیادہ کوشش کی ہے' اس لیے میں ان سے بہت زیادہ خوشنود ہوا۔ اس کے بعد حکیم احسن اللہ خاں کی طرف خطاب کر کے فرمایا:

''مجھے صاحب کلاں معظم الدولہ بہادر کی خیر خواہی اور ہمدردی سے بہت خوشی حاصل ہوئی۔ اس لیے دفتر خانے میں حکم دے دیا جائے کہ ان کے پورے القاب کے ساتھ ''فرزند ارجمند بجاں پیوند سلطانی'' بھی ضرور لکھا جائے۔'' اب سارے القاب کی یہ صورت ہوئی فرزند ارجمند بجاں پیوند سلطانی معظم الدولہ امین الملک اختصاص یار خان طامس تھیافلیس منکاف بہادر فیروز جنگ۔''

لیکن خاکسار ایڈیٹر ''احسن الاخبار'' اپنے ناظرین کی خدمت میں عرض گزار ہے کہ اتنا لمبا چوڑا القاب لکھنے سے طوالت ہوتی ہے اور بعض لوگ پڑھتے ہوئے گھبراتے ہیں اور شکایت لکھ کر بھیجتے ہیں' اس لیے لوگوں کو سمجھانے کے لیے ان کا نام نامی صرف ''معظم الدولہ بہادر دام اقبالہٗ'' تحریر کیا جائے گا۔ ناظرین نوٹ کر لیں' اس اختصار میں کام نکل جائے گا۔ اور ناظرین کا فضول وقت ضائع نہ ہوگا۔''

اپنے فرزند مرزا محمد شاہ رخ بہادر مرحوم کے فرزندان کو عہدے' خلعتیں اور خطابات عطا کیے۔
''احسن الاخبار'' کی رپورٹ:

''مرزا محمد شاہ رخ بہادر مرحوم کے بڑے صاحبزادے کو بادشاہ سلامت نے طلب فرما کر سواروں کی بخشی گری کا منصب' علاقہ جات پدری' کمخواب کی قبا' سہ رقم جواہر' دوشالہ' دستار سر بستہ' سپر شمشیر گھوڑا' ہاتھی مرحمت فرمایا اور

''قرۂ باصرہ خلافت' غرہ ناصیہ دولت' شیر بیشہ شہامت' شہسوار میدان شجاعت غضنفر الدولہ' شمس الممالک' مغیث الزماں مرزا محمد عبداللہ شاہ بہادر کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ منجھلے صاحبزادے کو بھی تمام کارخانوں کا دیوان مقرر فرما کر

''نو حدیقہ شہریاری' نو ردیدہ کامگاری' مہر سپہر رفعت' ماہ منیر دولت' رفیع الدولہ' قطب الممالک' فخر الزماں' مرزا محمد مظفر بخت بہادر کے خطاب سے معزز و مفتخر فرمایا اور ایک کمخواب کی قبا دوشالہ' سہ رقم جواہر' دستار' سپر' تلوار ہاتھی گھوڑا پالکی سامان مرحمت ہوا۔ سب سے چھوٹے صاحبزادے کو سپاہیوں کی پلٹن کی بخشی گری کے عہدے پر مقرر کیا اور ایک کمخواب کی قبا دوشالہ' سہ رقم جواہر' دستار' سپر' تلوار' ہاتھی گھوڑا پالکی مرحمت فرمائی اور گوہر درج خلافت' اختر برج سلطنت' یکہ تاز میدان شجاعت' نہنگ دریائے شہامت' مغیث الدولہ' فخر الممالک' محی الزماں' مرزا محمد خرم بخت بہادر کے خطابات سے سربلند فرمایا۔

(۳۰ اپریل ۱۸۴۷ء)[3]

شاہی حکیم احسن اللہ خاں کو جن خطابات والقابات سے نوازا گیا وہ تھے۔

''اعظم الحکماء حاذق الزماں' انتخاب الملک' احترام الدولہ' حکیم احسن اللہ خاں' بہادر ثابت جنگ۔'' (۱۰ اپریل ۱۸۴۹ء)[6]

مرحوم شہزادے کے منجھلے صاحبزادے کے تمام کارخانوں کا دیوان مقرر کیے جانے کا ذکر ہے۔ کارخانہ جات کی تفصیل ظہیر دہلوی نے یوں بیان کی ہے:

''خاصہ کلاں' خاصہ خرد' آب دار خانہ' دوا خانہ' توشہ خانہ' جواہر خانہ' سلاح خانہ' اصطبل' خانسامانی' فیل خانہ' بگھی خانہ' توپ خانہ' شتر خانہ' کارخانہ جلوس' ماہی مراتب (چتر وعلم) بخشی خانہ فوج' کتب خانہ' کبوتر خانہ' داروغۂ نذر وشار' داروغہ فراش خانہ' پالکی خانہ' داروغہ کہاران' داروغہ خاص پرداز ان' جمعدار صیان' نواب ناظر افسر خواجہ سرایان.....''[5]

ملک کے اصل حاکم اور مالک ان کھیل تماشوں کے خاتمے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ قلعہ معلّٰی کے گرد شکنجہ کستے جا رہے تھے۔ شاہ کو بتا دیا گیا تھا کہ آپ کے بعد آپ کی اولاد کو قلعہ خالی کرنا ہوگا۔ ''فرزند ارجمند بجان پیوند سلطانی'' مسٹر ٹامس مٹکاف کے بڑے بھائی چارلس مٹکاف جب اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ریذیڈنٹ مسٹر سٹن کے نائب تھے تو اس وقت لکھ چکے تھے۔

''میں اس پالیسی کے ساتھ موافقت نہیں کرتا جو سٹن صاحب نے شاہی خاندان کے ساتھ اختیار کر رکھی ہے۔ جو شخص برٹش گورنمنٹ کی طرف سے دہلی میں حکمرانی کے لیے مقرر ہو وہ بادشاہ کی تعظیم اس طرح کرتا ہے جس سے بادشاہی قوت کے بیدار ہونے کا اندیشہ ہے حالانکہ ہم اس کو ہمیشہ کے لیے سلا دینا چاہتے ہیں۔''[6]

عیدین' نوروز اور بادشاہ کی سالگرہ پر ریذیڈنٹ کی معرفت گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی جانب سے بادشاہ کو نذر پیش کی جاتی تھی۔ لارڈ ایلن برا نے اسے بند کر دیا۔ بعد ازاں بادشاہ کو کمپنی کے عہدیداروں کو خطابات دینے سے منع کر دیا گیا[7]۔

بادشاہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے قرضے لینے پر مجبور تھے۔ انھیں محض سوا لاکھ روپے مہینہ وظیفہ ملتا تھا جبکہ محض دہلی کی چونگی کی آمدنی بادشاہ کے وظیفے سے تین سے چار گنا زیادہ تھی۔ ۱۸۴۰ء میں یہ آمدنی چھتیس لاکھ نو ہزار پانچ سو اکیس روپے جبکہ ۱۸۴۶ء میں چھیالیس لاکھ انسٹھ ہزار دو سو ستاون روپے تھی[8]۔ دوسری طرف قرض خواہ بادشاہ کے خلاف دعوے دائر کر رہے تھے۔

۱۶ اپریل ۱۸۴۹ء 'احسن الاخبار' کی ایک خبر:

''آج فوجداری کے اسسٹنٹ صاحب نے کچہری ایجنٹی کے دوسرے کمرے میں ان قرض خواہوں کے بیانات قلم بند کیے جن کے قرضے بادشاہ سلامت کے ذمے ہیں۔ حکم ہوا کہ قرضے کے کچے کاغذ حاضر کریں ورنہ پھر ان قرضوں کی شنوائی نہ ہوگی۔''[9]

آخر ۱۸۵۷ء کی رستخیز نے بادشاہ کو نجات دلا دی۔ قرضوں سے بھی اور قلعے سے بھی۔ ۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو انہیں دہلی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے پر مجبور کر دیا گیا۔ وہ رنگون جلاوطن ہو گئے، جہاں ۱۰ نومبر ۱۸۶۲ء کو قید فرنگ سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئے اور..... قید حیات سے بھی۔

مقروض و وظیفہ خوار مرحوم بادشاہ کے مقروض پنشن خوار استاد اور شاہی مورخ کی حالت زار دیکھیے۔ وہ یہ کہتا نظر آ رہا ہے:

''یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں رہی۔ مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی۔ آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں! لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ اب قرضہ داروں کو جواب دے۔ سچ تو یہ ہے غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے ازراہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ، عرش نشین خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا۔ ''سقر مقر'' اور ''ہاویہ زاویہ'' خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر! ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب، نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب، آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا، یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔''[10]

(مکتوب بنام قربان علی بیگ سالک ۱۸۶۴ء)

۱۴ سال پیچھے جائیے اور ملاحظہ کیجیے کہ کس آن و بان اور کروفر سے انہیں نجم الدولگی اور خان بہادری مل رہی تھی۔ ''مہر نیمروز'' میں لکھتے ہیں:

''۲۳ شعبان ۱۲۶۶ ھج مطابق ۴ جون ۱۸۵۰ء آفتاب خرگاہِ ماہ (برج ثور) میں مہمان تھا اور چاند نشیمن زہرہ (برج حوت) سے مہمان کو نگاہ محبت سے دیکھ رہا تھا۔ کیوان برج حمل میں راہ نورد اور مشتری برج سنبلہ میں خراماں۔ مریخ برج اسد میں زہرہ کے ساتھ اور عطارد جوزا میں تنہائی پر شاداں۔ شہنشاہ ایسے دبدبے کے ساتھ کہ گویا آفتاب بیت شرف میں تخت پر جلوہ افروز اور میں ایسی خوشی کے ساتھ کہ گویا عطارد ہوں، صمیم دل سے روبرو کھڑا ہوں۔ شاہی کارکن مجھے بادشاہ کے حکم سے خلعت خانے میں لے گئے اور میرے قامت کو خلعت شش پارچہ سے آراستہ کر کے سلام گاہ میں لائے۔ دنیا و دین کے بادشاہ نے اس بخشش آئیں ہاتھ سے کہ جس کی ہتھیلی ایسا دریا ہے کہ سات دریا اس کے مقابلے میں کف آب جگر گوشہ ہائے معدن یعنی جیغہ اور سرپیچ میرے سر پر باندھا اور رگِ جانِ ابر نیسان یعنی ابر خامہ کی رگوں سے ٹپکے ہوئے موتی بساطِ بارگاہ کے گوشے پر بکھیر دیے اور غالب سخن سرا کو نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کے خطاب سے پکارا۔ اس خطاب

سے جو میں نے ذرہ نوازؔ آفتاب سے پایا کیونکر کہوں کہ اپنے آپ کو آفتاب کے برابر البتہ عطارد کا ہم پلہ پایا۔ شاہان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا فرمان میرے نام صادر ہوا اور دبیرِ چرخ (عطارد) کو تا کہ رشک سے اس کا دل خون نہ ہو۔ میری پیشکاری پر مامور کر دیا۔ نامہ نگار کا بھی ایسا ہی ارادہ تھا اور حکم بھی ایسا ہی ہوا کہ اس خرد افروز کتاب کا آغاز پادشاہ رستم سرہنگ، حاتم وظیفہ خوار دارا دربان، سکندر پیشکار نو آسمانوں اور سات ستاروں کے منظور نظر اور شش جہت میں ولایتوں کے حاکم، صاحب قران روشن گہر امیر کا تیمور نام جو نام آور کے (نام سے) جو زندگی میں کیوان کے برابر بلند محل اور ستاروں جیسی انجمن رکھنے والے تھے اور بعد مرگ آب کوثر سے سیراب اور جنت میں اقامت گزیں ہیں۔ اس طرح بیان کیا جائے کہ فردوسی کا شاہ نامہ تقویم پارینہ بن کر رہ جائے۔[11]

۱۵ جولائی ۱۹۵۰ء کے اسعد الاخبار میں غالب کی نجم الدولگی اور خان بہادری کی خبریں شائع ہوئیں:
"ان دنوں شاہ دیں پناہ نے جناب معلی القاب مرزا اسد اللہ خاں غالب کو بہ فرط عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر جو تیمور کے زمانہ سے سلطنت حال تک ہو مامور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپے مشاہرہ مقرر کر کے آئندہ انواع پرورش کا متوقع کیا اور نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ خطاب دے کر چھ پارچہ کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقین ہے کہ تواریخ مذکور ایسی دلچسپ ہوگی کہ ہر ایک اس کے لطف عبارت سے فیض یاب ہوگا۔"[12]

حوالہ جات

1- پنج آہنگ مرزا اسد اللہ خان غالب۔ ترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔
2-3-4 بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین لاہوری۔
5- داستان غدر از راقم الدولہ ظہیر دہلوی۔
6-7-8 بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔
9- بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین لاہوری۔
10- خطوط غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔
11- مہر نیمروز مرزا اسد اللہ خان غالب۔ ترجمہ پروفیسر سید عبد الرشید۔
12- ہندوستانی اخبار نویسی محمد عتیق صدیقی۔

دہلی کالج اور دہلی سوسائٹی

انیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں دہلی کالج کی تنظیم نو کی جا رہی تھی۔ سیکرٹری گورنمنٹ ہند مسٹر ٹامس مدرسین کے امتحان کے لیے دہلی آئے ہوئے تھے۔ مقصد تھا سو روپیہ ماہوار پر ایک فارسی مدرس کا تقرر۔ تین نام تجویز کیے گئے تھے۔ غالب' مومن اور صہبائی۔ نام تجویز کرنے والے حضرت آزردہ نے غالب کے علمی تبحر کی کچھ زیادہ تعریف کی تھی چنانچہ سب سے پہلے انہی کو طلب کیا گیا۔ آپ پالکی میں سوار ہو کر کالج پہنچے اور پھاٹک پر اس انتظار میں رہے کہ حسب دستور سیکرٹری صاحب ان کے خیر مقدم کو آئیں گے۔ جب دیر ہو گئی تو سیکرٹری صاحب نے دریافت کیا کہ غالب کیوں نہیں آ رہے؟ تاخیر کی وجہ معلوم ہوئی تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں' لہٰذا اس تعظیم و تکریم کی توقع نہ رکھیں۔

مرزا صاحب نے جواب دیا کہ گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے.....

صاحب نے کہلوایا کہ ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا نے جواب دیا تو پھر ہمیں بھی خدمت سے معذور سمجھا جائے..... پالکی میں سوار ہوئے پردے برابر کیے اور یہ جا وہ جا..... بعد ازاں امام بخش صہبائی کو فارسی کا استاد مقرر کیا گیا۔[1]

دہلی کالج کا قیام ۱۸۲۵ء میں عمل میں لایا گیا۔ اجمیری دروازہ میں واقع مدرسہ غازی الدین حیدر کو کالج کا درجہ دیا گیا تھا۔ یہ مدرسہ ۱۷۹۲ء میں قائم ہوا۔ اس کے بانی تھے نواب غازی الدین خان فیروز جنگ۔ مدرسہ کی عمارت انتہائی شاندار تھی۔ سنگ سرخ سے بنی ہوئی ایک خوبصورت مسجد' طلبہ کے لیے عمدہ اقامت گاہ..... بعض مدرس تو سمرقند و بخارا سے بلوائے گئے تھے۔ یہاں مشرقی علوم والسنہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ملک میں ابتری پھیلی تو مدرسہ بھی متاثر ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۸۲۳ء میں طلبہ کی تعداد صرف نو رہ گئی۔[2]

۱۸۱۳ء کے چارٹر کے مطابق برطانوی ہند میں فروغ تعلیم کے لیے ایک لاکھ روپے سالانہ کی رقم

مختص کی گئی تھی لیکن اس تجویز کو عملی جامہ نہیں پہنایا گیا[3]۔

۱۸۲۳ء میں مجلس تعلیم عامہ کی جانب سے جاری کردہ ایک سرکلر میں دہلی میں جدید علوم کی تعلیم کے لیے ایک کالج کے قیام کی تجویز دی گئی۔ دہلی کی مقامی مجلس تعلیم نے جوابی مراسلے میں اس تجویز کو سراہا اور واضح کیا کہ وہ اس مقصد کے لیے ساڑھے تین ہزار روپے مہیا کر سکتی ہے۔ سابقہ مدارس کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں۔ ان کے ذریعہ آمدنی' نظام تعلیم' اساتذہ اور طلبہ..... آخر طے پایا کہ مدرسہ غازی الدین حیدر کی عمارت کو کالج کے لیے استعمال کیا جائے اور مدرسے کو کالج کا درجہ دیا جائے۔

۱۸۲۵ء میں کالج کا افتتاح ہوا۔ مسٹر جے ایچ ٹیلر کو جو مقامی مجلس کے سیکرٹری تھے' ایک سو پچہتر روپے ماہوار پر کالج کا سیکرٹری قائم مقام پرنسپل مقرر کیا گیا۔ ہیڈ مولوی کی تنخواہ ایک سو بیس روپے مقرر ہوئی۔ دو مولوی پچاس پچاس روپے ماہانہ اور باقی پچیس اور تیس روپے ماہانہ پر رکھے گئے۔ طلبہ کے لیے وظائف بھی مقرر ہوئے۔ اس تمام کار خیر کے لیے کالج کے لیے سرکار کی طرف سے پانچ سو روپے ماہانہ منظور ہوئے[4]۔

۱۸۲۸ء میں سر چارلس منکاف برٹش ریذیڈنٹ کمشنر کی سفارش پر کالج میں ایک انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا اور لوکل فنڈ کی تعلیمی بجٹ سے دو سو پچاس روپے ماہانہ مزید کالج کے لیے منظور کیے گئے۔ اس ''بدعت'' سے لوگوں میں بڑی بے چینی پھیلی اور ہندو مسلمان دونوں نے اس کی مخالفت کی مگر رفتہ رفتہ یہ تعصب کم ہو گیا۔ اسی سال گورنر جنرل لارڈ ایمہرسٹ نے اس ادارے کا معائنہ کیا[5]۔

۱۸۲۹ء میں نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خان بہادر وزیر بادشاہ اودھ نے دہلی کے ریذیڈنٹ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ایک لاکھ ستر ہزار روپے اس غرض سے گورنمنٹ ہند کے حوالے کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی آمدنی سے دہلی میں مسلمان نوجوانوں کی تعلیم کے لیے ایک ادارہ قائم کیا جائے۔ گورنمنٹ نے نواب صاحب کا شکریہ ادا کیا لیکن جنرل کمیٹی تعلیم عامہ کی مشاورت سے انہیں تجویز دی گئی کہ نئے ادارے کے قیام کی بجائے یہ عطیہ موجودہ دہلی کالج کو دے دیا جائے اور اگر نواب صاحب اس تجویز کو منظور کر لیں تو انہیں کالج کے معاملات کا مہتمم یا افسر سمجھا جائے گا اور پروفیسروں کا تقرر ان کے نام پر ہوگا۔ نواب صاحب نے رقم وقف کردی اور اپنے داماد نواب سید حامد علی خان کو مصارف پر نظر رکھنے کے لیے نگران بنایا۔ ایک لوح بیچ کے دروازے پر اندر کی سمت نصب کی گئی جس کا مضمون تھا:

نہ بر لوح نقشے بماند و لیک
جزائے عمل ماند و نام نیک

بیادحسنات نواب اعتماد الدولہ ضیاء الملک سید فضل علی خان بہادر سہراب جنگ کہ یک لاکھ ہفتاد ہزار روپیہ برائے ترقی علوم در مدرسہ ہذا واقعہ دہلی خاص مولد وطن خویش بصاحبان کمپنی انگریز بہادر تفویض نمودند منقوش گردیدہ در ۱۸۲۹ء[6]۔

اس رقم سے کالج کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا لیکن نہ تو حسبِ وعدہ پروفیسروں اور طلبہ کا تقرر نواب صاحب کے نام پر ہوا نہ وظائف ان کے نام سے دیے گئے۔ نواب حامد علی خان نے متعدد بار اس جانب توجہ دلائی لیکن کچھ نہ ہوا البتہ انہیں کالج کمیٹی کا ممبر ضرور بنا دیا گیا[7]۔ اس کمیٹی کے دیگر ممبران میں سر تھامس مٹکاف، ڈاکٹر ریمکن اور مسٹر ای ٹریولن شامل تھے[8]۔

شعبہ علوم مشرقیہ میں عربی، فارسی، فلسفہ اور منطق کے علاوہ زبان اردو میں ریاضی، سائنس، تاریخ، جغرافیہ اور قانون کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔

۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بینٹک نے سائنس اور مغربی ادب کی تعلیم انگریزی میں دینے، طلبہ کے وظائف بند کرنے اور مشرقی زبانوں میں کتابوں کی تیاری اور ترجے کو موقوف کرنے کا حکم دیا۔ جب آپ کو علم ہوگا کہ لارڈ میکالے مسٹر بینٹک کے دست راست تھے تو آپ کو ان احکامات پر قطعاً حیرت نہ ہوگی۔ اس وقت کالج میں ۱۸۸ طالب علم پڑھتے تھے جن میں ۱۲۸ ہندو، ۵۴ مسلمان اور ۶ عیسائی تھے۔ "بینٹک میکالے اصلاحات" کے نتیجے میں ۱۸۲۶ء میں یہ تعداد ۱۰۳ جبکہ ۱۸۳۸ء کے آغاز میں صرف ۸۴ رہ گئی[9]۔

۱۸۳۹ء میں لارڈ آک لینڈ نے بینٹک میکالے اصلاحات کو رد کر دیا۔ وظائف بحال کر دیے گئے۔ شعبہ علوم شرقیہ میں مشرقی طرز تعلیم کو ترجیح دینے کا حکم دیا، چنانچہ ۱۸۳۸ء کے آخر میں طلبہ کی تعداد ۱۲۲ ہو گئی۔ یک سوسائٹی قائم ہوئی جس نے ہندوستانی زبانوں میں بہت سی مفید کتابیں تیار کیں۔

۱۸۳۹ء میں ایک فرانسیسی ماہر تعلیم مسٹر ایف بترو پرنسپل مقرر ہوئے۔ انہوں نے سابقہ میونسپل مسٹر ٹیلر سے بھی بڑھ کر کالج کی خدمت کی[10]۔

۱۸۴۳ء میں دہلی کو احاطہ بنگال سے الگ کر کے آگرہ کے تحت کر دیا گیا۔ سابق سیکرٹری مسٹر ٹامسن صوبہ کے لیفٹیننٹ گورنر بن گئے جنہوں نے اردو سکولوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی۔ کالج میں ایک ورنا کولر سوسائٹی قائم کی گئی جس نے جدید علوم کی کتب کو اردو زبان میں منتقل کر کے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اس سوسائٹی کی خدمات کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج سے کہیں زیادہ ہیں کیونکہ فورٹ ولیم کالج کا زور قصوں اور داستانوں کی تحریر و اشاعت پر رہا جبکہ دہلی ورنا کولر سوسائٹی نے علمی اور سائنسی موضوعات پر کتابیں شائع کیں۔ گورنر ٹامسن خود سوسائٹی کے سرپرست تھے۔

مسٹر بترو کے بعد ممتاز مستشرق مسٹر اسپرنگر کالج کے پرنسپل بنے۔ ان کے دور میں طلبہ کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوا کہ کالج کی عمارت ناکافی ہوگئی[11]۔

اسپرنگر کے بعد مسٹر کارگل اور پھر ۱۸۵۴ء میں ایک بار پھر مسٹر ٹیلر پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں کالج کو لوٹ مار اور غارت گری کا نشانہ بنایا گیا۔ انگریزی کتابیں پھاڑ ڈالی گئیں اور جلا دی گئیں۔ عربی فارسی اور اردو کتابیں لوٹ کر کوڑیوں کے مول فروخت کر دی گئیں۔ سائنس ڈیپارٹمنٹ کے تمام آلات

کو توڑ چھوڑ دیا گیا[12] ۔ ۱۸۵۷ء میں کالج بند ہوا تو پھر کہیں سن ۱۸۶۴ء میں جا کر کھلا' لیکن اپنی عظمت رفتہ کو نہ پاسکا۔ ۷۷-۱۸۷۶ء میں طلبہ کی تعداد صرف ۵۴ تھی۔ یہاں تک کہ ۱۸۷۷ء میں کالج کو توڑ کر لاہور کالج میں ضم کر دیا گیا۔ تمام عملہ لاہور بھیج دیا گیا۔ اس وقت تک دلّی کو آگرہ سے الگ کر کے پنجاب احاطہ میں شامل کر دیا گیا تھا۔ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب تمام اچھی چیزیں اپنے دارالحکومت میں چاہتے تھے اور پھر پرنسپل لاہور کالج مسٹر لائٹز پنجاب گورنمنٹ میں خاصا اثر و رسوخ رکھتے تھے[13] ۔

دہلی کالج کی خدمات فروغ تعلیم اور اشاعت کتب تک ہی محدود نہ تھیں۔ دہلی آرکیولوجیکل سوسائٹی بھی اسی کا فیض تھا۔ اس میں سید احمد خان' ماسٹر رام چندر اور مولوی ضیاء الدین جیسی نابغہ روزگار شخصیات شامل تھیں۔ سرسید نے محنت شاقہ کے بعد دہلی کی قدیم عمارتوں کے بارے میں رپورٹ تیار کر کے سوسائٹی کے سامنے پیش کی جس نے بعد ازاں "آثار الصنادید" کے نام سے چھپ کر ایک بیش بہا مستند تحقیق کا درجہ حاصل کیا[14] ۔

۱۸۳۷ء میں دہلی کالج ہی کے استاد مولوی محمد باقر نے شمالی ہند کا پہلا اردو اخبار "دہلی اردو اخبار" شائع کیا[15] ۔

شعبہ عربی کے صدر مولوی مملوک العلی نانوتوی صاحب جید عالم دین تھے۔ فارسی' عربی اور اردو میں کمال رکھتے تھے۔ انہوں نے سنن ترمذی کا ترجمہ اردو میں کیا تھا[16] ۔

مولوی امام بخش صہبائی صدر شعبہ فارسی' شاعر ادیب اور مصنف تھے۔ تذکرہ شعرائے اردو تحریر کیا۔ "حدائق البلاغۃ" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اردو صرف و نحو پر بھی ایک کتاب لکھی[17] ۔

مولوی سبحان بخش تزک تیموری اور وفیات الاعیان کے مترجم اور تذکرہ مفسرین اور تذکرہ حکماء کے مصنف تھے[18] ۔

ماسٹر رام چندر ریاضی کے ماہر تھے' اس علم میں کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ سائنس کے بھی عمدہ استاد تھے۔ پنڈت رام کشن دہلوی علم طب' اصول قوانین دیوانی و فوج داری' قواعد صرف و نحو اور علم زراعت پر کئی کتابوں کے مصنف و مترجم تھے[19] ۔

ان کے علاوہ شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین' بھیرو پرشاد' مولوی ذکاء اللہ' مولوی احمد علی اور مولوی حسن علی خان معروف اساتذہ میں سے تھے۔

کالج کے طلبہ میں جنہوں نے بعد ازاں خاصا نام پیدا کیا' شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد' شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد' شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ' شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین اور ماسٹر رام چندر' ماسٹر پیارے لعل' بھیرو پرشاد اور موتی لال دہلوی شامل تھے[20] ۔

دلّی کالج کے ماحول اور تعلیم نے جس طرح طلبہ کی فکر کو متاثر کیا اس کی ایک مثال دسمبر ۱۸۴۵ء کا تقریری مقابلہ جیتنے والے طالب علم خواجہ ضیاء الدین ہیں جنہوں نے دلائل کے ساتھ ثابت کیا تھا کہ قومی

حکومت شخصی حکومت سے بہتر ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر کا اختتام یوں کیا:

"جب ہم ان دونوں حکومتوں کا مقابلہ کر کے دیکھتے ہیں تو ہر طرح سے حکومت قومی حکومت شخصی پر ترجیح رکھتی ہے اور عقل نقل اس حکومت کی برائی پر شہادت نہیں دیتی ہے جس میں فقط ایک شخص کو اختیار عمل ہو۔"

ہفت روزہ قران السعدین میں یہ خبر ان الفاظ میں شائع ہوئی:

"باعث حسن سعی اور خوبی انتظام ہمارے پرنسپل صاحب بہادر کے ۲۴ تاریخ ماہ حال کو مدارس دہلی کے امتحان سے بالکل فراغت ہو گئی اور اسی تاریخ کو اہالیان کمیٹی اور اکثر روساء دہلی مدرسہ تشریف لائے اور جلسۂ عام میں بعض طلباء نے اپنے لکھے ہوئے مضمون پڑھ کر سنائے۔ خواجہ ضیاء الدین صاحب طالب علم جماعت اول عربی نے جواب مضمون اردو کا اجلاس میں پڑھا ان کو اسی مضمون کے لکھنے پر جناب مفتی صدر الدین خان بہادر صدر الصدور دہلی نے تمغۂ نقرئی عنایت کیا۔"[20A]

ہفت روزہ قران السعدین دلّی کالج کے ایک پرنسپل مسٹر اشپرانگر نے ۱۸۲۵ء میں جاری کیا تھا وہ اسی سال کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔ وہ خود رقم طراز ہیں:

"۱۸۲۵ء میں میں نے دلّی میں 'پےنی' میگزین کی طرز پر ایک باتصویر موقت رسالے کی بناڈالی اس کا نام قران السعدین تھا' گویا مشرق اور مغرب مشتری اور زہرہ تھے جن کا قران اس رسالے میں ہوتا تھا۔ یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش تھی۔ گیارہ برس بعد جب میں ہندوستان سے رخصت ہوا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی تقلید میں بارہ سے زیادہ رسالے نکل رہے تھے۔"

موسیو گارساں دے تاسی قران السعدین کے بارے میں لکھتے ہیں:[20B]

"یہ ایک باتصویر اخبار ہے۔ جس میں سائنس' ادب اور سیاست سے بحث ہوتی ہے۔ اس کا مقصد اپنے ہم وطنوں میں مغربی خیالات کی اشاعت ہے۔" خطبات دتاسی

ماسٹر رام چندر نے ۱۸۴۵ء میں پندرہ روزہ "فوائد الناظرین" کا اجرا کیا۔ یہ باتصویر علمی اور تاریخی جریدہ تھا۔ سرورق پر یہ عبارت درج ہوا کرتی تھی "قیمت اس پرچہ کی چار آنے ماہواری جاری ہوتا ہے مہینے میں دو بار محصول ڈاک ذمہ خریدار۔"

اور اختتام اس سطر پر ہوتا تھا۔

رام چند مدرس علم انگریزی مدرسہ دہلی کے اہتمام سے مطبع العلوم دہلی میں چھپا۔

شروع میں یہ چار صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ بعد ازاں اسے آٹھ صفحات کا کر دیا گیا۔[20C]

۱۳ ستمبر ۱۸۶۸ء کے شمارہ میں جدید جغرافیہ پر ایک مضمون "کرۂ زمین کا حال" کے عنوان سے چھپا' ایک مضمون بین الاقوامی امور پر بعنوان "حال آغا محمد شاہ ایران کا" اور ایک معلوماتی مضمون بہ عنوان حال مروارید یعنی موتی کا تھا جس میں صدف میں موتی بننے کے عمل کا سائنسی جائزہ تھا۔ اس کے علاوہ اخبار دہلی اخبار ملتان اور اخبار

پشاور کے عنوان سے سیاسی اور عسکری ڈائریاں تھیں۔ دلّی میں لارڈ ڈلہوزی کے قدم رنجہ فرمانے کا ذکر، ملتان میں دیوان مولراج کی بغاوت اور محاصرے کا تذکرہ اور پشاور کی رپورٹ میں سکھ فوجیوں کے بلوے کی رپورٹ تھی۔

فوائد الناظرین نے فروغ تعلیم خصوصاً تعلیم نسواں کے حوالے سے بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ۱۸۲۶ء کے ایک شمارے میں ماسٹر رام چندر اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں:

''اب میں مہتمم سلطان الاخبار سے سوال کرتا ہوں کہ کیا عیب اور نقصان تعلیم حاصل کرنے میں لڑکیوں کے نکلتے ہیں اور اگر وہ یہ فرمائیں کہ شرع شریف میں پڑھانا علم فلسفہ وغیرہ کا' لڑکیوں کو جائز نہیں تو یہ بات غلط ہے کہ فدوی بھی چند مسلمانوں سے ملاقات رکھتا ہے۔ استفسار سے معلوم ہوا کہ شرع شریف میں اس باب میں کچھ نہیں لکھا ہے۔

۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء کو کمشنر ہملٹن نے دہلی سوسائٹی کا سنگ بنیاد رکھا۔ فروغِ علوم اور فلاحِ عموی اس کے دو بنیادی مقاصد قرار دیئے گئے..... باعث ترقی علوم و رفاہ عام..... کمشنر ہملٹن سوسائٹی کے اولین صدر اور ماسٹر پیارے لال آشوب اس کے پہلے سیکرٹری تھے[21]۔

سوسائٹی کی کارروائی ضابطہ تحریر میں لائی جاتی تھی اور چھاپی جاتی تھی۔ ایسے ہی ایک مطبوعہ کتاب کی پیشانی پر تحریر تھا۔ ''سوسائٹی کی بزم معلّیٰ کا ذکر ہے' علوم و حکمت و انشاء کا ذکر ہے۔''

سوسائٹی کے اولیں اراکین میں ۱۷ انگریز اور ۷۶ ہندوستانی تھے۔ ان میں مرزا غالب اور سرسید احمد خان بھی شامل تھے۔ مرزا الٰہی بخش شریک صدر جبکہ لالہ صاحب سنگھ نائب صدر تھے۔ فعال اراکین میں تین میونسپل کمشنر حضرات لالہ چھنامل' مہیش داس اور نواب شہاب الدین خان' ڈپٹی شیخ ولایت حسین' شیخ محبوب بخش اور ریورنڈ اسمتھ تھے۔ دیگر معروف ارکان نواب ضیاء الدین احمد خان' مولوی ضیاء الدین' مولوی جعفر علی' پنڈت بشمبر ناتھ' پنڈت گوپال سیہائے' لالہ وزیر سنگھ' نواب نجف خان اور حکیم محمود خان تھے۔

سوسائٹی کی کارروائی اردو میں ہوتی تھی اور اردو ہی میں چھاپی جاتی تھی۔ پہلے دو سال یہ طباعت ''اکمل المطابع'' میں ہوتی رہی' بعدازاں غالب کے ایک شاگرد بہاری لعل مشتاق کے پریس میں چھاپی جانے لگی۔ اس کی مطبوعات کا حجم پچاس سے ایک سو پچاس صفحات تک ہوتا تھا۔ یہ اس قدر اہم تھی کہ ان کا ذکر ممتاز فرانسیسی سکالر آثار الصنادید کے ترجمہ موسیو گارسیں دتاسی نے اردو لٹریچر کی صورتحال پر اپنے سالانہ لیکچرز میں بھی کیا[22]۔

۱۱ اگست ۱۸۶۵ء کو سوسائٹی کے دوسرے اجلاس میں نواب شہاب الدین نے اخلاقیات' نواب علاء الدین احمد خان علائی نے زبان اردو' رائے جیون لال نے تاریخ' رائے بنسی لال نے مخطوطات' لالہ چندولال نے دیوناگری' رائے صاحب سنگھ نے مہاجنی نظام' بشمبر ناتھ نے انتقال جائیداد اور شیخ محبوب بخش نے فروغ تجارت پر گفتگو کی۔ مرزا غالب نے بھی ایک مختصر مضمون پڑھا جس میں غدر کا ذکر' دہلی کے عوام کی مشکلات کا

ذکر' آفات ارضی اور بلیات سماوی کا رونا اور سرکار انگریزی سے اپنی وفاداری کا اظہار تھا۔ ۱۸۶۸ء کے ایک اجلاس میں پنجاب میں حقوق مزارعین کے بل پر بحث کی گئی۔ ایک سنسکرت سکول کے قیام کی بات ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی دہلی میں قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

لالہ پیارے لال نے اہل ہند اور اہل یورپ کے درمیان تعلقات کی بات کی اور تجویز پیش کی کہ یورپی باشندوں کو باقاعدہ ہندوستان میں آباد ہونا چاہیے۔ نسلی امتیازات اور تعصبات کو ختم کر دینا چاہیے۔ ارکان اس بات پر متفق تھے کہ اگر ہندوستانیوں کو انگریزوں جیسی تعلیم دی جائے تو امتیازات کا خاتمہ ہو جائے گا' لیکن ستم ظریفی یہ کہ اسی سوسائٹی کے پلیٹ فارم پر معزز رکن رائے مہیش داس نے چماروں اور نچلی ذات کے لوگوں کو تعلیم دینے کی سخت مخالفت کی اور اسے "علم کی آلودگی" قرار دیا[23]۔

سوسائٹی کے ارکان کی اکثریت "ہواخواہان سرکار" پر مشتمل تھی جو انگریزوں کی خوشنودی کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے تھے۔ انگریز بھی انہیں اہمیت دیتے تھے۔ ۱۸۶۸ء میں مسٹر کیپٹن کرافٹ نے کہا کہ سوسائٹی کوئی زیادہ بہتر کام نہیں کر سکی' کیونکہ اس کے ارکان قدیم معززین ہیں جو اجلاسوں میں محض کمشنر صاحب بہادر کو سلام کرنے آتے ہیں۔

۱۸۶۹ء میں بنگال سے بھولا ناتھ چندر دہلی آئے تو انہوں نے سوسائٹی پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس نے رائے عامہ بنانے' عوامی اجلاس بلانے' لوگوں کو سیاسی شعور اور اپنے حقوق کی آگہی بخشنے نیز اخبارات کے ذریعے اپنے مقاصد کی اشاعت کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں کی[23]۔ سیکرٹری پیارے لال آشوب کا تبادلہ لاہور ہوا تو ۹ دسمبر ۱۸۶۸ء کو انہوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا۔ اس موقع پر سوسائٹی کے ارکان نے ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔ جس پر دستخط کرتے ہوئے غالب نے تحریر کیا۔

"فقیر اسد اللہ خان غالب کہتا ہے کہ بابو پیارے لال کی مفارقت کا غم واندوہ ہوا ہے' میرا جی جانتا ہے۔ بس اب میں نے جانا کہ میرا دہلی میں کوئی نہیں"[25]۔

غالب سوسائٹی کے قیام سے لے کر اپنی وفات تک اس کے مستقل ممبر رہے اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ لالہ پیارے لال کی جگہ مشن سکول کے ایک استاد اور ایک نئے عیسائی لالہ چندولال کو سیکرٹری بنایا گیا جسے مسٹر کرافٹ اور مشنری حضرات نے خوش آئند قرار دیا اور توقع ظاہر کی کہ اب سوسائٹی کے پلیٹ فارم پر فروغ واشاعت عیسائیت کی بات ہوگی' جس پر ہملٹن نے پابندی عائد کر رکھی تھی' چنانچہ سوسائٹی دھڑوں میں بٹ گئی۔ مشنری حضرات کے رویے کے خلاف احتجاجاً مسلمانوں نے سوسائٹی میں دلچسپی لینا کم کر دی اور مسلم ارکان کی تعداد کم ہو گئی[26]۔

سوسائٹی میں سنسکرت اور عربی کی تعلیم کے فروغ پر بھی بات ہوئی' جس کے محرک انسپکٹر تعلیم مسٹر ہالرائیڈ تھے چنانچہ لالہ چھنامل نے دہلی سنسکرت سکول کے قیام اور اس کے تمام اخراجات برداشت

کرنے کا اعلان کیا۔ نواب محمد امین آف لوہارو نے اپنے گھر پر عربی سکول کا اجراء کیا۔ مرزا الہی بخش نے ۱۸۵۷ء کے بقیۃ السیف مغلوں کے بچوں کے لیے عرب سرائے میں ایک سکول قائم کیا۔ سوسائٹی کی کاوشوں سے شاہی خاندان کی تعلیم یافتہ خواتین کو لڑکیوں کے سکولوں میں ملازمتیں دی گئی۔ بعدازاں سوسائٹی دانشورانہ مسائل پر گفتگو کا ایک فورم بن کر رہ گئی[27]۔

حوالہ جات

1- یادگار غالب از مولانا الطاف حسین حالی۔

3-2- مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق، موہن لال کشمیری، ہری رام گپتا۔

4- اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ از ڈاکٹر سنبل نگار، مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق۔

5- مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق۔

6- چراغ دہلی از میرزا حیرت دہلوی۔

7- مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق۔

Delhi, between two Empires. Naraini Gupta. -8

9- موہن لال کاشمیری از ہری رام گپتا۔ بیکن بکس، ملتان۔

10- اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ از ڈاکٹر سنبل نگار۔

13-12-11- مرحوم دہلی کالج۔ مولوی عبدالحق۔

Twilight of the Mughals. Spear -15-14

Delhi between two Empires. N.Gupta.

20-16- مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق

20A- ہندوستانی صحافت محمد عتیق صدیقی

20B- دلّی کالج میگزین قدیم دلّی کالج نمبر 1957

20C- دلّی کالج میگزین قدیم دلّی کالج نمبر 1953

Delhi between two Empires. N.Gupta 24-21

25- مجموعۂ نثر غالب مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی۔

Delhi between two Empires. Naraini Gupta. 27-26

دلّی کے کتب خانے، کتب زیر مطالعہ غالب، تصانیف غالب

''میرا ایک سمبھی بھائی ہے نواب ضیاء الدین خان وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا، چنانچہ مجموعۂ نثر اور کلیات اردو سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتب خانہ ڈر کر عرض کرتا ہوں۔ بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا۔ لٹ گیا ایک ورق نہیں رہا۔'' [1]

''میرا کلام میرے پاس کبھی نہیں رہا' نواب ضیاء الدین احمد خان اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں نے کہا انھوں نے لکھ لیا' ان دونوں کے گھر لٹ گئے' ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہوگئے۔'' [2]

نواب ضیاء الدین احمد خان کی لائبریری میں کتب تاریخ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا اور بہت سے نایاب قلمی نسخے بھی تھے۔ سیکرٹری گورنمنٹ ہند ایچ ایم ایلیٹ نے اسی کتب خانے سے استفادہ کیا اور ضیاء الدین خان اور ان کی لائبریری کی مدد سے اپنی معروف تاریخ مرتب کی۔ دیباچے میں انھوں نے نواب مذکور کی مساعی کا اعتراف کیا ہے [3]۔

غدر کے بعد انھوں نے پھر کتب جمع کرنا شروع کیں اور خاصا ذخیرہ کتب فراہم کر لیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے سعید الدین احمد خان نے یہ ذخیرہ ندوۃ العلماء کو عطیہ کر دیا [4]۔

ٹامس مٹکاف کے پاس بھی ایک بڑا ذخیرہ کتب تھا۔ اس کا ایک حصہ مٹکاف محل میں تھا جبکہ دوسرا حصہ دلکشا باغ میں جو قطب مینار کے نزدیک واقع تھا۔

مسٹر مٹکاف کی بیٹی لکھتی ہیں کہ میرے والد اپنی تمام کتب کو خوبصورت روسی چڑے سے جلد بندی کراتے تھے۔ وہ ہر سال انگلستان سے کتابوں کا ایک بڑا صندوق منگواتے تھے۔ ہندوستان میں اپنے چالیس سالہ قیام کے دوران انھوں نے پچیس ہزار کتب پر مشتمل ایک لائبریری قائم کر لی تھی جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں غارت ہوگئی [5]۔

حسب الحکم میجر فلر صاحب بہادر ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک پنجاب

یہہ دو رسالی نامزد

بہ نکات غالب و رقعات غالب

تصنیف جناب نواب اسد اللہ خان غالب

محمد سجاد علیخان کی مطبع سراجی مین طبع ہوئی

'نکات و رقعات غالب' طبع اوّل۔ ۱۸۶۷ء کی لوح

برسبیل تذکرہ یہ بتاتا چلوں کہ مسٹر مٹکاف ان معدودے چند انگریزوں میں سے تھے جو اپنے تمام خاندانی نوادر انگلستان سے ہندوستان لے آئے تھے۔ وہ نپولین کے ایک بڑے مداح تھے۔ مٹکاف محل میں ایک نپولین گیلری تھی جس میں نپولین بونا پارٹ کے نوادر جمع کیے گئے تھے اور اس میں نپولین کے کئی مجسمے اور نایاب تصاویر بھی تھیں[6]۔

ایک کتب خانہ دہلی کالج کا تھا۔ دہلی کالج کی ورنیکلر سوسائٹی نے سو سے زیادہ ترجمے اور کئی دیگر کتب چھاپیں[7]۔

کشمیری دروازے میں دارالشکوہ کے محل کے اندر شاہی کتب خانہ تھا۔ اسی عمارت میں انگلش سوسائٹی کا دفتر بھی تھا۔ کلکتہ سے انگریزی کتابیں یہاں آتیں اور ترجمہ ہوکر ہاتھوں ہاتھ لے لی جاتیں۔ بنگال میں اسی نام کی سوسائٹی محض ادبی تھی لیکن دلی کی سوسائٹی پر سائنسی رنگ غالب تھا[8]۔

قلعے میں مکتبہ سلطانی تھا، جس کی کتب سے بیرونِ قلعہ کے تشنگانِ علم بھی مستفید ہوتے تھے۔ یہاں مطبع سلطانی بھی تھا جس نے ظل الٰہی کے دیوان کے علاوہ کئی دیگر گراں بہا کتب طبع کیں۔ ولی عہد بہادر مرزا فخرو کے نام سے فخر المطابع تھا[9]۔

اردو بازار میں کتابوں کی دکانیں تھیں۔ کئی کاتب تھے جو کتب نقل کر کے فروخت کرتے تھے۔ کئی حضرات کرائے پر کتب قارئین کو فراہم کیا کرتے تھے۔

مولانا حالی لکھتے ہیں:

''جس طرح مرزا نے تمام عمر رہنے کے لیے مکان نہیں خریدا اسی طرح مطالعے کے لیے بھی، باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزری، کبھی کوئی کتاب نہ خریدی۔ الا ماشاءاللہ۔ ایک شخص کا یہی پیشہ تھا کہ کتب فروشوں کی دکانوں سے لوگوں کو کرائے کی کتابیں لا دیا کرتا تھا۔ مرزا ہمیشہ اسی سے کرائے پر کتابیں منگوایا کرتے تھے اور مطالعے کے بعد واپس کر دیتے تھے''[10]۔

غالب کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی تصانیف کے علاوہ دیگر کتب خرید کر یا کاتبوں سے نقل تیار کروا کر دوستوں کو ارسال کیا کرتے تھے۔

غالب نے اپنے مکاتیب میں جن کتب کا ذکر کیا ہے عاشقانِ غالب کی دلچسپی کے لیے ان کی ایک فہرست درج کی جاتی ہے۔

اکبر نامہ..... ابطال ضرورت..... بوستانِ سعدی..... بہارِ عجم..... بوستانِ خیال..... بیان بخشائش..... انشائے خلیفہ..... تحفۃ العراقین.....تاریخ ابوالفداء.....تذکرہ صہبائی.....تو زک تیموری..... جامع التواریخ..... حدیقۃ الحقیقۃ..... حدائق الانظار..... جام جہاں نما..... حبیب السیر ..... چیستان..... داستانِ امیر حمزہ..... دساتیر..... دبستان المذاہب .....دیوانِ حیا.....دیوانِ ناسخ.....دیوانِ کلیم.....دیوان

تفتہ.....دیوانِ ناظم.....دیوانِ حافظ.....دیوانِ نظامی.....دیوانِ صائب.....رقعاتِ عالمگیری.....ردِعقائد وہابیہ.....روضۃ الصفاء.....سیر المتاخرین.....سروشِ سخن.....سکندر نامہ.....شرف نامہ.....سنبلستان.....شاہ نامہ فردوسی.....شعاعِ مہر.....ظفر نامہ.....عجائب القصص.....سفر نامہ سیاح.....فرہنگ رشیدی.....فرہنگ سروری.....فرہنگ جہانگیری.....فرہنگ لغات دساتیر.....فسانۂ عجائب.....قابوس نامہ.....گلستانِ سخن.....گلزار سرور..... قاموس و صراح.....گلشن بے خار..... مراۃ الصحائف.....مصطلحات الشعراء.....مطلع السعدین..... موید برہان.....بحرِ قاطع برہان.....معتزنامہ.....[11]۔

ایک عہد تھا جب اکبرِ اعظم نے پرنٹنگ پریس لگانے کی تجویز یہ کہہ کر رد کر دی تھی کہ وہ اپنے خوشنویسوں کو بے روزگار نہیں کرنا چاہتے لیکن دتی کے اس عہدِ زوال میں یعنی اکبر شاہ ثانی کے دور میں یہاں کئی مطابع قائم ہو چکے تھے اور طباعتِ کتب کا کام زور و شور سے جاری تھا۔

ابوظفر بہادر شاہ کا پہلا دیوان ۱۸۴۵ء میں مطبع سلطانی نے چھاپا۔ دیوانِ ثانی ۵۰۔۱۸۴۹ء میں اسی مطبع سے شائع ہوا۔ ایک ایڈیشن مولوی محمد باقر نے مطبع دہلی اردو اخبار سے دیوانِ حضور والا کے نام سے چھاپا۔ اس کے صفحۂ اول پر یہ عبارت تحریر ہے۔ ''یہ دیوان اوّل مطبع سلطانی میں چھپا تھا مگر اکثر جگہ صحت کو نہ پہنچا تھا سو اب مکرر بہ تصحیح افصح الفصحاء ابلغ البلغاء خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق دام برکاتہم بندہ خاکسار پنڈت موتی لعل پرنٹر و پبلشر مطبع دہلی اردو اخبار مکان مولوی محمد باقر صاحب میں چھپا ہوا۔''[12]

دیوان سے قبل تصوف پر بہادر شاہ ظفر کی ایک کتاب خیابانِ تصوف مطبع سلطانی سے ۱۸۴۳ء میں شائع ہوئی۔ اس سے قبل بہادر شاہ لغات اور اصطلاح کے موضوع پر ایک کتاب تالیفاتِ ابوظفری ۱۸۱۱ء میں اور گلستانِ سعدی کی متصوفانہ شرح ۱۸۱۲ء میں مکمل کر چکے تھے جو ضائع ہو گئیں[13]۔

غالب فرماتے ہیں:

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسروؔ سراج الدین کو غالبؔ

سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ کی تالیفات کا ذکر ہو چکا اب ذرا ان کے مرید کی تصانیف و تالیفات پہ نظر ڈالیں۔

اکتوبر ۱۸۴۱ء	دیوانِ اردو کا پہلا ایڈیشن' مطبع سید الاخبار دہلی سے طبع ہوا۔
۱۸۴۵ء	دیوانِ فارسی' مطبع دارالسلام دتی نے شائع کیا۔
۱۸۴۷ء	دیوانِ اردو کا دوسرا ایڈیشن' مطبع دارالسلام ہی نے چھاپا۔
۵۵۔۱۸۵۴ء	مہرِ نیمروز۔ فخر المطابع دتی' سے شائع ہوئی اور ایک ہی سال میں تین بار شائع ہوئی۔

۱۸۵۶ء	قادر نامہ غالب۔ مطبع سلطانی دہلی میں طبع ہوا۔
۱۸۵۸ء	دستنبو۔ مطبع مفید خلائق آگرہ میں طبع ہوئی۔
۱۸۶۱ء	دیوان اردو کا تیسرا ایڈیشن مطبع احمدی دہلی نے چھاپا۔
۱۸۶۲ء	قاطع برہان' طبع اول مطبع نولکشور لکھنؤ۔
۱۸۶۲ء	چوتھا ایڈیشن دیوان اردو مطبع نظامی کان پور
۱۸۶۲ء	پانچواں ایڈیشن دیوان اردو مطبع مفید الخلائق آگرہ
۱۸۶۳ء	کلیات فارسی دوسرا ایڈیشن مطبع نولکشور لکھنؤ
۱۸۶۳ء	مثنوی ابر گہر بار۔ اکمل المطابع دلّی
۱۸۶۴ء	قادر نامہ۔ دوسری اشاعت اور لطائف غیبی' مجلس پریس دلّی
۱۸۶۵ء	سوالات عبدالکریم۔ اکمل المطابع دلّی
۱۸۶۵ء	دستنبو۔ دوسرا ایڈیشن لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ
۱۸۶۵ء	درفش کاویانی۔ اکمل المطابع دلّی
۱۸۶۷ء	دعائے صباح۔ منظوم فارسی ترجمہ مطبع نولکشور لکھنؤ
۱۸۶۷ء	تیغ تیز۔ اکمل المطابع دلّی
۱۸۶۷ء	نکات واقعات غالب۔ مطبع سراجی دلّی
۱۸۶۷ء	سبد چین۔ مطبع محمدی دلّی
۱۸۶۸ء	کلیات نثر فارسی۔ مطبع نولکشور لکھنؤ
۱۸۶۸ء	عود ہندی۔ مطبع مجتبائی میرٹھ (۲۷/اکتوبر)
۱۸۶۹ء	اردوئے معلّٰی۔ اکمل المطابع دلّی (۶ مارچ وفات کے ۱۹ دن بعد)[14]۔

حوالہ جات

1-2 خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
3- حواشی خطوط غالب مہر۔
4- تلامذہ غالب از مالک رام

5- Twilight of the Mughals. Spear

6- ایضاً

7- مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق

8- Twilight of the Mughals. Spear.

9- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔

10- یادگارِ غالب از الطاف حسین حالی۔

11- خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔

12-13- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔

14- غالب درونِ خانہ از کالی داس گپتا رضا

دہلی اردو اخبار.....مولوی محمد باقر.....
ایک صحافی.....ایک مجاہد آزادی

"میر احمد حسین ولد میر روشن علی خان نے مجھ سے کہا کہ حضرت جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو میں مرشد آباد میں تھا وہاں میں نے یہ سکہ سنا تھا۔ان کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبر وفات اکبر شاہ و جلوس بہادر شاہ چھاپا تھا اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء میں ہوا ہے۔ بعض صاحب اخبار جمع رکھتے ہیں۔اگر وہاں اس کا پتہ پاؤ گے اور وہ پرچہ اخبار اصل بجنسہٖ مجھ کو بھجواؤ گے تو بڑا کام کرو گے۔"[1]

یہ خط ۱۸ جون ۱۸۵۹ء کو غالب نے نواب حسین مرزا کو لکھا تھا۔ گوری شنکر نامی جاسوس نے اپنے روزنامچے میں لکھا کہ اسد اللہ خان غالب نے یہ سکہ کہہ کر گزرانا تھا:

بہ زر زد سکۂ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

کمشنر دہلی نے غالب کو طلب کر کے دریافت کیا تو غالب نے اس الزام سے انکار کیا اور کہا کہ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا کاغذ کہیں دفتر میں ہونا چاہیے اور یہ بھی کہا کہ حکیم احسن اللہ خاں سے پوچھ لیجیے۔ کمشنر اس وقت تو چپ رہا لیکن روبکار میں لکھ گیا کہ یہ جو اسد اللہ خان فارسی کا عالم مشہور ہے۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس نے سکہ بھی لکھا۔[2]

ایک اخبار اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلاں تاریخ اسد اللہ خاں غالب نے یہ سکہ کہہ کر گزرانا

بہ زر زد سکۂ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

مجھ سے علاالملاقات کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر، خدا جانے کس نے کہا۔" (غالب بنام نواب حسین مرزا ۱۸ جون ۱۸۵۹ء)[2A]

اس حوالے سے غالب مولوی محمد باقر کے ''دہلی اردو اخبار'' کا ۲۲ سال پرانا پرچہ ہندوستان کے طول و عرض میں تلاش کر رہے تھے کیونکہ غالب کا خیال تھا کہ یہ عبارت سکہ جلوس کی ہے جبکہ غدر کے دوران جو سکہ لکھا گیا اس کی عبارت تھی۔

بہ زر زد سکہ نصرت طرازی
سراج الدین بہادر شاہ غازی

بہر حال اخبار دستیاب نہ ہوا اور غالب راندۂ دربار انگلیسی رہے۔ لیکن اس خط سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۳۷ء میں مولوی محمد باقر کا دہلی اردو اخبار شائع ہوا کرتا تھا اور غالب اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔

مولوی محمد باقر کے جد امجد محمد شاہ کے عہد میں ایران سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے تھے۔ ان کے والد خلیفہ محمد اکبر اٹک اٹک کر اردو بولتے تھے۔ محمد باقر نے دہلی کالج کے شعبہ علوم شرقیہ میں تعلیم پائی۔ معمولی سرکاری ملازمت سے آغاز کیا پھر ملازمت ترک کی اور صحافت کے ہو کر رہ گئے۔

دہلی کالج نے نئے نصابات کی طباعت اور مغربی فلسفہ اور سائنس کے اردو تراجم کے فروغ کے لیے چھاپہ خانہ لگایا۔ اس چھاپہ خانہ میں سو سے زیادہ کتب چھاپی گئیں لیکن معاشی طور پر یہ ایک بوجھ ثابت ہوا کیونکہ کالج سے باہر اس کی طبع کردہ کتب کی زیادہ مانگ نہ تھی۔ نیز طباعت پر بھاری خرچ اٹھتا تھا چنانچہ پرنسپل مسٹر ٹیلر اس سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ سوا سے اونے پونے داموں فروخت کر دیا گیا۔ خریدار تھے مسٹر ٹیلر کے دوست مولوی محمد باقر۔ ۱۸۳۶ء میں یہ پریس مولوی محمد باقر کی اندرون کشمیر دروازہ واقع حویلی میں نصب کیا گیا اور اس پر ''دہلی اخبار'' کی طباعت کا آغاز ہوا۔ یہ شمالی ہند کا اولیں اردو اخبار تھا[3]۔

برصغیر کا پہلا اردو اخبار کلکتہ سے شائع ہونے والا جام جہاں نما تھا۔ دہلی اردو اخبار کا سالانہ چندہ بیس روپے تھا جو اس دور میں ایک بڑی رقم تھی چنانچہ اسے صرف خوشحال طبقہ ہی خرید سکتا تھا۔ اخبار میں محض خبریں ہی نہ چھپتی تھیں بلکہ اس کا ایک حصہ ادب کے لیے بھی مختص تھا۔ شہزادہ جواں بخت کے سہرے کے حوالے سے ذوق اور غالب کی معرکہ آرائی کی مفصل رپورٹ اس اخبار میں چھپی[4]۔

۱۸۳۰ء میں مسٹر ٹیلر کے مشورے سے مولوی محمد باقر نے غیر ملکی تاجروں کے لیے ایک سرائے اور ایک نیلام گھر تعمیر کیا تھا۔ باہر سے آنے والے تاجر اپنے مال کے نمونے یہاں نمائش کے طور پر رکھتے تھے۔ یہ سرائے ولایتی مال کی ایک بڑی منڈی کی حیثیت اختیار کر گئی جس سے مولوی محمد باقر کے خاندان کے تمول میں خاصا اضافہ ہوا[5]۔

۱۰ جون ۱۸۳۰ء کو مولوی محمد باقر کے گھر ایک بچے نے جنم لیا جس کا نام محمد حسین رکھا گیا اور جو بڑا ہو کر شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے نام سے مشہور ہوا۔ آزاد نے ۱۸۴۷ء میں دہلی کے شعبہ علوم شرقیہ میں داخلہ لیا۔ انہوں نے استاد محمد ابراہیم ذوق کی شاگردی بھی اختیار کی جو ان کے والد کے انتہائی قریبی دوست تھے[6]۔

مولوی محمد باقر نے ایک مسجد اور ایک امام بارگاہ تعمیر کرائے۔ مسجد ''کھجور والی مسجد'' کے نام سے مشہور تھی۔ امام باڑہ غدر کے بعد انگریزوں نے منہدم کردیا[7]۔

غالب ۲۸ جولائی ۱۸۵۴ء کو یوسف میرزا کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے ایک بنائے قدیم رفیع مشہور ہے۔ اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا۔''[8]

مولوی محمد باقر نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں بھرپور حصہ لیا۔ انہوں نے اپنے اخبار کا نام بدل کر ''اخبار الظفر'' رکھ دیا کہ حضور والا نے ازراہ کمال رافت و ظرفت ''اخبار الظفر'' بہ دستخط خاص مرحمت فرمایا[9]۔

''دہلی اردو اخبار'' میں مولوی محمد باقر نے جہاد کا فتویٰ بھی شائع کیا۔ متن کچھ یوں تھا:

استفسار

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ انگریز دہلی پر چڑھ آئے ہیں اور اہل اسلام کے جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو فرض عین ہے یا نہیں؟ اور جو لوگ شہروں اور بستیوں میں رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد فرض ہے یا نہیں؟ بیان کرو:

جواب:

درصورت مرقومہ فرض عین ہے اوپر اس شہر کے تمام لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے۔ اس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلے اور لڑائی کی ہے اور بہ سبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک ہے اور اطراف و حوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر فرض کفایہ۔ اور اگر اس شہر کے لوگ عاجز ہو جائیں مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا[10]۔

جہاد بالقلم کے ساتھ ساتھ مولوی محمد باقر نے جہاد بالسیف میں بھی حصہ لیا۔ مخبروں کے روزنامچوں میں ان کے فوجی دستوں کی قیادت کرنے کی اطلاعات بھی ملتی ہیں۔

جیون لال کا روزنامچہ..... ۷ مئی..... ایک سپاہی نے آ کر بیان کیا کہ کئی لاکھ خزانہ پیدل فوج کی ایک پلٹن اور چند سواروں کی زیر حفاظت گڑگاؤں سے دہلی آ رہا ہے اور یہ کہ میواتیوں کی ایک جماعت نے ان پر حملہ کر دیا ہے اور میں امداد کے لیے بھاگ کر آ گیا ہوں۔ مولوی باقر نے پیدل فوج کی دو پلٹنوں اور سواروں

کے ایک دستہ کو حکم دیا کہ جا کر خزانہ کی حفاظت کریں[11]۔

۴ جون

ایک سوار نے خبر دی کہ جو پلٹن گڑ گاؤں سے خزانہ لا رہی تھی اس پر میواتیوں نے حملہ کر دیا ہے۔ مولوی محمد باقر کے نام فوراً احکام جاری کیے گئے کہ پیدل فوج کی دو پلٹنوں اور سواروں کے ایک دستہ کو ساتھ لے جا کر خزانہ کی حفاظت کرو[12]۔

جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مولوی محمد باقر کو بغاوت کے مقدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کے قتل کی سازش میں شامل ہونے کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی اور پھانسی پر لٹکا دیا گیا[13]۔

مسٹر ٹیلر نے دیگر یورپین حضرات کے ساتھ دہلی میگزین میں پناہ لے رکھی تھی۔ میگزین پھٹا تو وہ حواس باختہ ہو کر بھاگ نکلے اور کالج کے احاطہ میں واقع اپنے خانساماں کی کوٹھڑی میں جا چھپے جس نے بعد میں انہیں مولوی محمد باقر کے گھر پہنچا دیا۔ مولوی محمد باقر ان کے گہرے دوست تھے۔ مسٹر ٹیلر بھی ان کے بہی خواہ تھے۔ ان کے مالی معاملات تک میں دلچسپی لیتے تھے اور ان کی مدد کرتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب نے ایک رات انہیں اپنے امام باڑہ کے تہہ خانے میں رکھا اور اگلے دن یہ بتا کر کہ محلے کے لوگوں کو خبر ہو گئی ہے اور ٹیلر صاحب کی جان خطرے میں ہے انہیں ہندوستانی لباس پہنا کر چلتا کیا۔ وہ چند قدم ہی گئے ہوں گے کہ ایک مشتعل ہجوم نے انہیں گھیر لیا اور لاٹھیاں برسا برسا کر ہلاک کر دیا[14]۔

مولوی محمد باقر کے فرزند محمد حسین آزاد جو اخبار کے مدیر بھی تھے ان کا وارنٹ بھی جاری ہوا۔ وہ فرار ہو گئے۔ پہلے لکھنؤ اور پھر پنجاب میں پوشیدہ رہے۔ آخر کار معافی تلافی ہو گئی۔

قلعہ معلی میں مالی بدعنوانی اور بدانتظامی کے حوالے سے دہلی اردو اخبار کی ایک خبر کا انداز ملاحظہ کیجیے:

"سنا جاتا ہے کہ تنخواہ کی بڑی داویلا ہو رہی ہے۔ چھ مہینے میں دو مہینے بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ اور اس پر کوتی کا دم چھلا لگا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ مختار برائے نام ہے۔ ایک حکیم کا محکمہ بڑا گرم سنا جاتا ہے یا دو ایک بنیوں کی بن آئی ہے۔"[15]

مختار نواب سید حامد علی تھے جن سے مولوی محمد باقر کے ذاتی اختلافات تھے اور "ایک حکیم" احسن اللہ خاں ہیں ان سے بھی مولوی صاحب کی نہیں بنتی تھی لیکن بدانتظامی بہر حال تھی۔

۱۸۵۳ء میں "دہلی اردو اخبار" میں چند ایسی خبریں شائع ہوئیں جن کے اثرات ۱۸۵۷ء کے بعد بہادر شاہ ظفر کے مقدمے پر مرتب ہوئے لیکن ان ایام میں بھی یہ خاصی ہنگامہ خیز تھیں۔

۴ستمبر ۱۸۵۳

"چہار شنبہ کو حضور والا نے نقشا ایک علم کا' بیت تحفہ اپنے ہاتھ سے مع طغرائے اسم مبارک حضرت عباس علیہ السلام کے کھینچ کر کاری گروں کو دیا اور حکم ہے جلد تیار کرو اور صاحب عالم مرزا انور الدین بہادر سے حضور والا نے فرمایا کہ تم جا کر لکھنؤ میں بآ داب شائستہ درگاہ میں جناب عباس علیہ السلام کے چڑھا کر جلد پھر حضور میں حاضر ہو۔ سنا جاتا ہے کہ اس کی بشارت ہوئی تھی [16]۔

۱۹ اکتوبر ۱۸۵۳ء کی ایک خبر ہے:

بدھ کے دن مرزا عالی بخت کے مکان میں بادشاہ شریک مجلس ہوئے اور دیر تک مرثیے سنے اور آپ بھی فضیلت آئمہ بیان کرتے رہے اور جمعرات کو علم جو حضور والا نے تیار کرایا ہے اور وہ بہت خوب صورت بن کر آیا ہے۔ حضور والا نے کمال آداب وقرینے سے اپنے سر مبارک پر رکھا اور صاحب عالم مرزا نور الدین بہادر کو وہ علم سپرد کر کے بہ سبیل ڈاک لکھنؤ رخصت کیا.....

ہر چند علم مبارک کے بنانے پر اکثر آلِ تیمور مغفور مانع بھی رہے مگر حضور نے کسی کی بھی نہ سنی اور جو ذہن مبارک میں آیا وہی کیا۔ بعض لوگ اس بات سے بہت رنجیدہ ہوئے کہ حضور والا سے ان کے برخلاف یہ امر جلیل ہوا ہے بلکہ حضور والا نے اکثر اپنی زبان مبارک سے حاضرین دربار معلیٰ سے فرمایا کہ اکثر آلِ تیمور اور اشخاص نے مجھ سے عرض کی کہ اس علم مبارک کو بنانے میں اور لکھنؤ بھیجنے میں' آپ رافضی مشہور ہوں گے۔ میں نے جواب دیا مجھ کو الفت پنجتن پاک میں یہ سب باتیں منظور ہیں۔ اگر ان کی محبت سے آدمی رافضی ہوتا ہے تو جو جس کا جی چاہے کہے' کہنے والے اپنا سا منہ لے کے رہ گئے۔" [17]

ان خبروں کے چھپنے اور علم چڑھائے جانے کے بعد لکھنؤ میں اٹھنے والی مسرت کی لہر سے یہ شور اٹھا کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے' چنانچہ سنی علماء نے بادشاہ سے وضاحت چاہی۔ بادشاہ نے اس خبر کو نادرست قرار دیا اور مہر شاہی سے شیعیت سے انکار کا شقہ جاری کیا اور ایک مثنوی اس موضوع پر میرزا غالب سے بھی لکھوائی۔ لکھنؤ کے مجتہد العصر کے نام خط میں مرزا نے لکھا کہ میں ملازمِ شاہی ہوں۔ جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ اس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خان کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں..... [18]۔

انگریزوں نے اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے کہ کہیں دہلی اور اودھ کی حکومتوں کے درمیان کوئی افہام وتفہیم اور اتحاد کی صورت پیدا نہ ہو جائے' اس بات کی کوشش کی کہ بادشاہ پر اتہام شیعیت کی تردید شائع کی جائے۔ سمپسن فریزر نے "دستور العمل اودھ" میں ایک خط میں لکھا:

"مرزا سلمان شکوہ کے پوتوں نے..... بندگانِ والا کو رافضی مذہب قبول کرنے سے بدنام کیا اور

متہم کیا یہ سب غلط و بے اصل وافترو بہتان ہے۔"[19]

لطف کی بات یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش ناکام کے بعد انگریزوں نے بہادر شاہ پر الزام لگایا کہ بغاوت ایک سوچی سمجھی سکیم تھی۔ بادشاہ نے شیعہ مذہب قبول کرلیا تھا۔ ایران کے ساتھ بادشاہ کی خط و کتابت چل رہی تھی۔ یوں دہلی، اودھ اور ایران کی شیعہ مثلث قائم کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ منشی مکند لال اور حکیم احسن اللہ خان نے اس امر پر گواہیاں بھی دیں۔"[20]

ایک اور دلچسپ بات یہ کہ دہلی اردو اخبار کے مالک مولوی محمد باقر جن کے اخبار میں چھپنے والی مذکورہ بالا خبروں نے اس ہنگامے میں خاصی تیزی پیدا کی خود شیعہ علماء کے ایک فتوے کی رو سے کافر قرار پائے تھے۔ اس موضوع پر ایک مبسوط رسالہ چھپا تھا۔

"رسالہ مسماۃ بارشاد المومنین متضمنہ فتاویٰ حضرات مجتہدین بیچ مقدمہ خارج ہوجانے محمد باقر مالک اردو اخبار کے دائرہ ایمان سے بیچ تاریخ پانچویں ماہ رجب ۱۲۷۰ ہجری کے۔"[21]

بات شروع ہوئی تھی غالب کے اردو اخبار کے قاری ہونے سے' آیئے دیکھیں غالب اور کون کون سے اخبارات ورسائل پڑھا کرتے تھے۔

زبدۃ الاخبار:

میں نے "زبدۃ الاخبار" میں دیکھا کہ رانی صاحبہ مرگئیں۔ بنام ہرگوپال تفتہ مئی ۱۸۵۲ء۔[22]

بغاوت ہند' معیار الشعراء:

رسالہ بغاوت ہند ماہ بماہ اور "معیار الشعراء" ہر مہینے میں دوبار پہنچتا رہے۔ بنام شیونرائن آرام ۲۲ جولائی ۱۸۵۹ء۔[23]

اودھ اخبار:

یہ اودھ اخبار بھائی ضیاء الدین کے ہاں آتا ہے اور وہ میرے پاس بھیج دیا کرتے ہیں۔ بنام شیونارائن آرام ۱۳ نومبر ۱۸۵۹ء۔[24]

اکمل الاخبار:

ایک عبارت رنگین مرتب کرکے اکمل الاخبار میں میں نے چھپوا دی ہے۔ بنام نواب ابراہیم علی خان وفا ۱۸۶۸ء۔

اشرف الاخبار:

محمد میرزا خان میرے سبھی بھائی کا نواسہ ہے۔ اس نے ایک اخبار نکالا ہے۔ مسمّیٰ بہ اشرف الاخبار۔ بنام میاں داد خاں سیاح ۱۲ فروری ۱۸۶۷ء۔[25]

دبدبۂ سکندری:

اسد اللہ ہر ہفتے دبدبہ سکندری کے معائنے سے سرور اٹھاتا ہے۔ بنام محمد حسین خاں ۱۱ اپریل ۱۸۶۷ء۔

آئینۂ سکندر اور جامِ جہاں نما:

میری آنکھیں آئینہ سکندر کے مشاہدے سے روشن ہوئیں.....[26] اس دیار کے رہنے والے جامِ جہاں نما کی نامعتبری سے بدول ہیں۔ بنام سراج الدین[27]۔

اسعد الاخبار، صادق الاخبار:

اس کو آگرہ بھیجیے تاکہ اس کو اسعد الاخبار میں اور زبدۃ الاخبار میں چھاپا جائے..... میں نے یہاں صادق الاخبار میں چھپوا دیا ہے۔ بنام ہرگوپال تفتہ اگست ۱۸۵۰ء۔[28]

حوالہ جات

1- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
2- فسانۂ غالب از مالک رام۔
2A- خطوط غالب غلام رسول مہر۔
3- محمد حسین آزاد احوال و آثار از ڈاکٹر محمد صادق۔
4- خیابانِ غالب از نادم سیتاپوری۔
5-6-7- محمد حسین آزاد احوال و آثار از ڈاکٹر محمد صادق۔

8- خطوطِ غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔
10-9- محمد حسین آزاد احوال و آثار از ڈاکٹر محمد صادق۔
12-11- جنگ آزادی 1857ء کے دو خفیہ روزنامچے۔ معین حسن خان، جیون لال۔
13- محمد حسین آزاد احوال و آثار از ڈاکٹر محمد صادق۔
14- مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق۔
15- بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین لاہوری، بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔
17-16- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔
18- یادگارِ غالب از الطاف حسین حالی۔
19- بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔
20- چراغ دہلی از مرزا حیرت دہلوی۔
21- محمد حسین آزاد۔ احوال و آثار از ڈاکٹر محمد صادق۔
22 تا 25 خطوط غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔
26- پنج آہنگ از مرزا اسد اللہ خان غالب۔
28-27- خطوطِ غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔

غالب پسِ دیوارِ زنداں.....دلّی کی انتظامیہ، عدلیہ، رائے عامہ اور صحافت

پاسباناں بہم آئید کہ من می آیم
درِ زنداں بکشائید کہ من می آیم
(غالب)

مئی ۱۸۴۷ء کے اواخر کی کوئی شام تھی کہ ایک باپردہ پالکی غالب کے گھر کے دروازہ پر رکی اور کہاروں نے اسے محل سرا میں داخلے کے دروازے کے اندر اتارا، جہاں مہمان خواتین کو اتارا جاتا تھا۔ دربان نے باپردہ خواتین کو دیکھ کر دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔ برقعہ پوش پولیس والے بمعہ کوتوال شہر فیض الحسن، زنان خانے سے ہوتے ہوئے غالب کے کمرے میں داخل ہوئے جہاں چوسر کی بازی چل رہی تھی۔ دیگر لوگوں کو جو معززین شہر میں سے تھے، کھسک جانے کا موقع فراہم کیا گیا جبکہ غالب کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا[1]۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوئی معشوق بھی تھا اس پردہ زنگاری میں.....رقابت کی وجہ سے کوتوال شہر غالب سے ذاتی عناد رکھتا تھا۔ مجسٹریٹ نے غالب کو چھ ماہ قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانہ کی سزا سنائی۔

”مرزا اسد اللہ خان غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا، اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپے جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ ماہ قید میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ مقررہ جرمانے کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو جائے گی۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصے سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے، تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مشقت اور مصیبت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ

ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر سیشن جج کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمے پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل وانصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جن کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے معمولی جرم میں اتنی سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہو۔"

(احسن الاخبار، دہلی ۲ جولائی ۱۸۴۷ء)[2]

"عمدۃ الاخبار" ۵ جولائی ۱۸۴۷ء کی خبر کے مطابق سیشن جج نے قمار بازی سے متعلق مجسٹریٹ کے حکم کی توثیق کر دی ہے[3]۔

اس واقعہ سے چند روز قبل دہلی کے اخبارات میں امتناع قمار بازی کے متعلق اعلانات شائع ہوئے تھے اور کوتوال فیض الحسن کا اعلان بھی کہ وہ دلّی سے جوئے کی وبا کا خاتمہ کر کے رہے گا[4]۔

مولانا حالی "یادگار غالب" میں لکھتے ہیں کہ مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی عادت تھی اور چوسر جب کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ اسی چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ ہجری میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گزرا۔۔۔۔ یہ واقعہ مرزا صاحب پر نہایت شاق گزرا تھا۔ اگرچہ منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے جوان کو قید خانے میں گزرے ان کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہوئی۔ وہ بالکل قید خانے میں اسی آرام سے رہے جیسے گھر پر رہتے تھے۔ کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسب دلخواہ گھر سے ان کو پہنچتی تھیں۔ ان کے دوست ان سے ملنے جاتے تھے اور وہ صرف بطور نظر بندان کے جیل جانے کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے مگر چونکہ اس وقت تک شہر کے شرفاء واعیان کے ساتھ کبھی اس قسم کا سلوک مرزا نے نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ اس کو ایک بڑی بے آبروئی کی بات سمجھتے تھے۔"[5]

مولانا حالی جن سہولیات کا ذکر کر رہے ہیں شاید اس طرح ہو یا شاید نہ ہو۔۔۔۔ کیونکہ غالب نے زندان میں معائنے کے لیے آنے والے ڈاکٹر کی طرف سے حال پوچھنے پر کہا تھا:

ہم غمزدہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اور پھر ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ میں غالب کی رہائی کی سفارش کی تھی۔۔۔۔[6]

احسن الاخبار کی مذکورہ بالا خبر میں مجسٹریٹ کے فیصلے کو عدل وانصاف کے منافی قرار دیا گیا تھا اور یہی رائے شہر کے بے شمار لوگوں کی تھی۔ لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو اس فیصلے کے حامی تھے۔ شہر دو کیمپوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک طرف انتظامیہ انگریز اور علماء۔۔۔۔ دوسری طرف رائے عامہ اور اس خلق خدا کے ساتھ ان کا بادشاہ بھی تھا جس نے غالب کے حق میں سفارش کی جو نہ مانی گئی۔

۲۵جون ۱۸۴۷ء کا ''احسن الاخبار'' کہتا ہے:

''مرزا اسداللہ خان بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر (ریذیڈنٹ) کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کیا جائے۔ معزز ین شہر میں سے ہیں' جو کچھ ہوا محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوج داری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے' ایسی حالت میں قانون سفارش قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔''[7]

استاد ذوق کے دوست مولوی محمد باقر کے اخبار میں اس واقعے کی خبر جس انداز میں چھپی اسے آج کی صحافتی زبان میں بہ آسانی زردصحافت کہا جاسکتا ہے۔

''سنا گیا کہ ان دنوں گزر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے۔ مثل ہاشم خان وغیرہ کے جو سابق بڑی علتوں میں دورہ تک سپرد ہوئے تھے۔ بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بسبب رعب و کثرت مردان کے یا کسی طرح سے کوئی تھانے دار دست انداز نہیں ہوسکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے مقرر ہوا ہے۔ یہ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی رئیس زادہ نواب شمس الدین قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانیدار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی و سفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا عدالت سے جرمانہ علیٰ قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے نہ ادا کریں تو چار مہینہ قید۔ لیکن ان تھانیدار کی خدا خیر کرے' دیانت کو تو کام فرمایا انہوں نے لیکن اس علاقہ میں بہت رشتہ دار متمول اس رئیس کے ہیں کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ چھپٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبال جان ہو۔ حکام ایسے تھانیدار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں۔ ایسا آدمی کم یاب ہوتا ہے۔ دہلی اردو اخبار ۱۲ اگست ۱۸۴۲ء۔''[7A]

رالف رسل اور خورشید الاسلام لکھتے ہیں:

''غالب کی گرفتاری عوام میں ایسی بے چینی کا باعث ہوئی کہ بادشاہ جوان سے کوئی خاص التفات نہیں رکھتے تھے' انتظامیہ سے غالب کی رہائی کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہوگئے لیکن ان کو یہ جواب ملا کہ یہ عدالت کا معاملہ ہے اور انتظامیہ اس میں دخل دینے کی مجاز نہیں۔''[8]

غالب کے خلیفہ اول نواب ضیاء الدین احمد خان اور ان کے چار یاروں میں سے ایک نواب امین الدین احمد خان جن کی نواب شمس الدین خان سے مخاصمت کے دور میں غالب نے بھرپور امداد کی تھی اور نواب شمس الدین کے معتوب ٹھہرے تھے' یہاں تک کہ ناسخ کے نام ایک خط میں انہوں نے اپنی جان کو خطرہ در پے ہونے کا ذکر بھی کیا۔ ان دونوں حضرات نے باقاعدہ اخبار میں وضاحت چھپوائی کہ ان کا غالب کے ساتھ کوئی یک جدی رشتہ نہیں۔[9]

غالب کے دوست، مداح اور شاگرد نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے فوراً دو سو پچاس روپے جرمانہ ادا کر کے قید کی میعاد میں اضافے اور دوران اسیری مشقت سے جان چھڑا دی۔ آخر کار رائے عامہ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اور ڈاکٹر کی سفارشی رپورٹ کے بعد نصف سزا پوری ہونے پر مرزا کو رہا کر دیا گیا[10]۔

۲۸ مارچ ۱۸۴۸ء کو تفضل حسین خان کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"آپ نے جو اظہارِ لطف فرمایا ہے اور سرگزشت پوچھی ہے تو سنیے:

کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناآشنا۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوالی کا حاکم ہے لیکن میرے باب میں کوتوالی کا محکوم بن گیا۔ سیشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا، ہمیشہ مجھ سے مہربانی کے ساتھ پیش آتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا لیکن اس نے بھی بے اعتنائی اور بے گانگی اختیار کی۔ صدر میں اپیل کی گئی لیکن شنوائی نہ ہوئی اور وہی فرمان بے داد بحال رہا۔ نجانے کیا صورت پیش آئی کہ جب نصف میعاد ختم ہونے آئی تو مجسٹریٹ کے دل میں رحم آیا۔ اس نے خود اپنے حکم کی منسوخی اور میری رہائی کے لیے صدر سے درخواست کی۔ حکام صدر نے نہ صرف درخواست منظور کی بلکہ مجسٹریٹ کے اس فعل کو سراہا۔ سنا ہے کہ زعمائے قوم نے اس خیرہ سر مجسٹریٹ کو ملامت کی تھی اور میری آزادہ روی اور خاکساری اس پر واضح کی تھی۔ آخر خود میری رہائی کی درخواست کر کے اس نے گویا عذر خواہی کی اور اس کے سوا بھی بہت معذرت اور دلجوئی کا اظہار کیا۔

میں ہر صفت، ہر فعل اور ہر امر کو خدا کی طرف سے مانتا ہوں اور خدا سے جھگڑنا روا نہیں اس لیے جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو گزرنے والا ہے اس پہ راضی ہوں۔ لیکن چونکہ آرزو کرنا آئینِ بندگی کے منافی نہیں:

عشق است و صد ہزار تمنا مراچہ جرم
گر خواہشی کند دل شیدا مراچہ جرم

اس لیے چاہتا ہوں کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے، خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور سنگ آستانہ رحمتہ اللعالمینؐ عاشقوں کی تکیہ گاہ ہے۔ اس کے سوا کیا چاہیے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ قید فرماندگی حیات سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے، نجات پاؤں اور کسی منزل کو مقصود بنائے بغیر سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ تھا بیان اس کا جو مجھ پر گزری ہے اور یہ ہے وہ آرزو جو دل میں ہے۔"[11]

حوالہ جات

1- فسانہ غالب از مالک رام
2-3- بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین لاہوری۔
4- غالب از ناتالیا پری گارینا۔ مکتبہ دانیال کراچی
5- یادگار غالب از الطاف حسین حالی۔
6- فسانہ غالب از مالک رام۔
7- بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین لاہوری۔
7A- ہندوستانی صفحات محمد عتیق صدیقی۔
8-9- غالب از ناتالیا پری گارینا۔
10- یادگار غالب از الطاف حسین حالی۔
11- پنج آہنگ از مرزا اسد اللہ خان غالب۔

گلی قاسم جان، فخر الدولہ، معروف، شمس الدین خان ایک قاتل ایک شہید

اسی بے نور اندھیری سی گلی قاسم سے
ایک ترتیب چراغوں کی شروع ہوتی ہے
ایک قرآن سخن کا صفحہ کھلتا ہے
اسد اللہ خان غالب کا پتہ ملتا ہے

(گلزار)[1]

"قاسم جان کی گلی، میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی میں ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

(غالب بنام عزیز الدین بدایونی ۱۸۵۸ء)[2]

قاسم جان کی گلی کبھی بھی بے نور اور بے چراغ نہ رہی تھی۔۔۔۔کبھی یہاں بے شمار چراغ جھلملاتے تھے اور نور برستا تھا۔

اسد اللہ الغالب حضرت علی ابن ابی طالب کے صاحبزادے حضرت محمد بن الحنیفہ کی نسل میں سے ایک صاحب خواجہ عبدالرحمٰن بلخ کی ریاست میں منتظم دیہات اور مہتمم دار الضرب شاہی کے منصب پر فائز تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے قاسم جان، عالم جان اور عارف جان۔ یہ تینوں بھائی ۱۷۵۰ء کے قریب ترک شہسواروں کا ایک دستہ لیے بخارا سے ہندوستان آئے۔ یہ قافلہ اٹک میں وہاں کے صوبہ دار مرزا محمد بیگ کے ہاں ٹھہرا۔ اسی قیام کے دوران میں مرزا عارف جان کی شادی صوبہ دار کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ ان لوگوں کی شہرت دارالسلطنت پہنچی تو شاہ عالم ثانی نے انہیں طلب کرلیا۔ چنانچہ یہ حضرات دہلی پہنچ گئے۔ دربار میں

پذیرائی ہوئی۔ قاسم جان کے اقبال کا ستارہ بلند ہوا۔ منصب، جاہ وحشم، محل سرائیں.... انھی قاسم جان کے نام پر دہلی کی مشہور گلی قاسم جان ہے۔[3]

جناب حمید اللہ خان لکھتے ہیں: (۱۹۳۸ء)

''چاندنی چوک سے مڑکر بلی ماروں کے اندر کچھ دور تک چلے جائیے تو شمسی دواخانہ کی عمارت اور حکیم محمد شریف خان کی مسجد کے درمیان ایک کشادہ گلی نظر آتی ہے۔ کچھ نئی کچھ پرانی عمارتیں' کچھ سنورتے' کچھ بگڑتے ہوئے مکان ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں..... گلی کے دونوں طرف کی عمارتیں زیادہ تر چھوٹی اینٹ کی پرانی عمارتیں ہیں لیکن جس خاص بات کو آپ ایک سرسری نظر میں محسوس کیے بغیر نہیں رہتے۔ وہ ان نیم منہدم عمارتوں میں اونچی اونچی محرابوں کی کثرت ہے۔ ان بلند محرابوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس گلی کے گذشتہ مکینوں کی زندگی عظمت وشان سے خالی نہ تھی۔ یہ گلی قاسم جان کی گلی کہلاتی ہے اور اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف سے لے کر آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔''

''پہلے قاسم جان کے اقبال کا ستارہ چمکا۔ خود گلی کا نام اس کا شاہد ہے کہ جاہ وثروت کے لحاظ سے قاسم جان اپنے بھائیوں کے سرتاج تھے' لیکن انیسویں صدی کے شروع میں تقدیر ایک بار پھر مسکرائی اور اس مرتبہ عارف جان کا بیٹا لوہارو فیروز پور جھرکہ کی ریاست پر متمکن نظر آیا۔ قاسم جان اور عارف جان کی اولاد اب بھی اسی گلی کی حویلیوں اور محل سراؤں میں موجود ہے..... اسی گلی میں شاید غالب کی پیدائش سے بھی پہلے غالب کے چچا (نصر اللہ بیگ خان) کا عقد عارف جان کی بیٹی (ہمشیرہ الٰہی بخش خان معروف) سے ہوا تھا.....''[4]

اور اسی گلی میں ۱۹ اگست ۱۸۱۰ء کو تیرہ سالہ مرزا نوشہ کی برات عارف جان کے فرزند قاسم جان کے بھتیجے نواب الٰہی بخش خاں معروف کی محل سرا پہ اتری تھی اور مرزا اسد اللہ بیگ خان عرف مرزا نوشہ کا عقد الٰہی بخش خان کی گیارہ سالہ صاحبزادی امراؤ بیگم کے ساتھ ہوا۔[5]

اس کے دو تین سال بعد غالب آگرہ سے ترک وطن کر کے دلّی چلے آئے۔ غالب کی تقریب عروسی کی تفصیل مجھے کسی تذکرے میں نہیں ملی (فقیر کی علمی بے بضاعتی)..... ہاں ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی شادی کا دعوت نامہ جو غالب کے دست مبارک کا تحریر کردہ ہے' نظر سے گزرا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی شادی کی تقریب میں کیا کچھ ہوا ہوگا۔ میرزا یوسف کی شادی غالب کے دلّی آنے کے دو تین سال بعد ہوئی۔

خجستہ انجمن طوے میرزا یوسف — قرار یافت وریں مہ بحکم رب وودو
دو شنبہ بیست و دوم روز از مہ شعبان — دمے کہ مہر نہد سوئے قبلہ سر بسجود
کرم کنند و فزایند زیب بزم نشاط — بہ فر فرخ فرخندہ کی فزائے ورود
بسر برند شب اینجا کہ تاسفیدۂ صبح — ہمیں نظارۂ رقص است و استماع سرود

سپیده دم که ز فیض شمول نکہت گل دمِ نسیم سحر مشکبار خواهد بود
شوند جانب کاشانه عروس رواں به شادمانی بخت مبارک و مسعود
سپس بھمرہی صبح وقت برگشتن سپاسِ بنده نوازی همی تواں افزود[6]

احباب سے گزارش کی گئی ہے کہ پیر ۲۲ شعبان کو غروب آفتاب کے وقت دلہا کے گھر تشریف لائیں اور وہاں شب بسری فرمائیں اور یہ کہ رات بھر محفل رقص وسرود برپا رہے گی۔ صبح کو برات دلہن کے گھر کی طرف روانہ ہوگی اور اسی روز واپس آجائے گی۔

مرزا عارف جان کے صاحبزادے احمد بخش خان ۱۸۶۵ء میں اٹک میں پیدا ہوئے۔ خاندان دلّی منتقل ہوا تو وہ گوالیار میں ملازم ہو گئے۔ پھر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ تجارت کے سلسلے میں اجمیر گئے۔ واپسی پر مہاراجا راؤ بختاور سنگھ والیٔ الور سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے ملازمت کی پیشکش کی تو قبول کر کے ان کے ساتھ چلے گئے۔ جب انگریزوں اور الور کے درمیان معاہدہ دوستی ہوا تو انگریزوں کے ہاں ریاست کے وکیل (سفیر مقرر ہوئے)۔ اسی زمانے میں انگریزوں اور بھرت کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ قلعہ ڈیگ کا محاصرہ ہوا تو احمد بخش خان کی کوششوں سے مہاراجا الور نے رسد اور خوراک کے ساتھ ساتھ سواروں کا ایک دستہ بھی انگریزوں کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ دستے کی کمان خود احمد بخش خان نے کی۔ لسواڑی کی جنگ میں انگریز کمانڈر جنرل فریزر کو گولی لگی۔ احمد بخش خاں نے اسے سنبھالا اور دشمنوں کے نرغے سے نکال کر لے گئے۔ جنرل فریزر زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا' لیکن مرنے سے پہلے وہ احمد بخش خاں کی جانبازی کی روداد اور مناسب انعام کی سفارش قلم بند کر چکا تھا۔

فتح کے بعد لارڈ لیک نے فیروز پور جھرکہ اور کئی نواحی اضلاع بطریق استمرار احمد بخش خاں کو عطا کیے سند میں فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ کے خطابات والقابات تحریر کیے گئے۔ مہاراجا بختاور سنگھ بھی دربار میں موجود تھے۔ انہوں نے پیچھے رہنا راجپوتی شان کے خلاف سمجھا اور لوہارو کا پرگنہ اپنی طرف سے مرحمت کیا۔ غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خان انہی فخر الدولہ کے بہنوئی تھے۔ احمد بخش نے ایک مقامی خاتون مدی سے شادی کی (اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس عورت کو گھر میں ڈال رکھا تھا)۔ اس سے دو لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ بڑا بیٹا شمس الدین خان ان کا جانشین بنا اور بیٹیوں میں سے بڑی بیٹی نواب بیگم' بیگم غالب کے بھانجے اور غالب کے منہ بولے بیٹے زین العابدین خان عارف کے نکاح میں آئیں[8]۔

نواب احمد بخش خان نے بعد ازاں ایک برلاس مغل نیاز محمد بیگ کی صاحبزادی سے شادی کی' جن سے سات بچے ہوئے۔ ان میں سے نواب امین الدین احمد خان' غالب کے خلیفہ ثانی علاؤ الدین احمد خان علائی کے والد اور ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں (غالب کے خلیفہ اول) معروف ہوئے۔ نواب شمس الدین خان کی والدہ کیونکہ منکوحہ نہ سمجھی جاتی تھیں' لہٰذا تمام خاندان اور احباب شمس الدین خان کی جانشینی کے خلاف

تھے چنانچہ ۱۸۲۲ء میں انگریزوں اور دربار الور کی منظوری سے فیصلہ کیا گیا کہ شمس الدین خان فیروز پور جھرکہ کی گدی پر بیٹھیں گے جبکہ لوہارو امین الدین خان اور ضیاء الدین خان کو دی جائے گی البتہ ان کے لیے بڑے بھائی کی اطاعت کرنا ضروری ہوگا۔ اس دستاویز پر جنرل آکٹرلونی اور سرچارلس منکاف نے بطور گواہ دستخط کیے[9]۔ نواب احمد بخش نے اکتوبر ۱۸۲۷ء میں وفات پائی اور قطب صاحب میں دفن ہوئے۔

عارف جان کے ایک اور بیٹے نے بھی خاصی شہرت پائی لیکن وجہ شہرت ذرا مختلف تھی..... یہ تھے نواب الٰہی بخش خان، اسد اللہ خان غالب کے خسر۔ ان کی وجہ شہرت شاعری اور درویشی تھی، معروف تخلص تھا۔ مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں لکھا ہے:[10]

''الٰہی بخش خان معروف تخلص پسر عارف جان جوانِ خوش اختلاط و وجیہ است..... یہ شاگردی میاں نصیر نازش دارد.....''

قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرۂ شعراء ''مجموعۂ نغز'' میں لکھا:[11]

''معروف تخلص الٰہی بخش خاں خلف عارف خان برادر زادہ قاسم خان کہ از امرائے نامدار ایام دولت ذوالفقار الدولہ نجف خان بود..... الٰہی بخش خاں جوانے است خوش خلق وصحبت سیر، نیک خو شیریں کلام، یار باش، خوش معاش، فکرش درست، وکلامش چست، طبع سلیم دارد..... دریں ایام دلش از دنیا سرد گردیدہ..... اکثر اوقات، بیاد رب تعالیٰ می گزارد۔''

نمونہ کلام میں ایک رباعی بھی درج ہے:

اس ماہِ تمام کے تصدق جاؤں
محبوب کے نام کے تصدق جاؤں
معروف اگر پاؤں تو سو جان سے آہ
سلطان نظام کے تصدق جاؤں

سلسلۂ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا فخر الدین اور میر ضیاء الدین کے مرید تھے۔ خود بھی لوگوں کو مرید کرتے تھے۔ نواب احمد بخش خان بھی مولانا فخر الدین کے مرید تھے اور اسی حوالے سے انہوں نے سرکار سے فخر الدولہ خطاب کے حصول پر اصرار کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا نے احمد بخش خان کے والی ریاست بننے کی پیشین گوئی کی تھی۔[12]

الٰہی بخش خان نے پینتیس اور چالیس سال کی عمر کے درمیان ترک دنیا کیا۔ شاعری میں ذوق کے استاد شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کی۔ آزاد کا دعویٰ ہے کہ ذوق سے بھی اصلاح لیتے رہے۔ ۱۸۲۶ء میں انتقال ہوا۔ دو دیوان مرتب کیے۔ دیوان اول ۱۸۳۵ء میں نظامی پریس بدایوں سے طبع ہوا۔ دیوان دوم جو ۴۰۰۰ اشعار پر مشتمل ہے، غیر مطبوعہ ہے[13]۔ ان کی شاعری کا ذکر خطوطِ غالب میں بھی ہے۔ ۲۷ جولائی ۱۸۶۰ء کو علائی

الدین احمد خاں علائی کے نام خط میں لکھتے ہیں:
''پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی، بیت الغزل یہ ہے:

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے [14]

''مرگ اب ناگہانی کہاں رہی۔ اسباب وآثار سب فراہم ہیں۔ ہائے الٰہی بخش خان مغفور کا کیا مصرعہ ہے۔ آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں۔''
(بنام علائی ۳ جولائی ۱۸۶۳ء)[15]

الٰہی بخش خان معروف لکھتے ہیں: ع
تنگیں دل سوا کھووے تو گھر نیلام ہوجائے
(بنام قدر بلگرامی)[16]

ایک بیٹا علی بخش خاں اور دو بیٹیاں امراؤ بیگم زوجہ غالب اور بنیادی بیگم زوجہ غلام حسین خان مسرور والدہ زین العابدین عارف چھوڑیں[17]۔

اس خاندان کے ایک فرد کو اہل دہلی نے شہید بھی قرار دیا اور وہ بھی اس شخص کو جو قبل ازیں کوئی خاص پسندیدہ شخص بھی نہ تھا، یہ تھے نواب شمس الدین احمد خان والی فیروزپور جھرکہ۔ وہ لوہارو کی ریاست اپنے چھوٹے بھائیوں کے حوالے کیے جانے پر ناراض تھے۔ انہوں نے لوہارو کے کسانوں کو اکسایا کہ وہ امین الدین احمد خان کو مال گزاری دینا بند کردیں اور بھی کئی طرح کی مشکلات کھڑی کیں چنانچہ ۱۸۳۳ء میں وہ لوہارو کو دوبارہ ہتھیانے میں کامیاب ہوگئے۔ ولیم فریزر ریذیڈنٹ دہلی اس خاندان کا پرانا دوست تھا۔ تینوں نواب زادے اسے چچا کہتے تھے۔ وہ اس کے سامنے پل کر جوان ہوئے تھے۔ اسے شمس الدین کی زیادتیوں کا بھی علم تھا چنانچہ اس نے امین الدین خان کو اپنا مقدمہ کلکتہ جاکر گورنر جنرل کے سامنے پیش کرنے کا مشورہ دیا[19] امین الدین احمد خان کلکتہ گئے۔ غالب نے اپنے کلکتہ کے احباب کو ان کی مدد کے لیے خطوط ارسال کیے[20]۔

شمس الدین خان ولیم فریزر کے سلام کو آئے تو اس نے نہایت درشتی کے ساتھ سلام قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ چھوٹے بھائیوں کی حق تلفی پر ان کی سرزنش کی۔ نواب شمس الدین خان یہ بے عزتی برداشت نہ کرسکے اور انتقام لینے کی ٹھانی۔ یوں بھی فریزر ان کی ریاست کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے ایک وفادار ملازم کریم خان کو اس کام پر متعین کیا۔ کریم خان چھ ماہ تک بلکی ماراں میں نواب کے مکان پر ٹھہرا رہا۔ وہ فریزر کا تعاقب کرتا رہا لیکن اسے وار کرنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ فریزر ہر وقت محافظوں اور ملازموں میں گھرا رہتا تھا۔ آقا اور ملازم میں باقاعدگی کے ساتھ خط وکتابت جاری رہی۔ ان کا خفیہ کوڈ تھا ''کتوں کی خریداری''۔

ایک خط میں نواب نے دریافت کیا ''کتوں کی خریداری کا کیا ہوا؟'' کریم خان نے جواب میں لکھا ''میں کوشش کر رہا ہوں.....کتوں کی بہت حفاظت کی جاتی ہے۔''

نواب نے ایک خط میں لکھا:

''تم نے لکھا ہے کہ کتوں کے ساتھ ایک اردلی تھا۔ مجھے بتاؤ کہ کتوں کے ساتھ موجود یہ افراد ان کے سرپرست ہوتے ہیں یا یونہی کتوں کے ساتھ گھومنے والے کسی اور گروہ کے افراد؟ تمہیں ہر صورت میں یہ کتے خریدنے ہیں لیکن اس طرح کہ کسی کو اس سودے کا علم نہ ہو۔''

ایک خط میں کریم خان نے لکھا:

''کچھ دن پہلے کتوں کے حصول کا ایک موقع پیدا ہوا تھا لیکن میں خریداری نہ کر سکا کیونکہ وہ بہت زیادہ قیمت مانگتے تھے۔ مجھے خدا پر بھروسہ ہے۔ آپ کا یہ غلام اس طرح سے کتے لے کر آئے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔'' یہ تمام خط و کتابت بعد ازاں برآمد کر لی گئی اور مقدمے میں ثبوت کے طور پر استعمال ہوئی۔

۲۲ مارچ ۱۸۳۸ء کی رات ولیم فریزر دلّی کے مضافات میں کشن گڑھ کے راجہ کی دعوت پر گیا۔ کریم خان اس کے معمولات کی خبر رکھتا تھا اور سائے کی طرح اس کا تعاقب کرتا تھا۔ وہ اندھیرے میں فریزر کے گھر کے قریب گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی فریزر واپس آیا کاربین سے فائر ہوا اور پھر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ولیم فریزر موقع پر ہلاک ہو گیا تھا۔ تفتیش کی ذمہ داری مسٹر جان لارنس کو سونپی گئی۔ اس نے گھوڑے کے سموں کے نشان دیکھے تو معلوم ہوا کہ گھوڑے کی تازہ نعل بندی ہوئی ہے۔ نعل بندوں سے پوچھ گچھ ہوئی تو پتہ چلا کہ گھوڑا کریم خان کا ہے۔ کریم خان دہلی میں ہی روپوش تھا۔ اسے حراست میں لے لیا گیا۔ اسی دوران سر چارلس مٹکاف کو کسی مخبر نے اطلاع دی کہ نواب شمس الدین خان اس قتل میں ملوث ہو سکتے ہیں۔ ان کے گھر کی تلاشی لی گئی تو کتوں کی خریداری کے متعلق خطوط برآمد ہو گئے۔ اسی دوران میں ایک میواتی باشندے آنیا نے خود کو حکام کے حوالے کیا اور اعتراف کیا کہ وہ اس جرم میں کریم خان کا ساتھی ہے اور یہ قتل نواب کے حکم پر کیا گیا ہے۔

ہوا یوں تھا کہ آنیا جو پہاڑوں میں روپوش تھا اسے کسی نے بتایا کہ نواب شمس الدین خان ثبوت مٹانے کے لیے اسے قتل کرنا چاہتے ہیں چنانچہ اس نے خود حاضر ہو کر اقبال جرم کر لیا۔ ایک کنوئیں سے کاربین برآمد ہوگئی[21]۔

نواب کے چچازاد بھائی فتح اللہ بیگ اور غالب پر بھی انگلیاں اٹھیں کہ انہوں نے مخبری کی اور جھوٹی سچی باتیں اپنی طرف سے بنا کر شمس الدین خان کو پھانسا ہے۔ عدالت نے کریم خان اور نواب کو مجرم قرار دے کر سزائے موت سنائی۔ ۱۳ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو نواب کو پھانسی دی گئی۔ پھانسی گھاٹ پر ہزاروں لوگوں کا جم غفیر اکٹھا ہو گیا۔ نواب نے سبز لباس پہنا ہوا تھا۔ دلّی میں مشہور ہو گیا کہ سولی پر ان کا جسم خود بخود گھوم کر قبلہ رخ ہو گیا تھا۔ انہیں قطب صاحب میں دفن کیا گیا۔ عوام نے انہیں شہید قرار دیا اور ان کی قبر زیارت گاہ بن گئی[22]۔ ریاست فیروز پور جھرکہ سرکار نے ضبط کر لی۔ ولیم فریزر کو سینٹ جیمز چرچ میں دفن کیا گیا۔ اس کے دوست کرنل سکنر

نے سنگ مرمر کا ایک خوبصورت سا مقبرہ بنایا جو ۱۸۵۷ء میں تباہ و برباد کر دیا گیا۔[23]

ڈاکٹر نتالیا پری گارینا لکھتی ہیں:

''ہندوستانی سماج کے متعدد طبقات میں بڑھتی ہوئی عوامی ناراضگی کو احتجاج کی ایک علامت کی ضرورت تھی اور نواب شمس الدین ایسی ہی ایک علامت ثابت ہوئے۔ عوام کے لیے بھی اور مغل بادشاہت کی بحالی اور نظامِ کہن کی ترویج نو کے خواہش مند پرانے مسلمان جاگیردار طبقے کے نمائندوں کے لیے بھی۔ اس وقت ہندوستانیوں میں اخوت اور مساوات کے ان بورژوائی نعروں کی قدر و قیمت کا جن سے وہ انگریزوں کی وساطت سے متعارف ہو سکتے تھے، صحیح معنوں میں اندازہ لگانے والوں کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہ تھی اور ان اصولوں کے ماننے والوں کا تو بالکل فقدان تھا۔ اس لیے فریزر کے طور طریقوں کی جمہوریت پسندی خود اس سے ربط میں آنے والے لوگوں کو ناراض کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس کے علاوہ فریزر میں چاہے کیسی بھی ذاتی خوبیاں کیوں نہ رہی ہوں، زیادہ تر ہندوستانیوں کے لیے وہ بہرحال ان بدیسیوں میں سے ایک تھا جو ہندوستان کی دولت لوٹ رہے تھے اور دیسیوں کی ایک بڑی تعداد کی نظروں میں، جن میں اعلیٰ ترین طبقات کے افراد بھی شامل تھے، اس کی حیثیت ایک زمانے سے چلے آ رہے نظام کی بنیادوں ہی کو غارت کرنے والی تھی۔ عوام الناس کی نظروں میں اس ڈرامے کے کرداروں کی نوعیت میں بنیادی تبدیلی آ گئی۔ مجرم اور انگریزوں کے واقعتہً کاسہ لیس اور حاشیہ نشین نواب شمس الدین کو انہوں نے بے گناہ مظلوم بنا دیا اور نواب کے حکم سے مارے جانے والے فریزر کو اسی کے قاتل کی شہادت کا ذمہ دار قرار دیا۔''[24]

آیئے دیکھیں غالب اس واقعے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ شیخ امام بخش ناسخ کے نام ایک خط میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

''کسی ظالم خدا ناترس نے کہ ہمیشہ عذاب ابدی میں گرفتار رہے۔ ولیم فریزر صاحب بہادر ریذیڈنٹ دہلی کو جو غالب مغلوب کے مربیوں میں سے تھے، شب تاریک میں بندوق کی گولی سے ہلاک کر دیا اور میرے لیے باپ کی موت کا غم تازہ ہو گیا..... قضا را جو نشان بتلائے گئے اور اس بنیاد پر جو غلط نہیں تھی، ایک سوار کو جو والیٔ فیروز پور کے ملازموں میں سے ہے اس ستودہ صفات شخص کے قتل کے جرم میں پکڑ لیا۔ شہر کے صاحب مجسٹریٹ بہادر کہ پہلے مجھ سے واقف تھے اور میری زاویہ نشینی کے زمانے میں کہ بوم کی طرح میری پرواز صرف رات کے وقت ممکن تھی، شبانگاہ میں کبھی کبھی ان سے ملنے چلا جاتا تھا اور کچھ لمحے سکون و عافیت کے گزارتا تھا۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس نے حقیقت حال تک پہنچنے اور اس پر پڑے ہوئے اسرار کی پردہ کشائی کی غرض سے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ یہاں تک کہ والیٔ فیروز پور مجرم قرار پا گیا اور سرکاری پولیس اس کی جاگیر پر جا کر بیٹھ گئی۔ چونکہ میرے اور اس کے مابین نااتفاقی چل رہی تھی اور شہر کے لوگ اس سے واقف تھے سبھی نے میرے مخالف اور اس کا فرنعمت کی گرفتاری کو جس نے اپنے محسن کو مار ڈالا، میری طرف سے مخبری کا نتیجہ قرار

دیا۔ یعنی مردمان شہر خاص و عام یہ واہمہ رکھتے ہیں کہ شمس الدین بیگناہ ہے فتح اللہ بیگ اور اسد اللہ خان نے انگریزوں کو اس کے خلاف بھڑکایا ہے اور جھوٹی سچی باتیں ملا کر اس بیچارے کو مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ طرفہ تر بات یہ ہے کہ فتح اللہ بیگ خاں والی فیروز پور کا برادر عم زاد ہے۔ مختصر یہ کہ قصہ یہاں تک پہنچ گیا کہ مجھ پر لعنت ملامت دہلی کے یادہ گو یوں کا وظیفہ بن گئی ہے۔"[25]

اکتوبر ۱۸۳۵ء میں لکھے گئے ایک اور خط میں استاد ناسخ کو لکھتے ہیں:

"پیرے اماہ صفر کو الہ آباد کے حکام شہر میں سے ایک حاکم اس دیار تک پہنچا اور گورنر جنرل بہادر کی طرف سے اس امر پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ حکام دہلی کی تحقیقات کے خلاصہ کو مزید گہری نظر سے دیکھیں اور ثبوت جرم کے بعد سزا کی قرارداد کو مرحلہ بہ مرحلہ بروئے کار لائے.....

وہ ہنگامہ ختم ہوا اور اس کے ہر کردار کو جیسا کہ چاہیے تھا اس کے عمل کی پاداش مل گئی اور والی میوات کو ان کے سرہنگ کریم خان کے ساتھ تختہ دار پر لٹکا دیا گیا اور اس نے عدم آباد کی راہ لی۔ یہاں جس آدمی نے جو بویا ہے وہ کاٹ بھی ہے۔"[26]

حوالہ جات

1- چاند پکھراج کا گلزار۔

2- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔

3- غالب درونِ خانہ از کالی داس گپتا رضا' ساکار پبلشرز کمپنی

4 تا 6- ایضاً۔

7 تا 13- ایضاً

14 تا 16 خطوط غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔

17- غالب درونِ خانہ از رضا

Twilight of Mughals. Percival Spear -18-19

20- پنج آہنگ از مرزا اسد اللہ خان غالب۔

Twilight of Mughals. Percival Spear -21

22- غالب۔ متالیا پری گارینا' غالب درونِ خانہ از رضا

Twilight of Mughals. Percival Spear -23

24- غالب از متالیا پری گارینا۔

25- پنج آہنگ از مرزا اسد اللہ خان غالب

بلاقی بیگم کے کوچے سے سلطان جی تک.....
رُسومِ دہلی.....رُت بسنت

غدر سے پہلے کی دہلی میں اگر ایک نمازی جامع مسجد کے شمالی دروازے سے سیڑھیاں اترتا ہوا دریبہ اور کوتوالی کی سمت جا رہا ہو تو وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا کہ اس کے دائیں طرف بلاقی بیگم کا کوچہ آ جائے گا۔ غالب ۲ دسمبر ۱۸۵۹ء کو میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"چلے آؤ جاں نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ، بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھنا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سن جاؤ۔"[1]

اس کے صرف دو ہفتے بعد حسین مرزا کے نام خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"فیل خانہ، فلک پیرا، لال ڈگی کے محاذی کے مکانات سب گرائے گئے۔ بلاقی بیگم کا کوچہ التوا میں ہے۔ اہل فوج ڈھانا چاہتے ہیں۔ اہل قلم بچاتے ہیں، پایانِ کار دیکھئے کیا ہو....."

..... یہاں اہل قلم سے مراد سویلین حکام ہیں۔ بہر حال آدھی کامیابی دونوں طبقوں کو حاصل ہوئی۔ اہل سیف کوچے کا کچھ حصہ گرانے میں کامیاب ہوئے جبکہ اہل قلم کچھ حصہ بچانے میں۔"[2]

اسی بلاقی بیگم کے کوچے میں ۸ جنوری ۱۸۴۶ء بروز سہ شنبہ حضرت غوثِ اعظم کی آل سے حسنی سادات کے ایک گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا، جس کا نام سید احمد رکھا گیا۔ اس نام کو ایک روز اہل قلم کے افق پر مثلِ آفتاب چمکنا تھا۔ سید احمد سات ماہ کے تھے، والد نے باغ شاہ صابر بخش میں مکان خرید لیا اور وہاں منتقل ہو گئے۔ بعد میں یہ علاقہ دریا گنج کہلایا۔ سید احمد نے نارمل سکول دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ سرکاری ملازمت کا آغاز محکمہ تعلیم سے کیا۔ انہیں محکمہ تعلیم میں ملازمت دلوانے والے غالب کے شاگرد "رسوم ہند" کے مصنف ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی تھے۔ صرف ۲۲ سال کی عمر میں یعنی ۱۸۶۸ء میں انہوں نے ایک لغت کی ترتیب و تالیف کا کام شروع کیا۔ اس لغت کی تکمیل میں انہیں تیس سال لگے اور اس نے "فرہنگ آصفیہ" کے

نام سے شہرت دوام حاصل کی۔ ۱۸۶۹ء میں یعنی غالب کی وفات کے سال ان کی کتاب ''کنز القواعد'' شائع ہوئی اور سرکار سے انعام حاصل کیا۔ لغت کی طباعت کے لیے قدرت کی طرف سے یہ بندوبست ہوا کہ ۱۸۸۵ء میں جب سید صاحب ملازمت کے سلسلہ میں شملہ میں مقیم تھے وہاں حسن اتفاق سے وزیر دکن سر آسمان جاہ بہادر سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے فرہنگ کے کچھ حصے دیکھے۔ پسند کیے اور اپنے ساتھ حیدرآباد لے گئے۔ وہاں مولوی سید علی بلگرامی سے رائے لی گئی۔ مثبت رائے کے بعد مختلف اوقات میں حضور نظام دقارالدولہ سر آسمان جاہ بہادر اور یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد نے بیس ہزار روپے فرہنگ کی طباعت کے لیے دیئے جس کا نام فرہنگ آصفیہ رکھا گیا۔ ۲۲ جون ۱۹۱۴ء کو ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں برطانوی ہند کی حکومت نے انہیں خان صاحب کا خطاب عطا کیا۔ ان کی دیگر کتب میں لغات النساء لغات المدارس روزمرۂ دہلی مرقع زبان دہلی محاکمہ مرکز اردو قواعد اردو سیر شملہ مناظرہ تقدیر و تدبیر اخلاق النساء تسخیر شوہر اور رسوم دہلی شامل ہیں۔ سید صاحب کا بہتر سال کی عمر میں ۱۶ مئی ۱۹۱۸ء کو انتقال ہوا۔[3]

رسوم دہلی کی تمہید سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''پہلے اس سے کہ میں ان رسموں کو شروع کروں اس قدر عرض کر دینا مناسب جانتا ہوں کہ مسلمانوں کی عورتوں اور ان کے سبب ان کے مردوں میں جس قدر رسمیں مروج ہیں وہ تقریباً سب کی سب ہندووانی رسمیں ہیں جن میں سے بہت سی رسمیں تو جوں کی توں ہیں۔ بعض کے نام تو وہی ہیں مگر طریقے بدل گئے ہیں۔ بعض میں برائے نام فرق کر دیا ہے۔ بعض کو مذہبی امور میں بہ تغیر نام شامل کر دیا ہے۔''[4]

''جلال الدین محمد اکبر بادشاہ ہند نے چونکہ استحکام سلطنت و ازدیاد و ارتباط موانست کی غرض سے ہندی عقائد و مراسم کو اختیار کر لیا تھا اور اس کا یہاں تک رواج ہو گیا تھا کہ اب اس اخیر وقت میں بھی جو شہزادہ تخت کا حقدار خیال کیا جاتا تھا وہ آداب تخت ہند کے پاس و لحاظ سے ختنہ نہیں کراتا تھا۔''[5]

''شاہ عالم کے وقت سے تو سلونوں میں راکھی باندھنا، ہولی، دیوالی، دسہرے کا تہوار منانا، شاہی خاندان میں ایک عام دستور ہو گیا تھا۔''

''بچہ مسلمان کے گھر پیدا ہوتا ہے گیت کرشن جی کے جنم یا ان کی مناسبت کا گایا جاتا ہے۔ جیسے۔

الیلی بچا مان کرے نند لال سے
سہاگن بچا مان کرے نند لال سے

''اگرچہ علمائے مذہب نے ان رسموں کے اٹھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا مگر چونکہ گھر کے اندر کی بلا اور گھٹ میں بیٹھی ہوئی دوا اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہتی کچھ بھی پیش رفت نہ گئی۔''[6]

ان رسموں اور میلوں ٹھیلوں میں ایک میلہ بسنت کا بھی تھا۔ آئیے ذرا دہلی کی بسنت کی رونقیں دیکھیں...... بہار کا موسم آیا باغوں میں پھول کھلے کھیتوں میں سرسوں پھولی دلّی کے اطراف جمنا کے پار حد

نظر تک زرد پھولوں کے ایک بے کراں سمندر.....

ہندوؤں نے دیوتاؤں کے مندروں میں سرسوں کے پھول چڑھانا شروع کیے۔ مسلمانوں نے اپنے بزرگوں کے مزاروں پر..... لیکن یہ کوئی پابندی نہیں..... بے شمار ہندو مسلمان بزرگوں کے مزاروں پر بسنت کے پھول چڑھانے کی تقاریب میں شامل ہوتے اور بہت سے مسلمان ہندو مندروں کی بسنت میں چلے جاتے..... دہلی میں دسیوں جگہ بسنت چڑھائی جاتی.....اور کئی کئی روز بسنت چڑھتی..... آج حضرت سلطان الاولیاء کی بسنت ہے تو کل حضرت حسن رسول نما کی۔ پرسوں ہرے بھرے صاحب کی ہے تو اگلے دن شاہ بڑے صاحب کی۔ پھر حضرت قطب الدین بختیار اور حضرت نصیرالدین چراغ دہلی کی..... ختم پڑھا جاتا' شیرینی تقسیم ہوتی' مزار کی پائنتی سرسوں کے پھول رکھے جاتے' پھر قوالی ہوتی' عقیدت مندناچنے والیاں رقص کرنے پہنچ جاتیں۔"[7]

کہتے ہیں حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی ہمشیرہ کے پوتے سید تقی الدین نوح کا انتقال ہوگیا۔ حضور اس بچے سے بہت محبت کرتے تھے۔ آپ بے حد غمگین ہوئے۔ چہرے سے مسکراہٹ غائب سی ہوگئی۔ ہونٹ گویا سل گئے۔ سید تقی الدین کی قبر کے نزدیک کوشک والے لال گنبد میں تنہا سر جھکائے بیٹھے رہتے۔ انہی دنوں بسنت آگئی۔ ہندوؤں کا ایک ہجوم ہاتھوں میں سرسوں کے پھولوں کے گلدستے لیے کالکا دیوی کے مندر کی طرف جارہا تھا۔ حضرت امیر خسرو نے یہ منظر دیکھا تو انہوں نے بھی گلدستے ہاتھوں میں لیے ٹوپی میں لگائے اور سلطان المشائخ کے گھر کا رخ کیا۔ راستے میں خواجہ محمد' خواجہ سید موسیٰ اور امام احمد ایاز مل گئے۔ وہ بھی ساتھ ہولیے۔ جب سلطان المشائخ کے پاس پہنچے تو کلاہ کج کی اور رقص کے انداز میں جھومنے لگے۔ حضور بے ساختہ مسکرا پڑے اور دریافت فرمایا کہ ماجرہ کیا ہے۔ حضرت امیر خسرو نے بڑھ کر سرسوں کے پھول قدموں میں رکھ دیے اور کہا:

عرب یار توری بسنت منائی

آج ہندو اپنے مندر پر بسنت کے پھول چڑھانے جارہے ہیں۔ میں بھی اپنے بت پر پھول چڑھانے لایا ہوں اور پھر یہ شعر سب نے مل کر گایا۔

اشک ریز آمدہ ابر بہار
ساقیا گل بریز بادہ بیار

اور پھر یہ رسم چل پڑی کہ بسنت پنچمی کی سہ پہر ٹھیک چار بجے اسی جگہ اجتماع ہوتا' قوال یہی کلام گاتے۔ کالکا میں ہندو اور سلطان جی میں مسلمان ایک ہی دن بسنت کے میلے کی ابتدا کرتے اور پھر دتی بسنت کے زرد رنگوں میں رنگ جاتی۔[8]

شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

سرسوں پھولی' گویا دھرتی کے ہاتھ پیلے ہوئے' ڈھولک پر تھاپ پڑی' گیت گائے جانے لگے لڑکیاں بالیاں' گھوڑیاں گانے لگیں.....

رت بسنت میں اپنی امنگ سوں
پی ڈھونڈنے میں نکسی گھر سوں
ملے تو لال گردا لگا لوں
پاگ بندھاؤں پیلی سرسوں
رت بسنت میں اپنی امنگ سوں
رنگ ہے سبزہ نرگس یاں کا
کہے شوق رنگ، رنگ ہے واں کا
ان بھیدوں کو کوئی نہ جانے
واقف ہوں میں دا کی خبرسوں
رت بسنت میں اپنی امنگ سوں

بہار شاہ شوق رنگ (ظفر)[9]

خود سرسید احمد خاں کے نانا خواجہ فرید کی قبر پر چونسٹھ کھمبے میں بسنت کا میلہ ہوا کرتا تھا۔عہد جوانی میں سرسید اپنے بھائیوں کے ہمراہ اس میلے کے منتظم و مہتمم ہوا کرتے تھے۔

مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

اس زمانے میں خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ دتی میں رہتے تھے۔ان کے گھر پر بسنت کا جلسہ ہوا کرتا تھا۔شہر کے خواص وہاں مدعو ہوتے تھے۔نامی نامی طوائفیں زرد لباس پہن کر وہاں آتی تھیں۔مکان میں بھی زرد فرش ہوتا تھا۔دالان کے سامنے ایک چبوترہ تھا جس میں حوض تھا۔اس میں زرد پانی ہی کے فوارے چھوٹتے تھے۔صحن میں جو چمن تھا اس میں جھنڈاں زرد پھول کھلے ہوئے ہوتے تھے طوائفیں باری باری بیٹھ کر گاتی تھیں۔سرسید کہتے تھے کہ میں ہمیشہ وہاں جاتا تھا اور اس جلسے میں شریک ہوتا تھا[10]۔

حوالہ جات

2-1- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
3- فرہنگ آصفیہ از سید احمد دہلوی۔سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔
رسوم دہلی۔سید احمد دہلوی۔اردو اکادمی دہلی۔
6-5-4۔ایضاً
9-8-7 اُجڑا دیار از شاہد احمد دہلوی۔مکتبہ دانیال کراچی۔
10- حیات جاوید از مولانا الطاف حسین حالی۔

دلّی کے پانچ شمس العلماء حضرات
الطاف حسین حالیؔ، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، ضیاء الدین، ذکاء اللہ

1- خواجہ الطاف حسین حالی

''جناب بھائی صاحب قبلہ! یقین ہے کہ آپ مع الخیر اپنے دارالریاست میں پہنچ گئے ہوں اور بہ جمعیت خاطر روزہ رکھتے ہوں۔ سوا پان کے کوئی خیال اور مولوی الطاف حسین کے فراق کے سوا کوئی وجہ ملال نہ ہو۔''[1]

یہ غالب کے ایک خط سے اقتباس ہے جو انہوں نے ۷ فروری ۱۸۶۵ء کو نواب مصطفیٰ خان بہادر شیفتہ کے نام لکھا تھا..... ان دنوں خواجہ الطاف حسین جہانگیر آباد میں نواب صاحب کے دامن دولت سے وابستہ تھے اور ان کے صاحبزادے نقش بند خان مہور کے اتالیق بھی تھے۔ خواجہ الطاف حسین ۱۸۳۶ء یا ۱۸۳۷ء میں پانی پت کے ایک انصاری گھرانے میں پیدا ہوئے۔[2]

پانی پت اگر چہ ضلع کرنال میں تھا لیکن اسے ہمیشہ دلّی کے مضافات میں سے سمجھا گیا ہے اور جب جناب مالک رام خواجہ موصوف کو دلّی والا مانتے ہیں تو ہم کون ہوتے ہیں انہیں پانی پتی کہنے والے۔ جیسے آج اگر آپ سے کوئی کہے کہ جامشورو حیدرآباد کا نہیں دادو کا حصہ ہے تو کیا آپ مانیں گے؟

الطاف حسین نے ابتدائی تعلیم پانی پت میں حاصل کی۔ لڑکپن میں ہی دلّی آ گئے۔ ۱۸۵۵ء میں منطق، فلسفہ اور عربی میں سند فضیلت حاصل کی۔ ۱۸۵۶ء میں ضلع حصار کی کلکٹری میں قلیل مشاہرے پر ملازم ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں ملازمت جاتی رہی۔ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۰ء تک جہانگیر آباد میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے دربار سے وابستہ رہے۔ بعد ازاں گورنمنٹ پنجاب کے لاہور بک ڈپو میں ملازم ہو گئے اور وہاں چھپنے والی کتابوں کی اصلاح زبان کا کام ان کے سپرد ہوا۔ آٹھ ماہ لاہور چیفس کالج میں استاد رہے۔ پھر اینگلو عربک

سکول دلی میں استاد رہے۔ وہاں سے سرسید کے پاس علی گڑھ چلے گئے۔ حیدر آباد سے نواب سر آسمان جاہ علی گڑھ کے دورے پر آئے تو سرسید کی سفارش پر ان کا وظیفہ مقرر کر دیا جس سے فکر معاش سے آزادی ملی اور یکسو ہو کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔

۱۹۰۴ء میں ان کی تعلیمی خدمات کے صلے میں حکومت نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو انتقال ہوا اور پانی پت میں حضرت بوعلی قلندر کے مزار مبارک کے احاطہ میں دفن ہوئے[3]۔

مولانا الطاف حسین حالی کو اردو میں سوانح نگاری کا امام کہا جاتا ہے۔ حیات سعدی، حیات جاوید اور یادگار غالب سوانح نگاری کے فن میں ان کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ حالی مضمون نگار تھے، نقاد تھے، شاعر تھے اور مصلح تھے۔ "مقدمہ شعر و شاعری" نے اردو کی ادبی دنیا کے جمود کو توڑا۔ اگرچہ یہ کتاب خاصی متنازعہ رہی لیکن ان کی شہرت کا سنگ بنیاد اسی کتاب سے رکھا گیا۔ مگر جس کتاب نے حالی کو شہرت دوام عطا کی وہ نثر کی نہیں شاعری کی کتاب تھی۔ "مسدس حالی" جس کے بارے میں سرسید کہا کرتے تھے کہ بروز حشر وہ اپنی متاع اخروی کے طور پر مسدس اور اس کے مصنف کو داور محشر کے حضور پیش کریں گے[4]۔

شاعری میں شیفتہ اور غالب کے شاگرد تھے۔ حالی تخلص کرتے تھے۔ ان کے کلام پر شیفتہ کا رنگ زیادہ غالب ہے۔ شیفتہ کے ہاں قیام نے حالی کی شخصیت کو نکھارنے میں بہت مدد دی۔ ان کی معیت میں حالی کو اس عہد کی نابغہ روزگار شخصیات غالب، آزردہ، ضیاء الدین خان اور حکیم احسن اللہ خان سے صحبت کے مواقع میسر آئے اور انھوں نے ان نابغوں سے خوب کسب فیض کیا۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا[5]

"یادگار غالب" کے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں:

"تیرہویں صدی ہجری میں جبکہ مسلمانوں کا تنزل درجہ غایت کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت، عزت و حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے۔ حسن اتفاق سے دارالخلافہ دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد تازہ کرتی تھیں جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں:

ہندرا خوش نفسانند سخنور کہ بود
بادور خلوت شاں مشک فشاں ازوم شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی و انگاہ
حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی بار راقم کا دلی جانا ہوا اسی زمانے میں اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو

گئی تھی۔ کچھ لوگ دلّی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھ کو ہمیشہ فخر رہے گا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلّی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے اور جس ہوا میں انہوں نے نشوونما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی۔ علی الخصوص مرزا اسداللہ خان غالب جن کی عظمت وشان اس سے بالاتر تھی کہ ان کو بارہویں یا تیرہویں ہجری کے شاعروں یا انشاپردازوں میں شمار کیا جائے۔"[6]

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم ونثر کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اردو نظم ونثر پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے۔"[7]

2- محمد حسین آزاد

آزاد کا کچھ تذکرہ تو ان کے والد مولوی باقر کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ دہلی کالج سے تعلیم حاصل کی۔ دہلی اردو اخبار کے مدیر رہے۔ غدر میں جان بچا کر اور بقول خود اپنے استاد حضرت ذوق کی غزلیں لے کر بھاگے۔ دو سال آوارہ و بے خانماں رہے۔ جگراؤں، جالندھر اور پھر لاہور چلے گئے۔ دلّی سے فرار کا حال "مقدمہ دیوان ذوق" میں اپنے مخصوص ڈرامائی انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

"میرا یہ حال ہوا کہ فتح یاب لشکر کے بہادر دفعتہ گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ چلو نکلو..... دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران تھا کہ کیا کیا کچھ اٹھا کر لے چلوں.....ان کی غزلوں کے جنگ پر نظر پڑی۔ یہی خیال آیا کہ محمد حسین زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا مگر استاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو غزلیں پھر آ کر کہیں گے۔ اب ان کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو مر کر بھی زندہ ہیں۔ یہ نہیں تو نام بھی نہ رہے گا وہی جنگ اٹھا بغل میں مارا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑا۔ بائیس نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا..... آوارہ ہو کر خدا جانے کہاں نکل آیا۔"[8]

۱۸۶۰ء میں لاہور میں جنرل پوسٹ میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۸۶۴ء میں ڈائریکٹر پبلک ایجوکیشن کے محکمے میں چھوٹی سی ملازمت ملی۔ ۱۸۶۵ء میں ڈاکٹر لائٹز نے انجمن پنجاب قائم کی جس کے مقاصد تھے قدیم مشرقی علم وحکمت کا احیاء، مقامی زبانوں کے ذریعے ہر دلعزیز تعلیم کی فراہمی، عام دلچسپی کے معاشرتی، ادبی اور سائنسی مسائل پر بحث اور تعلیم یافتہ اور باثر طبقوں کی عمال حکومت سے راہ ورسم۔ آزاد نے جوش وخروش کے ساتھ انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔

۱۸۶۵ء میں حکومت نے انہیں وسط ایشیا میں جاسوسی کی مہم پر بھیجا۔ ۱۸۶۸ء میں کرنل ہالرائیڈ کی ہدایت پر قصص ہند کا دوسرا حصہ تحریر کیا۔ پہلا حصہ پیارے لال آشوب نے تحریر کیا تھا۔ بعد ازاں سخندان فارس،

آب حیات اور سیر ایران منظر عام پر آئیں۔ آزاد نے کمال چابکدستی سے اپنے وسط ایشیا کے مشاہدات کو ایران پر تھوپ دیا۔ لاہور سے نکلنے والے سرکاری مجلے ''اتالیق پنجاب'' کے سب ایڈیٹر رہے۔ اس کے بند ہو جانے کے بعد ''پنجاب میگزین'' کے سب ایڈیٹر رہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے استاد رہے۔ ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء میں اختلال ذہن میں مبتلا ہوئے۔ ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو انتقال ہوا۔[9]

آیئے ذرا دیکھیں تلمیذ ذوق آزاد غالب کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ ایک اور شمس العلماء منشی ذکاء اللہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مرزا غالب کا یہ حال ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ تنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو افسوس نہ تھا۔ جس روز ذوق مر گیا تو خوش ہو ہو کر کہتا تھا کہ آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مر گیا۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ صہبائی شعر کہنا کیا جانے نہ اس نے شراب پی' نہ قمار بازی کی' نہ معشوقوں کے ہاتھوں سے جوتیاں کھائیں' نہ جیل خانے میں پڑا' طامع ایسا تھا کہ ایک ایک قصیدہ دس دس جگہ بیچتا تھا۔ اس لیے قصائد میں یہ نہیں لکھا کہ کس کی تعریف میں ہے بلکہ نمبر ان پر لگائے ہیں۔ سیزدہم' دہم' نہم۔ میرے نزدیک فقط اس کی شاعری سے آپ غرض رکھیں اور کچھ فضائل واخلاق سے بحث نہ ہو...... عام اعتقاد مرزا پر یہاں کے لوگوں کا یہ ہے کہ فارسی کا شاعر اچھا تھا لیکن اردو کی نظم ونثر اس کی یہاں کے لوگوں کو پسند نہیں۔ نکات غالب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان کی تحقیق میں طفل مکتب تھا۔ سوائے چند مصادر کی تحقیقات کے اس کو کسی اور مضمون سے خبر ہی نہیں۔''[10]

3- مولوی نذیر احمد دہلوی

۱۸۳۶ء میں بجنور کے ایک گاؤں ریٹرہ میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن میں دہلی آ گئے۔ اورنگ آبادی مسجد میں مولوی عبدالخالق کے شاگرد ہوئے۔ بعد ازاں ان کی پوتی سے شادی ہوئی۔ پھر دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ مولوی ضیاء الدین اور منشی ذکاء اللہ ان کے ہم درس تھے۔ عربی میں مولوی مملوک علی نانوتوی اور فارسی میں صدر الدین آزردہ کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۴ء میں کنجاہ ضلع گجرات میں چالیس روپے ماہوار پر مدرس مقرر ہوئے۔ دو برس بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر کانپور چلے گئے۔ انگریز انسپکٹر سے نہ بنی' مستعفی ہو کر دہلی واپس آ رہے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش شروع ہو گئی۔ اس ہنگامے میں مولوی صاحب نے ایک انگریز عورت کی جان بچائی۔ غدر کے بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد تعینات ہوئے۔ انگریزی زبان سیکھی۔ قانون تعزیرات ہند کا ترجمہ کیا۔ اس کے صلے میں کانپور میں تحصیل دار مقرر ہوئے۔ بعد ازاں ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ چودہ

سال تک یوپی کے مختلف اضلاع میں اسی منصب پر فائز رہے۔اس دوران مراۃ العروس' بنات النعش' توبۃ النصوح اور ابن الوقت شائع ہوئیں۔محکمہ مال سے مستعفی ہوکر حیدر آباد چلے گئے اور وہاں ترقی کرتے کرتے ریاست کے بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہوگئے۔۱۸۸۳ء میں دلّی واپس آگئے اور تصنیف وتالیف میں مصروف ہوگئے۔کثیر التصانیف اور سریع التصنیف تھے۔ان کی دیگر معروف کتب میں محصنات' ایامیٰ' امہات الامہ' منتخب الحکایات' رویائے صادقہ' مبادی الحکمتہ' فسانہ غدر' قانون شہادت' اجتہاد' ترجمہ قرآن' مطالب القرآن اور الحقوق والفرائض شامل ہیں۔۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔۱۹۰۲ء میں یونیورسٹی آف ایڈنبرا نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری دی۔۱۹۱۲ء میں انتقال ہوا[11] ۔ڈپٹی صاحب کی نثر دلّی کی ٹکسالی زبان کا شاندار نمونہ ہے۔ابن الوقت سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''اے ہے غدر کے دنوں میں کچھ ایسی گھڑی کا پیرا اس موئے فرنگی کا آیا تھا کہ بچے کی مت پھیر دی۔ہم سے تو ایسا چھپایا ایسا چھپایا کہ دن کو گورے شہر میں گھسے اور رات کو ہم نے جانا کہ سارے غدر ہمارے گھر میں فرنگی چھپا رہا جس وقت فرنگی کو لائے تھے اگر ذرا بھی مجھ کو معلوم ہو تو میں اس کو کھڑا پانی نہ پینے دوں۔خدا جانے کم بخت کہاں سے ہمارے گھر آمرا تھا۔نہ آتا نہ بچہ ہاتھ سے جاتا۔آخر میرا صبر پڑا پر پڑا۔کسی کی آہ کا لینا اچھا نہیں ہوتا۔خدا نے اس کے پیچھے ایسا روگ لگایا کہ سارے سارے دن اٹوانٹی کھٹوانٹی لیے پڑا رہتا تھا۔آخر کو جاتے ہی بن پڑی۔کالا منہ خدا کرے پھر آنا نصیب نہ ہو۔''

''کیا جانیں بھائی سنتے ہیں کہ فرنگی بڑے جادوگیرے ہوتے ہیں۔جادو کے زور سے سارے ملک لیتے چلے جاتے ہیں اور ان کو ایسا جادو آتا ہے کہ ایک پل میں ہزاروں کوس کی خبر منگوالیں۔تم ان کی بادشاہ زادی کو لکھو کہ تمہارے فرنگیوں نے ایسا ظلم کر رکھا ہے کہ ہمارے آدمی کو بہلا کر فرنگی بنالیا ہے۔اگر وہ سچ مچ کی بادشاہ زادی ہے تو ضرور ہماری فریاد لے گی لیکن بعضے آدمی کہتے ہیں کہ بادشاہ زادی کو مت لکھواؤ کمپنی کو لکھواؤ۔کمپنی اس کی بیٹی ہے اور بادشاہ زادی نے یہ ملک بیٹی کے جہیز میں دے ڈالا ہے۔اب کمپنی کا حکم چلتا ہے۔سو تم کو تو اصل حال معلوم ہوگا' کسی ایسے کو لکھو کہ بس دیکھنے کے ساتھ ہی حکم کردے۔بھلا کہیں خدا کی خدائی میں ایسا بھی کہیں اندھیرا ہوا ہے کہ آپ ہی تو فرنگیوں نے بلایا اپنے میں ملایا پھر دوسرا فرنگی ایسا ظالم آیا کہ آتے کے ساتھ لگا دشمنی کرنے۔دیکھنا تم بادشاہ زادی کو یہ ساری باتیں لکھوانا بھولنا مت' ذرا یہاں کے فرنگیوں کی بھی تو حقیقت کھلے کہ کسی بھلے آدمی کو دھوکا دینا ایسا ہوتا ہے۔بادشاہی کیا گئی سارے فرنگی بے سرے ہوگئے۔''[12]

4۔ مولوی ضیاء الدین

دلّی کی نواحی بستی دارا پور میں داروغہ (تھانیدار) شیخ محمد بخش کے گھر پیدا ہوئے۔تعلیم دلّی کالج میں

حاصل کی۔ مولوی نذیر احمد اور ذکاء اللہ کے ہم درس' مولوی مملوک العلی اور صدر الدین آزردہ کے شاگرد تھے۔ پنجاب کے ضلع گجرات کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ٹیمپل نے اپنے ضلع میں توسیع تعلیم کا منصوبہ بنایا اور اسی سلسلہ میں یو پی کے محکمہ تعلیم کے انچارج ہنری سٹورٹ ریڈ کو چھ مولویوں کا انتظام کرنے کو کہا۔ مسٹر ریڈ نے دِلّی کالج کے پرنسپل کو رچرڈ ٹیمپل کی فرمائش پوری کرنے کو کہا۔ کالج کے چھ اچھے طلبہ کو پنجاب بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ ان میں نذیر احمد بھی شامل تھے' لیکن ضیاء الدین اپنے والد کے اثر و رسوخ کے بل بوتے پر منتخب ہو گئے اور نذیر احمد منہ دیکھتے رہ گئے لیکن کرنا خدا کا کیا ہوا کہ دوران سفر ضیاء الدین ہیضہ میں مبتلا ہو گئے اور ملازمت کا ارادہ ترک کر کے دِلّی واپس آ گئے۔ ان کی جگہ نذیر احمد کو پنجاب بھیجا گیا۔ نذیر احمد نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی پر غم و غصے کا اظہار تو کیا لیکن ضرورت مند تھے لہٰذا آمادہ ہو گئے[13]۔

داروغہ صاحب ۱۸۵۷ء کی رستخیز کے دوران قلعے اور شہر کی خبریں انگریزوں کو پہنچاتے تھے۔ جب اہل دِلّی کو شکست ہوئی اور انگریز شہر میں داخل ہوئے تو داروغہ جی جو ہوا خواہان سرکار میں سے تھے' بہ اطمینان کامل گھر سے باہر نکل آئے اور ایک گورے کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ بعد ازاں فرینڈلی فائر کے نتیجے میں ہونے والی اس المناک موت پر رنج و ملال کا اظہار کیا گیا اور اشک شوئی کے لیے مرحوم کے فرزند مولوی ضیاء الدین کو اراضی اور خان بہادری عطا کی گئی' بعد ازاں ملازمت بھی دی گئی۔ پہلے نارمل سکول میں پڑھاتے رہے پھر ۱۸۶۴ء دِلّی کالج میں استاد ہو گئے ۱۸۷۶ء میں کالج بند ہوا تو ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں حج کرنے گئے اور وہیں انتقال ہوا[14]۔

سرکار نے شمس العلماء اور ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں حکومت ہند نے انہیں برطانیہ سے نو وارد فوجی افسروں کو اردو پڑھانے کے لیے نصاب مرتب کرنے کو کہا۔ انہوں نے غالب سے بھی درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں مدد کریں اور چند خطوط اور کچھ نثر عنایت کریں۔ چنانچہ غالب نے ایک مجموعہ مرتب کر کے دیا جس میں دو دیباچے' بارہ خطوط' دو نقلیں' ایک لطیفہ اور ۱۳۱ اشعار تھے لیکن مولوی ضیاء الدین خان نے اس میں سے صرف دس خطوط ہی "انشاءِ اردو" میں شامل کیے[15]۔ مجموعے کے آغاز میں غالب تحریر فرماتے ہیں:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ کتاب جو دو باب کی ہے حقیقت یہ اس کتاب کی ہے کہ پہلے باب میں دو دیباچے اور کئی لطیفے اور کئی مکتوب ہیں۔ اگر میرے لکھے ہوئے نہ ہوتے تو میں کہتا کہ بہت خوب ہیں۔ دوسرا باب اشعار کا ہے کہ وہ بھی کلام اسی خاکسار کا ہے۔ اگر کوئی خط اردو زبان میں لکھا جائے ان اشعار میں سے شعر محل و مقام کے مناسب درج کیا جائے اور یہ مجموعہ نذر اس جناب رفعت مآب کے ہے' جس سے عزت و توقیر فنانشل کمشنری پنجاب کی ہے۔ صاحب والا مناقب عالی شان' علم و اہل علم کے قدردان یگانہ روزگار' جن کا مطیع و محکوم ہونا اہل

ہند کو سرمایۂ عزو افتخار والا پایۂ عالی رتبہ معلی القاب' حضرت فلک رفعت' میکلوڈ صاحب' فنانشل کمشنر بہادر قلم رو پنجاب۔ بس یہ کتاب اگر ان کے حکم سے چھاپی جائے گی تو صاحبان تازہ وارد ولایت کے پڑھنے کے کام آئے گی۔ اس کتاب کا نذر کرنے والا جو اپنی نذر کے قبول ہونے کا طالب ہے۔ نصر اللہ بیگ خان بہادر رئیس سونک سونسا کا بھتیجا' موسوم بہ اسد اللہ خان و متخلص بہ غالب ہے۔ میرے چچا کی سرداری اور ریاست کا حال (اور گورنمنٹ بہادر سے خاص میری ملازمت اور نذر خلعت کی کیفیت) گورنمنٹ اعلیٰ کے دفتر میں مرقوم ہے اور میرے قصیدے کا جناب مستطاب لارڈ ایلن برا بہادر کے ذریعے سے وزیر اعظم کے پاس پہنچنا اور حضرت قدر قدرت شہنشاہ بحر و بر معظمہ و محتشمہ کے حضور پُرنور میں گزرنا از روئے مشاہدۂ خطوط آمدہ ولایت جو بہ سبیل ڈاک مجھ کو ولایت سے آئے ہیں۔ گورنمنٹ بہادر ہندوستان کو معلوم ہے' البتہ میں اس کا مستحق ہوں کہ ''کوٹس پوئٹ'' گنا جاؤں اور اس علاقے سے ایک نیا نام اور نئی عزت پاؤں۔ اگر رتبہ نہ بڑھایا جائے' قدیم عزت میں تو فرق نہ آنے پائے۔''[16]

غالب نے مولوی ضیاء الدین بہادر کی فرمائش پوری کی لیکن مولوی صاحب نے جو سلوک غالب سے کیا' وہ کچھ ایسا ہی تھا جو انہوں نے اپنے دوست مولوی نذیر احمد کے ساتھ اپنے کیریئر کے آغاز میں کیا تھا۔ ہوا یوں کہ غالب کی ''قاطع برہان'' کے جواب میں ایک صاحب مولوی امین الدین نے ''قاطع القاطع'' لکھی جس میں انتہائی شرم ناک اور غلیظ زبان استعمال کی اور غالب پر بے حد رقیق حملے کیے۔ ۱۸۶۷ء میں غالب نے مولوی مذکور کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ مولوی امین الدین نے اپنے صفائی کے گواہوں میں مولوی ضیاء الدین خان بہادر کو بھی شامل کیا۔ مولوی ضیاء الدین صاحب نے ان گالیوں کے ایسے ایسے دوراز کار معانی بیان کیے اور ایسی لسانی موشگافیاں کیں کہ انگریز مجسٹریٹ چکرا کر رہ گیا' مجسٹریٹ سے زیادہ غالب چکرا گئے اور حالات کا رخ دیکھتے ہوئے مقدمے سے دستبرداری اختیار کی اور راضی نامہ داخل کر دیا[15]۔

5- مولوی ذکاء اللہ دہلوی

۱۸۳۲ء میں بہادر شاہ ظفر کے بیٹے کوچک سلطان کے اتالیق حافظ ثناء اللہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ مولوی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کے گہرے دوست تھے۔ ریاضی کے ماہر تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسی کالج میں ریاضی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ بعد از اں آگرہ کالج میں فارسی اور اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بلند شہر و مراد آباد ہوئے۔ ۱۸۶۹ء میں دلی سکول کے مدرس اعلیٰ بنائے گئے۔ ۱۸۷۲ء میں میور سنٹرل کالج الہ آباد میں عربی اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں انتقال ہوا[18]۔

انہوں نے ریاضی، طبیعیات، کیمیا، جغرافیہ، ادب، اخلاقیات، سیاسیات جیسے متنوع موضوعات پر ڈیڑھ سو کے قریب کتب تصنیف اور تالیف کیں۔ دس جلدوں پر مشتمل ضخیم تاریخ ہندوستان ان کی یادگار کتاب ہے۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے حوالے سے کتاب ''آئین قیصری'' بھی عمدہ تصنیف ہے۔ وہ اپنے عہد کے تمام معروف جرائد مثلاً تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سائنٹفک گزٹ، مخزن، زمانہ، ادیب اور خاتون وغیرہ میں باقاعدہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ اس حوالے سے مولانا حالی نے ان پر پھبتی کسی تھی کہ مولوی ذکاءاللہ کا دماغ ایک بنیے کی دکان ہے جس میں ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے۔ حکومت نے ان کی علمی اور تعلیمی خدمات کے صلے میں خان بہادر اور شمس العلماء کے خطاب عنایت کیے۔ تعلیم نسواں کی ترقی کے سلسلے میں ان کی خدمات پر خلعت عطا ہوا[19]۔

حوالہ جات

1- خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
2-3- تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ۔
4-5- تلامذہ غالب از مالک رام۔
6-7- یادگار غالب از الطاف حسین حالی۔
8-9- محمد حسین آزاد؛ احوال و آثار از ڈاکٹر محمد صادق۔
10- آب حیات کے ماخذ بحوالہ ڈاکٹر محمد صادق۔
11- تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ۔ ابن الوقت از ڈپٹی نذیر احمد۔
12- ابن الوقت۔ ڈپٹی نذیر احمد۔
13-14-15- انشائے غالب از رشید حسن خان۔
تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ۔
16- انشائے غالب از رشید حسن خان۔
17- یادگار غالب حالی؛ انشائے غالب رشید حسن خان۔
18- تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ۔

سر سید احمد خان.....آثار الصنادید، اسباب بغاوتِ ہند

نواب معلّٰی القاب وسید عالی جناب سلامت!

منشور رافت نشان کے موصول ہونے سے مجھے خوشی ہوئی مگر اس میں جو حکم مجھے دیا گیا ہے افسوس ہے کہ اس کی بجا آوری اور سرانجام دہی سے معذور ہوں۔ایک دو شعر کسی دوسرے شخص کے لے کر ان پر دو چار اشعار بڑھا دینا سخن وری کا کونسا اسلوب اور معنی پروری کا کونسا طریقہ ہے؟ خاص کر یہ دو اشعار جو جناب نے ارسال فرمائے ہیں، ان میں سوائے عربی الفاظ کی شوکت و شکوہ کے اور کیا دھرا ہے؟ یہ اشعار معنی آفرینی اور نکتہ سنجی کے حسن سے یکسر معرا ہیں.....

حضور اشرف المرسلین علیہ والہٖ السلام کی منقبت میں اس فقیر حقیر کے قصیدے اور مثنویاں موجود ہیں۔ان میں سے ایک مثنوی نقل کر کے خدمت والا میں ارسال کر رہا ہوں۔اسے ملاحظہ فرمائیں اور اس کا مطالعہ کریں اور بندہ سے ایسی فرمائش نہ فرمائیں جو شاعروں کا شیوہ اور سخن گستروں کا طریقہ نہیں۔ویسے مجھے اپنا خادم سمجھیں اور اپنے بڑے بھائی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کو میرا سلام پہنچا دیں۔والسلام

از اسد اللہ[1]

سر سید احمد خاں نے آگرہ سے مرزا غالب کو ایک خط میں مولوی غلام امام شہید کے دو نعتیہ اشعار بھیجے تھے اور ان پر تضمین لکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی جس سے غالب نے معذرت کی تھی[2]۔

غالب سر سید کا بے حد احترام کرتے تھے۔''آثار الصناوید'' پہ غالب نے جو تقریظ لکھی اس میں کتاب و صاحبِ کتاب پر داد و تحسین کی بارش کی گئی تھی لیکن تصحیح آئین اکبری کا جو دیباچہ غالب نے تحریر کیا وہ سر سید کو اس قدر ناگوار خاطر گزرا کہ انہوں نے اسے کتاب میں نہ چھپوایا[3] اور یہ غالباً غالب کا تحریر کردہ واحد دیباچہ ہے جس میں انہوں نے مصنف اور مؤلف سے نہ صرف اختلاف کا اظہار کیا بلکہ سر سید کی کوشش کو تضیع اوقات قرار دیا.....حالانکہ غالب نے تو ''گلزارِ سرور'' اور ''حدائق الانظار'' جیسی داستانوں کے دیباچوں میں مؤلفوں اور مترجموں پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے تھے۔اختلاف صرف سر سید کے ضمن میں ہوا.....

سر سید برصغیر کی ایک متنازعہ شخصیت ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ بڑے آدمی تھے۔ تاریخ ساز اور رجحان ساز...... انہوں نے برصغیر کی تاریخ، سیاست، ثقافت، ادب، صحافت یہاں تک کہ مذہب پر بھی اپنے نقوش چھوڑے۔

دہلی کے سر راہ، بہرام خان کے قریب ایک بہت بڑی حویلی تھی جس میں دیوان خانہ، فیل خانہ، اصطبل اور متعدد مکانات تھے۔ یہ خواجہ فرید کی حویلی کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے ایک حصے میں جو خواص پورہ کہلاتا تھا ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو سید احمد خان پیدا ہوئے۔ خواجہ فرید الدین احمد ان کے نانا تھے۔ فرید الدین احمد، وبیر الدولہ، امین الملک، مصلح جنگ کے خطابات رکھتے تھے۔ ریاضی کے ماہر تھے۔ انہوں نے لکھنؤ میں علامہ تفضل حسین خاں سے ریاضی کی تحصیل کی تھی۔ خود بھی دہلی میں ریاضی کی تعلیم دیتے رہے۔ تاریخ، جغرافیہ، علم فلکیات اور آلات رصد کے استعمال میں بھی ماہر تھے۔ ۱۸۰۳ء میں گورنر جنرل نے سفیر بنا کر ایران فتح علی شاہ قاچار کے دربار میں بھیجا۔ برما میں پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر کام کیا۔ پھر بندیل کھنڈ میں تحصیل دار ہوئے۔ ۱۸۱۵ء میں اکبر شاہ ثانی نے منصب وزارت پر سرفراز کیا۔ خواجہ فرید نے قلعہ معلی میں اصلاحات نافذ کیں۔ بادشاہ خاصے مقروض ہو گئے تھے۔ خواجہ صاحب نے آمد و خرچ میں پائے جانے والے وسیع عدم توازن کا خاتمہ کیا۔ کفایت شعاری کی اور غیر ضروری اخراجات پر پابندی سے ممکن ہوا۔ شہزادوں، بیگمات اور عمال شاہی کی تنخواہوں میں دس فیصد کمی کی وجہ سے قلعہ میں فضا ان کے خلاف ہو گئی تو انہوں نے استعفیٰ دے دیا اور کلکتہ چلے گئے[4]۔

۱۸۲۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے ایک فرزند زین العابدین بھی ریاضی اور فلکیات کے ماہر تھے۔ اصطرلاب خود بنایا کرتے تھے۔ انہوں نے پتنگ بنانے اور اڑانے کے اصولوں پر بھی ایک رسالہ تالیف کیا تھا۔ سید احمد خان کے دادا سید ہادی منصب دار تھے۔ ہزاری ذات پانصد سوار دو اسپہ سہ اسپہ شاہ عالم نے جواد الدولہ کا خطاب دیا تھا۔ سید ہادی کے فرزند اور سید احمد کے والد میر متقی کو شاہ عالم اور اکبر شاہ کے عہد میں دربار عام اور دربار خاص میں بلند منصب حاصل رہا۔ تصوف کی طرف میلان تھا۔ شاہ غلام علی کے مرید تھے۔ تیراکی اور تیر اندازی میں جو شرفائے دہلی کے فنون سمجھے جاتے تھے میر متقی کو ان میں کمال حاصل تھا[5]۔

سید احمد نے بچپن میں تیراکی اور تیر اندازی سیکھی۔ نانا کی حویلی کی چھتوں پر پتنگیں اڑائیں۔ گیند بلا اور کبڈی بھی کھیلی۔ مولوی حمید الدین سے کریما، خالق باری، آمد نامہ، گلستان اور بوستان پڑھیں۔ ماموں سے اقلیدس، ریاضی اور فلکیات کی تعلیم حاصل کی۔ طبابت بھی سیکھی[6]۔

عنفوان شباب میں راگ رنگ کی محفلوں اور رنگین صحبتوں میں شرکت کے شوقین رہے۔ مولانا حالی دہلی کی ایک ایسی محفل کا ذکر کرتے ہیں جس میں دہلی کی مشہور طوائف شیریں جان اپنی والدہ کے ساتھ موجود تھی۔ شیریں جان کی بدصورت والدہ کو دیکھ کر سید احمد کے ایک قدح باری دوست نے کہا،

ماورش بسیار تلخ است' سید نے فوراً کہا' لیکن بر شیریں دارد[7]۔

۱۸۳۸ء میں والد کے انتقال کے بعد مالی حالات خراب ہوئے تو انگریز سرکار کی نوکری کرنے کی ٹھانی۔ خالو کچہری میں صدر امین تھے ان سے کام سیکھنا شروع کیا پھر دہلی میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ ۱۸۴۱ء میں منصفی کا امتحان پاس کیا اور آگرہ میں منصف مقرر ہوئے۔ ۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ ظفر نے جواد الدولہ اور عارف جنگ کے خطابات سے نوازا۔ ان کے بھائی سید محمد دہلی سے "سید الاخبار" کے نام سے اخبار نکالا کرتے تھے۔ اس میں مضامین لکھتے رہے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک دہلی میں منصف رہے۔ اسی دوران شہر اور حوالی شہر میں واقع عمارات پر تحقیقات کا خیال پیدا ہوا۔ اپنے دیرینہ دوست مولوی امام بخش صہبائی کو ساتھ لیا۔ ایک ایک عمارت کا نقشہ تیار ہو رہا ہے۔ کتبے نقل کیے جا رہے ہیں۔ پیمائش ہو رہی ہے۔ محل' قلعے' حویلیاں' مسجدیں' مندر اور بازار یہاں تک کہ باؤلیاں اور کنوئیں بھی کھنگال ڈالے گئے۔ ڈیڑھ برس میں آثار الصنادید چھپ کر آ گئی۔

۱۸۵۴ء میں دوسرا ایڈیشن آیا جو پہلے ایڈیشن کی عبارت آرائی سے پاک تھا۔ ۱۸۶۱ء میں ممتاز فرانسیسی عالم اور مستشرق موسیو گارسیں دتاسی نے اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمے کو دیکھ کر رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے سید احمد کو اعزازی فیلوشپ عطا کی[8]۔

۱۸۵۸ء میں صدر امین ہو کر دلّی سے بجنور گئے اور وہاں قیام کے دوران انہوں نے آئین اکبری پر کام شروع کیا۔ کتابت کی غلطیوں کی تصحیح' فارسی' عربی' ترکی اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ کی شرح نیز حواشی تحریر کیے۔ غالب سے دیباچہ لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ منظوم فارسی دیباچے کا جو چھپ نہ پایا ترجمہ درج ذیل ہے:

احباب کو مژدہ ہو کہ یہ کتاب قدیم   سید کی کوشش سے منظرعام پہ آئی
چشم بینا ہوئی' بازو میں قوت آئی   قدامت نے جامۂ جدت زیب تن کیا
تاہم آئین اکبری کی تصحیح کے بارے میں انکی فکر   ان کی ہمت عالی کے لیے باعث عار ہے
اس مشغلے میں وہ اپنا جی بہلاتے رہے   اور ایک کار عبث میں مصروف رہے
جو اس کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ نہ ہو   وہی اس کام کو لائق ستائش سمجھ سکتا ہے
میں جو شیوۂ ریا کے خلاف ہوں   اور وفاکیشی میں اپنا رتبہ پہچانتا ہوں
میں اگر اس کام پہ انہیں داد نہ دوں   تو خود اس قابل ہوں کہ مجھے داد دی جائے
میں فن سخن میں بدکیش نہیں   اور گمان رکھتا ہوں کہ دوسروں سے زیادہ جانتا ہوں
آج دنیا میں اس مال کا کوئی خریدار نہ ہوگا   اور صاحب مال کو اس سے نفع کی امید نہ رکھنی چاہیے
انہوں نے سوچا ہوگا کہ یہ ایک وقیع دستاویز ہے   جانے انہیں کون سی قابل ملاحظہ چیز دکھائی دی
اگر نظام و آئین پر ہی بات ہوتی ہے   تو آنکھیں کھول کر اس دیر کہن میں

اہل انگلستان کو دیکھیں ان کے شیوہ و انداز پر نظر ڈالیں
انہوں نے کیسے کیسے آئین تخلیق کیے اور جو کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا انہوں نے کر دکھایا
ان ہنرمندوں سے ہنر نے ترقی پائی ان کی مساعی نے اسلاف پر سبقت حاصل کی
آئین داری کا حق اسی قوم کو حاصل ہے ان سے بہتر سلطنت چلانا کسی کے بس میں نہیں
انہوں نے علم و عدل کا ایک امتزاج پیدا کیا ہندوستان کو سو طرح سے آراستہ کیا
آگ جسے لوگ پتھر سے نکالتے ہیں یہ اہل ہنر کس طرح تنکے سے پیدا کر لیتے ہیں
ان لوگوں نے پانی پہ کیا افسوں پڑھ دیا ہے کہ دھواں پانی میں کشتی کھینچتا ہے
اور بھاپ سمندر میں کشتی اور روئے زمین پر پہیہ چلاتی ہے
بھاپ پہیئے کے دھرے کو گھماتی ہے اور بیل یا گھوڑے کی مانند کام کرتی ہے
کشتی دخان سے حرکت میں آتی ہے ہوا اور موجِ آب دونوں بے کار ہو گئے ہیں
یہ لوگ مضراب کے بغیر ساز سے نغمے پیدا کرتے ہیں اور حرف کو طائر کی مانند قوتِ پرواز بخشتے ہیں
تم دیکھتے نہیں کہ یہ صاحبان علم دو گھڑی میں سو کوس سے پیغام لے آتے ہیں
یہ حضرات ہوا میں آگ لگا دیتے ہیں ہوا انگارے کی طرح دہکنے لگتی ہے
لندن جا کر اس گلزارِ تاباں کو دیکھو راتوں کو یہ شہر بغیر چراغوں کے جگمگاتا ہے
ان صاحبِ ہوش لوگوں کے کام پر نظر ڈالو ان کے ہر آئین میں نئی طرز کے صدہا کام پاؤ گے
ان کے آئین نو کے آگے دیگر آئین پرانی جنتری کی حیثیت اختیار کر گئے
اے بیدار مغز دانش مند! کیا اس کتاب میں بھی اس طرح کے آئین موجود ہیں
جب کسی کو موتیوں کے خزانے دکھائی دے رہے ہوں تو وہ اس قدیم خرمن کی خوشہ چینی کیوں کرے گا
اگر تم کہو کہ اس کی طرزِ تحریر عمدہ ہے تمہیں تو اس سے بہتر طرز کا جویا ہونا چاہیے
ہر اچھے سے بڑھ کر اچھا موجود ہے سر ہے تو تاج بھی ہے
مبدءِ فیاض کو بخیل مت سمجھئے اس نخل سے تازہ رطب اب بھی برستے ہیں
مردہ پروری قابل تحسین کام نہیں تم ہی کہو وہاں گفتار کے سوا کیا رکھا ہے
غالب آئین خموشی سب سے دلکش ہے اگرچہ تو نے اچھی بات کہی لیکن نہ کہنا اچھا ہے
دنیا میں تیرا مسلک سید پرستی ہے تعریف نہیں دعا گوئی تیرا شیوہ ہے
سید احمد خان عارف جنگ کو جو سرتاپا علم و شکوہ کی تصویر ہیں
خدا ان کی سب دلی مرادیں پوری فرمائے اور خوش بختی ہمیشہ ان کی خدمت میں حاضر رہے[9]

اس نظم میں غالب نے تار برقی' دخانی جہاز اور ریلے کا ذکر کیا ہے۔ ریل کے سفر کے بارے میں

چند حوالے خطوط غالب میں ملتے ہیں۔ناموزوں نہ ہوگا اگر وہ اقتباسات یہاں درج کردیے جائیں۔
علاؤالدین علائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:
''کل شام کو مخدوم مکرم جناب آغا محمد حسین صاحب شیرازی بسواری ریل' مانند دولت ناگہاں ناگاہ آئے' فقیر کے تکیہ میں تشریف لائے۔نواب میر غلام بابا خان کے نام ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:
''رقعہ گلگوں نے سیر کی بہار دکھلائی' یہ سواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی' پانو سے اپاہج' کانوں سے بہرا' ضعف بصارت' ضعف دماغ' ضعف دل' ضعف معدہ' ان سب ضعفوں پر ضعف طالع کیونکہ قصد کروں۔چار بشانہ قدرو تقس میں کسی طرح بسر کروں۔''
نواب صاحب نے انہیں سورت آنے کی دعوت دی تھی جبکہ غالب طویل سفر کی صعوبتوں سے گھبرا رہے تھے۔[9A]

۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی کی شورش کی خبر بجنور پہنچی تو سید احمد نے وہاں موجود یورپین مردوزن کو مشتعل ہجوم کے گھیرے سے نکال کر رڑکی پہنچایا۔یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جب انگریزوں نے دہلی فتح کی تو سرکاری فوجیوں نے ان کا گھر لوٹ لیا۔ان کے ایک ماموں اور ایک ماموں زاد بھائی سرکاری سپاہیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔باقی خاندان جان بچا کر سلطان نظام الدین چلا گیا۔دوران غدر خدمات کے صلے میں سرکار نے ایک ہزار روپے مالیت کی خلعت دی اور دوسو روپے ماہوار پولیٹیکل پنشن مقرر کی۔ہوا خواہان سرکار کو باغیوں کی ضبط شدہ جاگیریں دی جاتی تھیں۔سید کو ایسی ہی ایک جاگیر کی پیشکش ہوئی لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا[10]۔

۱۸۵۹ء میں انہوں نے رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا جس میں مسلمانوں کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور ثابت کیا گیا کہ یہ کوئی منظم بغاوت یا انقلاب نہ تھا محض سپاہیوں کی حکم عدولی تھی اور وہ بھی بہ سبب جہالت اور مذہبی توہمات کے۔کتاب ترجمہ ہو کر گورنر جنرل کی کونسل کے سامنے پیش ہوئی تو فارن سیکرٹری نے اسے باغیانہ قرار دیا جبکہ گورنر جنرل اور دیگر ممبران نے اسے سرکار کی خیر خواہی پر محمول کیا[11]۔

۱۸۶۰ء میں سید احمد خان نے لائل محمڈنز آف انڈیا کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا' جس میں انگریز کے خیر خواہ اور خدمت گزار مسلمانوں کے حالات' ان کی خدمات' اور سرکار کی طرف سے عطا کردہ انعام و اکرام کی تفصیل چھپتی تھی۔اس کے محض تین نمبر ہی شائع ہو پائے اور مسلمان معززین کی عدم دلچسپی کی وجہ سے یہ سلسلہ چل نہ سکا' جس کا انہیں بہت دکھ ہوا۔انہوں نے ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو بھی تصحیح کر کے شائع کیا۔

غدر کے بعد انہوں نے مسلمانوں اور انگریزوں یعنی عیسائیوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے سلسلے میں تفسیر تبیین الکلام لکھنے اور چھاپنے کا آغاز کیا۔ان کا مقصد یہ تھا کہ اصول

اسلام اور اصول اہل کتاب میں ممکنہ حد تک مطابقت ثابت کی جائے اور جہاں اختلاف ہو وہاں اختلاف کی وجہ بیان کی جائے۔ اہل اسلام کی طرف سے اہل کتاب کو جو بدگمانیاں ہیں انہیں دور کیا جائے۔ نیز اہل اسلام جو موجودہ بائبل کو تحریف شدہ سمجھتے ہیں۔ ان کی اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کیا جائے تاہم علماء کی شدید مخالفت اور مالی مشکلات کی بنا پر یہ کام نامکمل چھوڑنا پڑا[12]۔

مئی ۱۸۶۰ء میں ان کا تبادلہ غازی آباد ہوا' وہاں انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور علمی و تاریخی کتابوں کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کا کام شروع کیا۔ انہوں نے غازی آباد میں ایک سکول بھی قائم کیا۔

۱۸۶۴ء میں وہ تبدیل ہو کر علی گڑھ آئے اور وہاں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔

۱۸۶۶ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اخبار جاری کیا اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔

۱۸۷۳ء میں علی گڑھ مدرسہ قائم کیا جو بعد از اں کالج اور آخر کار یونیورسٹی بنا۔ رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔۔۔۔۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو انتقال ہوا[13]۔

سرسید نے غالب کی جس تقریظ کو طنز کا تیر سمجھ کر شائع نہیں کیا تھا' سائنٹفک سوسائٹیاں بنانے میں شاید اس کا بھی کوئی اثر رہا ہو۔ سرسید اس حوالے سے غالب سے رنجیدہ خاطر رہے لیکن ۱۸۶۰ء میں جب غالب والی رام پور نواب کلب علی خان کی مسند نشینی کی تقریبات سے واپسی پر مراد آباد سے گزرے تو سرسید احمد خان نے جو وہاں صدر الصدور تھے دروازہ شہر پر غالب کا استقبال کیا اور انہیں مہمان بنا کر اپنے گھر لے گئے اور یوں دونوں کی باہمی رنجش کا خاتمہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ غالب کی پنشن اور دربار کی بحالی میں بھی سرسید احمد خان کی کوششوں کا دخل تھا[14]۔

حوالہ جات

1- خطوط بنام سرسید مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔ انجمن ترقی ادب لاہور۔
2-3- یادگار غالب از الطاف حسین حالی۔
4 تا 8 حیات جاوید از الطاف حسین حالی۔
9- از کلیات فارسی۔ غالب' ترجمہ: پروفیسر خورشید رضوی۔
9A- خطوط غالب غلام رسول مہر۔
10 تا 13 حیات جاوید از الطاف حسین حالی۔
14- یادگار غالب از حالی' مرزا غالب از متالیا پری گارینا۔

مشاہیر دلّی مشرف بہ تلمذ غالب

نواب ضیاء الدین احمد خان، بہادر نیر رخشاں

''ضیاء الدین احمد خان'' نام ہے ہندی میں رخشاں تخلص، فارسی میں نیر تخلص ہمانا نیر رخشاں ضیاء الدین احمد خان''

غالب بنام ہرگوپال تفتہ: ۹ ستمبر ۱۸۶۱ء[1]

والیٔ فیروز پور جھرکہ دلوہارو فخر الدولہ نواب احمد بخش خان بہادر کے فرزند تھے۔ فیروز پور جھرکہ میں اکتوبر ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۲۸ء میں نقل مکانی کر کے مستقل دہلی میں مقیم ہو گئے۔ خزانۂ ریاست سے اٹھارہ ہزار روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔

مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا فضل حق خیر آبادی اور غالب سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ فقہ، تفسیر، حدیث، منطق، فلسفہ اور زبان فارسی کے علاوہ تاریخ جغرافیہ ہیئت اور نجوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ دہلی میں بہت شاندار ذاتی ذخیرہ کتب تھا جو غدر کے دوران غارت ہوا۔ ایلیٹ نے انہی سے نایاب قلمی نسخے لے کر اپنی مشہور تاریخ مرتب کی۔ غالب نے انہیں اپنا خلیفۂ اوّل قرار دیا تھا[2]۔

کلیات فارسی میں ایک قصیدہ ان کی مدح میں ہے۔ فرماتے ہیں:

منم خزینۂ راز و درِ خزینۂ راز
ضیائے دین محمد کیں برادر من
بہ دین و دانش و دولت یگانۂ آفاق
بہ عمر کہتر و از روئے رتبہ بہتر من

۱۸۸۵ء میں انتقال ہوا اور حضرت خواجہ بختیار کاکی کی درگاہ کے احاطے میں دفن ہوئے۔ زیادہ تر کلام فارسی میں ہے[3]۔ چند اشعار بزبان اردو بطور نمونہ کلام پیش ہیں:

فلک گر نہ تھا بار اٹھانے کے قابل
تو کیا تھے ہمیں آزمانے کے قابل
شاید بہار آئی کہ جو منجّے جنوں
پھر کر رہا ہے جامہ و دستار تار تار
اے دل شاد الگ ہو مرے سینے میں نہ رہ
تجھ کو معلوم عزا خانے کے آداب نہیں

نواب علاؤالدین احمد خان بہادر علائی والیٔ لوہارو

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی[4]

علائی بیگم غالب کے چچازاد بھائی نواب امین الدین احمد خان کے فرزند اور ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں کے بھتیجے تھے۔ ۲۵ اپریل ۱۸۳۳ء کو دلّی میں پیدا ہوئے غالب کی زیرِ نگرانی تعلیم حاصل کی عربی، فارسی اور ترکی میں عالمانہ استعداد رکھتے تھے ترکی میں ایک لغت بھی مرتب کی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے غالب نے انہیں اپنا خلیفہ کلاں قرار دیا تھا۔ علائی کہتے ہیں:

علائی چو بر جائے غالب نشست
ورق بر درید و قلم در شکست

۳۶ برس کی عمر میں والد کی زندگی میں ریاست لوہارو کی گدی پر بٹھائے گئے[5]۔ لوہارو میں فخر المطابع کے نام سے چھاپہ خانہ قائم کیا علمی اور ادبی کتابیں شائع کیں۔ امیر الاخبار کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار بھی شائع کیا کرتے تھے۔ شطرنج کے لاجواب کھلاڑی تھے۔ یکم نومبر ۱۸۶۶ء کو دلّی میں شطرنج سوسائٹی قائم کی گئی جس کے ارکان میں کئی انگریز حکام بھی شامل تھے۔ اس سوسائٹی کے جلسے علائی کے مکان واقع بلی ماراں میں ہوا کرتے تھے[6]۔ علائی کے چند اشعار نمونۂ کلام کے طور پر پیش خدمت ہیں:

اللہ ری بے ثباتی عمر فنا پسند
بجھتا ہے یہ چراغ پلک کی ہوا کے ساتھ
مشت خاکستر ہے وہ بلبل کہ گلشن میں نہیں
داغ ہے وہ دل کہ خوں کے ساتھ دامن میں نہیں
جس جا کہ تھا ترانۂ بلبل نشاط خیز
اس جا پہ آج دل شکن آوازِ زاغ ہے

دنیا کی خیر و خوبی میں لیل و نہار کو
کب جانتی ہے خلق کہ کیوں کر گزر گئے

مولانا غلام رسول مہر نے اپنے مرتبہ خطوط غالب میں علائی کے نام غالب کے چھپن خطوط دیے ہیں۔۱۸۸۴ء میں انتقال ہوا[7]۔

میرزا شہاب الدین احمد خان ثاقب دہلوی

اے روشنیٔ دیدہ شہاب الدین خان
کتنا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضان
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک
سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآن

(غالب)[8]

ضیاء الدین احمد خان کے بڑے صاحبزادے تھے۔۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔تعلیم وتربیت والد کی زیرنگرانی ہوئی۔ثاقب تخلص غالب نے رکھا۔دہلی کے آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔۱۹اپریل ۱۸۶۹ء کو صرف ۲۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔چار صاحبزادے تھے۔چاروں شاعر ہوئے۔

شجاع الدین احمد خان تاباں' بہاء الدین احمد خاں طلب' سراج الدین احمد خان سائل اور ممتاز الدین احمد خان مائل[9] نمونۂ کلام:

گھر بیاباں میں بنایا نہیں ہم نے لیکن
جس کو گھر سمجھے ہوئے تھے وہ بیاباں نکلا
ہم سینہ سپر کیے کھڑے ہیں
وہ شوق سے خنجر آزمائیں
رہیں گے گرفتار صورت پرستی
اگر حسن معنی سے غافل ہوئے ہم
ہمیں ذوق صحرا نوردی ہے ثاقب
نہ سمجھو کے جویائے منزل ہوئے ہیں
رنجش سے گر کہا ہو تو ایماں نہ ہو نصیب
کافر بتوں کو کہتے ہیں عشاق پیار سے

میرزا فتح الملک بہادر غلام فخر الدین رمز

بہادر شاہ ظفر کے فرزند میرزا فخرو ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے' ولی عہد میرزا دارا بخت کے انتقال کے بعد ولی عہد مقرر ہوئے۔ بادشاہ کی چہیتی ملکہ زینت محل بیگم اپنے کمسن بیٹے شہزادہ جواں بخت کو ولی عہد بنانا چاہتی تھیں' بادشاہ انہی کے ہم نوا تھے۔ درخواست بازیاں ہوئیں' سازشیں ہوئیں لیکن تاج برطانیہ کا فیصلہ مرزا فخرو کے حق میں تھا۔ ۱۸۵۲ء میں ان کی ولی عہدی کا باقاعدہ اعلان ہوا۔ ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو اچانک ہیضہ میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ اس شبہ کا اظہار کیا جاتا رہا ہے کہ بیگم زینت محل نے انہیں زہر دلوایا تھا۔

رمز تخلص کرتے تھے' استاد ذوق سے اصلاح لیتے تھے' ان کے انتقال کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے' استاد مکرم کے لیے چار سو روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ میرزا زین العابدین عارف کے صاحبزادگان حسین علی خان اور باقر علی خان کے لیے ہر ماہ دس روپے پھلوں کے لیے دیتے تھے۔ غالب نے ان کی مدح میں تین قصائد لکھے[10]۔ حبیب اللہ ذکا کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"کس بجود نہ پذیر فت و دیر بازم بود
چو نامہ کہ بود نا نوشتہ عنوانش

یہ شعر میرا ہے ولی عہد خسرو دہلی میرزا فتح الملک بہادر مغفور کے قصیدے کا" ۱۸۶۶ء

میرزا فخرو کی ایک اہلیہ تھیں وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم' ان کے بطن سے ایک صاحبزادہ خورشید عالم[11] متولد ہوئے جو شاعر ہوئے۔ خورشید تخلص کرتے تھے۔ اس سے قبل وزیر بیگم کے کم از کم تین نکاح ہو چکے تھے' سب سے پہلے ایک انگریز مسٹر مارسٹن سے جس سے ایک لڑکا امیر مرزا اور لڑکی مسیح جان عرف پادشاہ بیگم ہوئیں۔ پادشاہ بیگم شاعرہ ہوئیں' حقی تخلص کرتی تھیں۔ اس کے بعد وزیر بیگم نواب شمس الدین خان کے عقد میں آئیں' جس سے ایک صاحبزادے میرزا خان پیدا ہوئے' جو نواب میرزا خان داغ کے نام سے شہرت دوام کے حامل ہوئے۔ نواب شمس الدین خان کی پھانسی کے بعد وہ محترمہ مولوی آغا محمد تراب علی کے حبالۂ عقد میں آئیں جن سے ایک شاعر فرزند شاہ محمد شائق پیدا ہوئے۔ ام الشعراء کا تذکرہ ضمناً آ گیا جو خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ میرزا خان قلعۂ معلی میں میرزا فخر الدین کے گھر میں پلے بڑھے[12]

میرزا فخرو کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں' جن میں ان کے استاد کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے:

سب کچھ آساں ہے تجھے گردش دوراں کرنا
ایک مشکل' مری مشکل کا ہے آساں کرنا
یاں یہ حالت کہ دم لبوں پر ہے
واں یہ غفلت کہ کچھ خیال نہیں

تم آؤ یا غم فرقت میں یہ کم بخت دم نکلے
تمنا کوئی تو دل کی ہمارے اے صنم نکلے
مانا کہ نہ دل لے کے تو مجھ سے وفا کرتا
پر دل کی تسلی کو وعدہ تو کیا ہوتا
وہ تو ملتا پر اے دل کم ظرف ... تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا
تم رہو اور مجمع اغیار ... میرا کیا ہے ہوا ہوا نہ ہوا
پھر تمہارے ستم اٹھانے کو ... رمز اچھا ہوا برا نہ ہوا[13]

شہزادہ خضر سلطان

خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے
غالب[14]

یہ شعر بہادر شاہ ظفر کے فرزند شہزادہ خضر سلطان کی ولادت (۱۸۲۱ء) پر غالب نے کہا تھا۔ ۲۳ ستمبر ۱۸۵۷ کو ۳۶ سال کی عمر میں ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار ہوئے اور اپنے بڑے بھائی مرزا مغل اور بھتیجے مرزا ابوبکر کے ہمراہ میجر ہڈسن کی گولی کا نشانہ بنے[15]۔

اردو میں شعر کہتے تھے غالب سے اصلاح لی۔ دو اشعار پیش خدمت ہیں:

مانا کہ ستم تم نہیں کرتے ہو کسی پر
غیروں پہ کرم ہو یہ ستم بھی نہیں تھوڑا
نہ کہہ سکتے ہیں کچھ اپنی نہ سن سکتے ہیں کچھ تیری
ہمیں اس وقت میں اے بے وفا دیکھا تو کیا دیکھا

نواب سید محمد ذکریا خان دہلوی

''سید محمد ذکریا خان نسب میں سید امیرزادہ عالی دودماں اُن کے بزرگ وزارت کا منصب پاچکے ہیں جاگیر اب تک تھی پھر بہ عوض جاگیر پنشن مقرر ہوئی معہذا یہ شخص بہ ذات خود نیک اور صاحب علم اور متواضع اور دانشمند اور نیک طینت اور رنگین طبع۔ شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں اس فن میں میرے شاگرد رشید ہیں۔''
(غالب)[16]

۱۸۳۹ء میں دلّی میں پیدا ہوئے فارسی غالب سے عربی اور منطق صہبائی سے اور ریاضی کی تعلیم

پنڈت رام کشن بسمل سے حاصل کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے، ترقی کر کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس بنے۔ مولوی حشمت اللہ حشمت، اسیر بدایونی اور سید احمد دہلوی مؤلف "فرہنگ آصفیہ" ان کے شاگردوں میں سے تھے[17]۔ ذکی تخلص کرتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ کریں:

وہی سبزہ وہی وحشت وہی ویرانی ہے
اور کیا دشت میں ہو گا جو مرے گھر میں نہیں
بے تکلف عشق ہے غارت گر ایماں اگر
حضرتِ ناصح کو کیا یہ بھی اگر کرتے ہیں ہم
ذکی مقامِ سعادت سمجھ کے بیٹھ رہو
حریم کعبہ نہیں ہے درِ مغاں نہ سہی
وہ سادگی سے تغافل کو ناز کہتے ہیں
مگر سکھاتی ہے شوخی کہ امتحاں کیجئے

منشی جواہر سنگھ جوہر دہلوی

"برخوردار کامگار سعادت و اقبال نشان منشی جواہر سنگھ جوہر کو بلب گڑھ کی تحصیلداری مبارک ہو۔ پہلی سے نوح آئے نوح سے بلب گڑھ گئے اب بلب گڑھ سے دلی آ ؤ گے ان شاءاللہ۔" ۲ فروری ۱۸۶۴ء[18]
غالب کے عزیز دوست رائے چھجمل کے فرزند تھے فارسی میں شعر کہتے تھے انگریزی عملداری میں تحصیلدار تھے۔ قاطع برہان اور اردوئے معلّی کی تاریخیں انہوں نے لکھیں:

چو اردوئے معلّی گشت تالیف
ہمانا یک جہاں گردید طالب
پے سال مسیحائی طبعش
بگو جوہر نخے اردوئے غالب

۱۸۶۹ء[19]

غالب اپنے دو شاگردوں احمد حسین میکش اور جواہر سنگھ جوہر پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم
شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ میکش از ماست
در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم[20]

جب تک ہمارے پاس دو سخنور میکش اور جوہر ہیں ہماری شان و شوکت ہی کچھ اور ہے۔ ہم پیرمغاں ہیں کہ میکش ہم سے ہے اور میدان کارزار میں تلوار ہیں کہ جوہر رکھتے ہیں۔

غالب ایک خط میں جوہر کو ملتانی ریشمی لنگی بھجوانے کی فرمائش کرتے ہیں:

''تمھیں یاد ہوگا میرے پاس ایک قراقلی ٹوپی تھی اسے کیڑا کھا گیا' اب مجھے ٹوپی نہیں ریشمی لنگی چاہئے جو پشاور اور ملتان میں بنتی ہے جسے وہاں کے معززین سر پر لپیٹتے ہیں۔ لنگی کا رنگ شوخ اور حاشیہ سرخ نہ ہو اور اس پر سونے چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے نقش و نگار بھی نہ ہوں۔ ایسی لنگی درکار ہے' جو سیاہ' سبز' نیلے اور پیلے ریشم سے بنی ہوئی ہو۔۔۔۔ اسے خرید کر ڈاک کے ذریعے مجھے بھیج دو اور قیمت بھی لکھ بھیجو۔ یہ میری فرمائش ہے اس لیے اس کی قیمت تمھیں مجھ سے لینا ہوگی پنچ آہنگ۔[21]

میر مہدی حسین مجروح

''او میاں! سید زادہ' آزادہ' دلّی کے عاشق دلدادہ' ڈھیے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے نہ دل میں مہر و آزرم' نہ آنکھ میں حیا و شرم' نظام الدین ممنون کہاں' ذوق کہاں' مومن کہاں' ایک آزردہ سو خاموش' دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش نہ سخنوری رہی نہ سخن دانی' کس برتے پر تتا پانی' ہائے دلّی وائے دلّی بھاڑ میں جائے دلّی۔''[22]

غالباً ۱۸۳۳ء میں دلّی میں پیدا ہوئے والد کا نام میر حسین فگار تھا۔ غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی دارو گیر میں پانی پت چلے گئے اور مولانا حالی کے آبائی محلے انصاریوں کے محلے میں قیام پذیر ہے۔ بعد ازاں دلّی لوٹ آئے لیکن تلاش معاش میں الور جانا پڑا' مہاراجہ شیودھیان سنگھ نے قدردانی کی' نائب تحصیلدار بنے پھر تحصیلدار ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں مہاراجہ کی معزولی کے بعد جے پور چلے گئے' وہاں نائب کوتوال رہے۔ ۱۸۸۰ء میں راجا رام سنگھ کی وفات کے بعد رام پور چلے گئے۔ نواب حامد علی خان بہادر نے عزت افزائی اور پذیرائی کی۔ ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء کو انتقال ہوا' وفات سے پہلے چند بار اغفرلی الٰہی کہا وہی ان کی تاریخ وفات ہے۔ غالب کی وفات پر سب سے پہلا مضمون میر مہدی ہی نے لکھا جو ۱۷ فروری ۱۸۶۹ء کے اکمل الاخبار میں رشک عرفی و فخر طالب مرد کے زیر عنوان چھپا۔ غالب کی لوح مزار پر کندہ قطعہ تاریخ وفات میر مہدی ہی کا کہا ہوا ہے:

کل میں غم و اندوہ میں با خاطر محزوں
تھا تربت او ستاد پہ بیٹھا ہوا غم ناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا گنج معانی ہے تہ خاک[23]

ان کا دیوان مظہر معانی کے نام سے شائع ہوا۔ دو نثری رسالے ''انوار الاعجاز'' آنحضرتؐ کے معجزات پر اور ہدیۃ الائمہ سیرت نبویؐ اور سیرت آئمہ پر چھپے۔[24]

میر احمد حسین میکش دہلوی

''میکش چین میں ہے باتیں بناتا پھرتا ہے' سلطان جی میں تھا اب شہر میں آ گیا ہے' دو تین بار میرے پاس بھی آیا' پانچ سات دن سے نہیں آیا' کہتا تھا بی بی اور لڑکے کو بہرام پور میر وزیر علی کے پاس بھیج دیا ہے خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا ہے۔''

۷ فروری ۱۸۵۸ء بنام میر مہدی[25]

دلّی کے سادات میں سے تھے' والد کا نام میر کرار حسین تھا' صہبائی کے شاگرد تھے' پھر غالب سے اصلاح لینے لگے' فارسی میں شعر کہتے تھے' ایک شعر ہے:

گفتمش دی کہ بابا رفتی خراماں سوئے باغ
گفت میکش بودہ باشد' کاں گرفتارِ من است

غدر کے بعد گرفتار ہوئے اور پھانسی پائی[26]۔

''احمد حسین کا حال کچھ تم کو معلوم ہے' مخفوق ہوا گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں۔''[27]

خواجہ میرزا قمر الدین خان راقم دہلوی

غالب کی ایک انتہائی ناپسندیدہ شخصیت خواجہ حاجی جنہیں نواب احمد بخش خان نے غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خان کے وارثوں میں شامل کر دیا تھا اور غالب اس زیادتی کے خلاف کلکتے تک جا کر مقدمے لڑتے رہے اور لندن تک درخواستیں ارسال کیں' وہی خواجہ حاجی راقم دہلوی کے دادا تھے' غالب انہیں اپنے دادا مرزا قوقان بیگ کا سائیس بتاتے تھے' خواجہ حاجی کے ایک صاحبزادے تھے خواجہ بدر الدین عرف خواجہ امان' انہوں نے ''بوستانِ خیال'' کا اردو میں ترجمہ کیا' اس کی ایک جلد پر جو ''حدائق الانظار'' کے نام سے چھپی' غالب نے دیباچہ تحریر کیا اور خواجہ امان کو اپنا بھتیجا بتایا۔

''برادر زادہ سعادت توامان خواجہ بدر الدین خان عرف خواجہ امان کہ وہ ایک جوان شیریں بیان تیز ہوش ہے اور ہر فن کے کمال کی تحصیل میں تخت کش و سخت کوش ہے' ستار کا خیال ہوا ایسا بجایا کہ میاں تان سین کو انگلیوں پر نچایا' مصوری کی طرف جو طبیعت آئی وہ تصویر کھینچی کہ اس کو دیکھ کر مانی و بہزاد کو حیرت آئی' اس اقبال آثار کا یہ ارادہ ہوا کہ معزنامہ کی فارسی نثر کے اردو کرنے پر آمادہ ہوا۔'' (دیباچہ حدائق الانظار)[28]

راقم خواجہ امان کے فرزند تھے۔ ۱۸۳۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے' سولہ برس کی عمر میں قلعہ معلّٰی میں

ملازم ہوگئے بہادر شاہ ظفر سے تیر اندازی سیکھی۔ ولی عہد مرزا فخرو کے دامن دولت سے وابستہ رہے۔ ۱۸۵۶ء میں ان کے انتقال کے بعد الور چلے گئے جہاں ان کے والد مہاراجہ شیودھیان سنگھ کے اتالیق رہے تھے۔ ۱۸۵۸ء میں جب راجپوتوں نے مسلمانوں کو ریاست سے نکالا تو واپس دلّی آگئے اور بوستان خیال کے ترجمے اور اشاعت میں والد کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ ان کی شادی غالب کے بھانجے میرزا عاشور بیگ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ بعد ازاں دلّی چھوڑ کر جے پور چلے گئے جہاں مارچ ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔ ۱۹۰۱ء میں نغمہ اردو کے نام سے کلیات شائع ہوئی۔ فلکیات پر سبعہ سیارہ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ دیوان غالب کی ایک شرح بھی لکھی تھی، جو شائع نہ ہوسکی۔[29]

جاں نذر میں نہ کر سکا میرا قصور تھا
خنجر گلے پہ روکنا کس کا قصور تھا
دیکھ کر حضرتِ واعظ کو خدا کی سوگند
کفر اچھا ہے ہمیں، ہم نے تو ایماں چھوڑا
حسن زیبا لاکھ نظروں سے چھپاتے جایئے
اور کھلتا جائے گا جتنا چھپاتے جایئے
اس کے وعدے کی انتہا ہے نہ حد
عمر اپنی کرے وفا کب تک
آ جاؤ پھرتے چلتے کبھی غم کدہ میں تم
آنکھوں سے ہم بھی دیکھ لیں آنا بہار کا
ہائے راقم نہ رہے حضرتِ غالب سر پر
قدر فرزند کی ہوتی ہے پدر کے ہوتے

نواب محمد علی خان بہادر رشکی

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے بڑے صاحبزادے ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے تعلیم اپنے والد، مفتی صدر الدین آزردہ اور مولانا حالی سے حاصل کی۔ انگریزی میں عمدہ استعداد رکھتے تھے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے غالب سے اصلاح لی۔

سرکار انگریزی کی طرف سے ضلع بلند شہر میں مجسٹریٹی اختیارات رکھتے تھے۔ ۱۸۹۰ء میں صوبہ جات متحدہ کی طرف سے وائسرائے کونسل کے ممبر نامزد ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں خان بہادر اور نواب کے خطابات ملے۔ ۲۰ مئی ۱۸۹۸ء کو وفات پائی[30] اور والد کے پہلو میں سلطان جی میں دفن ہوئے۔ ان کا یہ

شعر تو زبان زد عام ہے:

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں
شکوے ہمارے سارے غلط ہی سہی مگر
لو تم ہی اب بتاؤ کہ کس کا قصور تھا
رنجش کا گرچہ کوئی سبب درمیاں نہ تھا
لیکن وہ آپ صلح کریں یہ گماں نہ تھا
ہے دگرگوں ابتدائے عشق میں رشکی کا حال
رحم آتا ہے مجھے اس کی جوانی دیکھ کر

نواب محمد مصطفیٰ خان دہلوی شیفتہ وحسرتی

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

(غالب)

عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خان بہادر مظفر جنگ بنگش کے فرزند تھے۔ مرتضیٰ خان طوائف الملوکی کے دور میں مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر کے لشکر میں شامل ہوئے۔ لارڈ لیک اور ہلکر کے درمیان ان کی کوششوں سے صلح ہوئی۔ ۱۸۱۲ء میں لارڈ لیک نے ضلع گوڑگانوہ میں تین لاکھ سالانہ کی جاگیر تاحین حیات عطا کی۔ اگلے سال انہوں نے جہانگیر آباد ضلع میرٹھ اپنے فرزند محمد مصطفیٰ خان کے نام پر خرید لیا۔ ان کی وفات کے بعد لارڈ لیک کی عطا کی ہوئی جاگیر بحق سرکار واپس ہوگئی' لیکن خرید کردہ جاگیر برقرار رہی۔ سرکار انگریزی سے بیس ہزار روپے سالانہ وظیفہ مصطفیٰ خان کو ملتا رہا۔ محمد مصطفیٰ خان ۱۸۰۵ء میں دلّی میں پیدا ہوئے' وہیں تعلیم حاصل کی غزل اور فارسی میں کامل دستگاہ تھی' اردو اور فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ جوانی میں بادہ وساغر سے شغف رہا' غالب کی طرح عرق گلاب میں ملا کر پیا کرتے تھے:

ما حسرتی ز شیوۂ غالب گرفتہ ایم
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

ایک مطربہ مسماۃ رجو سے شناسائی ہوئی' وہ شاعرہ تھی' نزاکت تخلص کرتی تھی' کچھ عرصہ شیفتہ کے گھر میں بھی رہی۔

جوانی میں ہی تائب ہو کر تصوف کی طرف مائل ہو گئے' شاہ محمد اسحاق سے بیعت کی' ان کے انتقال کے بعد شاہ غلام علی نقشبندی اور پھر شاہ عبدالغنی مجددی سے فیوض باطنی حاصل کیے' ان سے سند خلافت حاصل کر کے خود صاحب اجازت ہوئے۔ ۱۸۳۹ء میں حج پر تشریف لے گئے' حالات سفر ایک فارسی سفرنامہ ''ترغیب السالک الیٰ احسن المسالک'' میں تحریر کیے۔

۱۸۵۷ء کی شورش کے دوران جہانگیر آباد کو غیر محفوظ جان کر خان پور میں جا مقیم ہوئے' ٹھاکروں نے جہانگیر آباد لوٹ لیا' ان کا گھر اور کتب خانہ نذرِ آتش کر دیا گیا۔ رامپور کی فوج کی مدد سے جہانگیر آباد پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا گیا۔ غدر کے بعد ان پر اس جرم میں مقدمہ قائم کیا گیا کہ وہ اپنی جاگیر غیر محفوظ چھوڑ کر اعانت مجرمانہ کے مرتکب ہوئے ہیں' سات سال کی سزا ہوئی' اپیل میں بری ہوئے اور جاگیر بھی واگزار ہوئی [31]۔ ۲ فروری ۱۸۵۹ء کو غالب ایک خط میں میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

''نواب مصطفیٰ خان بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے' سوان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی' صرف رہائی کا حکم ملا ہے' جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلّی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ملا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں' میں بہ مجرد اس خبر کے استماع کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا' ان کو دیکھا' چار دن وہاں رہا' پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔''[32]

شیفتہ اردو ریختہ میں مومن خان مومن کے شاگرد تھے۔ مومن کی وفات کے بعد ریختہ اور فارسی دونوں غالب کو دکھاتے رہے۔ قید و بند کے دوران غالب کی دامے درمے قدمے سخنے اعانت کی' جس کے اعتراف میں غالب کہتے ہیں:

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غم خوار من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ عزا دار من است [33]

الطاف حسین حالی شیفتہ کے مصاحب تھے اور ان کے صاحبزادے نواب نقش بند خان مہجور کے اتالیق' خود شیفتہ کو اپنا استاد مانتے تھے۔

شیفتہ ایک بلند پایہ تذکرہ نگار اور نقاد بھی تھے۔ انہوں نے اردو شعراء کا تذکرہ زبان فارسی میں تحریر کیا' جو گلشن بے خار کے نام سے ۱۸۳۷ء میں شائع ہوا۔[34] اسی کتاب کے حوالے سے غالب ایک خط میں شیفتہ کو لکھتے ہیں:

''تم نے تو ایک گروہ کو اپنے رشحات قلم سے حیات جاوداں عطا کی ہے اور ہر ایک کو نیکی سے یاد کیا ہے' پھر یہ کیا ہوا کہ ردیف الف میں حضرت مفتی صدرالدین آزردہ کے اشعار پروین نثار کے ترجمہ سے تم نے اپنے قلم کو گوہر فشاں نہیں کیا۔'' [35]

۱۸۵۷ء سے پہلے کا اکثر کلام ضائع ہو گیا' کلیات ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ غالب کے سال وفات ۱۸۶۹ء ہی میں ۶۳ برس کی عمر میں دلّی میں انتقال کیا۔[36]

مفتی صدرالدین آزردہ نے فغانِ دہلی میں شیفتہ کی قید و بند کے حوالے سے لکھا:

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جان پہ بن آتی ہے مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو[37]

مصطفیٰ خان شیفتہ کے بے شمار اشعار زبان زد عام ہیں۔ چند نمونے کے اشعار ملاحظہ کریں:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
ہے آگ سی اک جو سینے کے اندر لگی ہوئی
اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ
اظہارِ عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا
ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام گر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا
وہ شیفتہ کہ دھوم ہے حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے
فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لیے
یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی
صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا
جو بات ہے کدے میں ہے اک اک زبان پر
افسوس مدرسے میں ہے بالکل نہاں ہنوز
دل لگایا تو ناصحوں کو کیا
بات جو اپنے جی میں آئی کی

شیفتہ وہ کہ جس نے ساری عمر
دینداری و پارسائی کی
آخرکار مے پرست ہوا
شان ہے اس کی کبریائی کی

اور

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں [38]

حوالہ جات

2-1 تلامذۂ غالب از مالک رام
3- دیوانِ غالب از مرزا اسد اللہ خان غالب
4- خطوط غالب از غلام رسول مہر
6-5 تلامذۂ غالب از مالک رام
7- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر
9-8 تلامذۂ غالب از مالک رام
10- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر
11- تلامذۂ غالب از مالک رام
12- دیوانِ غالب از مرزا اسد اللہ خان غالب
13- تلامذۂ غالب' مالک رام
14- خطوط غالب غلام رسول
15- تلامذۂ غالب از مالک رام
16- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر
18-17 تلامذۂ غالب از مالک رام

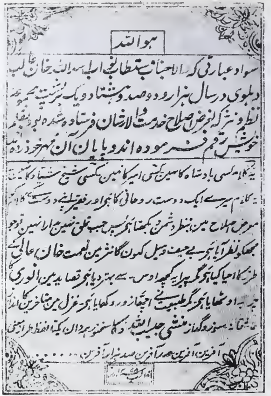

هو الله

سواد عبارتی که رأس الاحباب مستطاب نجم الدوله اسد الله خان غالب دہلوی در سال ہزار و دو صد و ہشتاد و یک بر نسخۂ مجموعہ نظم و نثر که بغرض اصلاح خدمت فیض درجات ارشان فرستاده شده بود بقلم خویش رقم فرموده اند و پایان آن بمہر خود زده اند

یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں کسی امیر کا نہیں کسی شیخ شہزادہ کا نہیں یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے اور فقیر اپنے دوست کا کلام معرض اصلاح میں بنظر دشمن دیکھتا ہے سو جب تعلق نہیں ہے اور نہیں توجہ مجھکو نظر آیا ہے بے حیف و بیل کہوں گا نثر میں نعمت خان عالی کے طرز کا احیا کیا ہے مگر پیرایہ کچھ اوس سے بہتر دیا ہے قصاید میں انوری کا تتبع اوٹھایا ہے مگر طبیعت نے اعجاز دکھایا ہے غزل میں متاخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گداز منشی حبیب اللہ ذکا سخنور ہمدان یکتا افراد اہل زمین

آفرین ہا آفرین صد آفرین صد ہزار آفرین ......

حبیب اللہ ذکا کے مجموعۂ نظم ونثر فارسی 'خاش وخماش' پر غالب کا تحریر کردہ پیش لفظ

19- پنج آہنگ از مرزا اسداللہ خان غالب
20- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر
21-22 تلامذۂ غالب از مالک رام
23- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر
24- تلامذۂ غالب از مالک رام
25- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر
26- مجموعۂ نثر غالب مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی
27- تلامذۂ غالب از مالک رام
28-29 ایضاً
30- خطوط غالب، غلام رسول مہر
31- سبد چین از مرزا اسداللہ خان غالب
32- تلامذۂ غالب از مالک رام
33- پنج آہنگ از مرزا اسداللہ خان غالب
34-35-36 تلامذۂ غالب از مالک رام

دلّی کے دو صوفی.... ایک تونگر ایک قلندر

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

"اگر تیرا جنون کامل ہو تو کاشی سے کاشان تک آدھے قدم کا فاصلہ ہے' اس کے لیے ضروری ہے کہ تو خوشبو کی طرح اپنے لباس اعتباری سے باہر آ اور قید جسم سے باہر نکل معرفت اور پہچان کا راستہ نہ چھوڑ.... ہوس کو فنا کر' دل کی آگ سے اپنے نفس کو پگھلا' دل کو مصائب اور امتحانوں سے خوں کر' خرد سے گتھیاں نہیں کھلتیں جنون اختیار کر' جب تک تیری سانس نہ اکھڑ جائے جادہ پیمائی ترک نہ کر' شرارے کی طرح فنا کا سامنا کرتے ہوئے اٹھ دامن جھاڑ اور آزاد ہو جا۔ اِلا کا دَم بھر اور لا کے آگے سپر ڈال دے۔ اللہ اللہ کہہ اور ماسوا کو پھونک ڈال۔"

(از مثنوی چراغِ دیر)[1]

دلّی بائیس خواجہ کی چوکھٹ کہلاتی ہے' حضرت قطب الاقطاب' حضرت سلطان الاولیاء اور حضرت بوعلی قلندر کا شہر ہے.... پانی پت دلّی کا مضافات ہی تو ہے۔ میں یہاں محض دو صوفی حضرات کا ذکر کروں گا جو غالب کے زمانے میں دلّی میں موجود تھے اور غالب سے ان کا ایک گہرا تعلق بھی تھا' ان میں سے ایک حضرت غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب اور دوسرے حضرت شاہ غوث علی قلندر پانی پتی ہیں۔

غالب "مہر نیمروز" میں لکھتے ہیں:

"بیدار دل' صاحب بصیرت' پاک سرشت' بلند نژاد' راہ سیر و سلوک کا جادہ شناس اور جادہ فقر و فنا کا راہ نما' شاہد یقیں کے مشاہدہ جمال میں محو' مولانا محمد نصیر الدین پر فخر کرتا ہوں کہ جو کوئی اس ہمایوں آثار دیوار کے سائے میں قدم رکھے تو تعجب کی بات نہیں اگر اس کا سایہ فردوس کے دروازے پر پڑ جائے۔ خلقت کی زبان پر اس کی تعریف اور بینائی کی آنکھیں اس سے روشن' منصور کے ترانے (انا الحق) کی اس کے حق نیوش تک رسائی نہیں اور بایزید کے زمزمے (سبحانی ما اعظم شانی) کا اس لب حق گو کے ساتھ کیا کام۔ اگر دوسرے

ے نوش تھے تو (ہمارا) آغا میخانہ نوش ہے' جو دوسروں کے لیے خم ہے اس کے لیے جام۔ سب میں موجود ہو کے سب سے الگ! اور تمام خلق کے ساتھ خلق کی طرح موجود!! جب سے میں ان کا ہمسایہ ہوا ہوں آسمان والے میرے سائے میں ہیں اور جب سے اس کے دروازے کا خاک نشیں ہوں فرشتے میرے مرتبے پر رشک کرتے ہیں' روشن دل لوگوں کے دل و دیدہ میں میرا مقام ہے اور ماہ و انجم پہ میرے قدم ہیں۔"

(مہر نیمروز)[2]

غلام نصیر الدین عرف کالے میاں' معروف صوفی بزرگ حضرت فخر الدین فخر عالم کے پوتے اور جانشین تھے آپ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے خلیفہ اور بہادر شاہ ظفر کے پیر تھے۔ ان کا مکان گلی قاسم جان میں تھا' غالب کافی عرصہ ان کے مکان میں رہے۔ انہی کی تحریک پر بہادر شاہ ظفر نے غالب کی دربار میں پذیرائی کی اور انہیں نجم الدولہ' دبیر الملک' خان بہادر اور نظام جنگ کے القاب و خطابات سے سرفراز کیا۔

بادشاہ سلامت نے لاکھوں روپے کے خرچ سے ایک شاندار حویلی تعمیر کرا کر کالے صاحب کو نذر کی تھی جس میں باغ تھا نہر بہتی تھی اور متعدد شاندار مکانات تھے۔ بادشاہ اکثر و بیشتر ان کی زیارت کو تشریف لایا کرتے تھے۔[3] غدر کے دوران یہ حویلی لٹ گئی۔ بیگم غالب نے پیر صاحب کی حویلی کو محفوظ جان کر اپنے زیورات یہاں رکھوائے تھے جو غارت ہوئے۔ بعد ازاں تمام جائیداد انگریز حاکموں نے ضبط کر لی۔ کالے صاحب کے فرزند میاں غلام نظام الدین کی شادی پر بھی شاہ ظفر نے ہزاروں روپے خرچ کیے۔[4]

سید ناصر نذیر فراق دہلوی لکھتے ہیں:

"حضرت میاں کالے صاحب بھی لال قلعہ جایا کرتے تھے اور بادشاہ سلامت بھی حضرت کے دولت خانے پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک بار بادشاہ سلامت کچھ حضرت سے رنجیدہ ہو گئے' حضرت کو تو کیا غرض پڑی تھی جو لال قلعہ میں جاتے' مگر بادشاہ سلامت بھی اپنی بادشاہت کے گھمنڈ میں حضرت کے سلام کے لیے حضرت کی حویلی میں کئی دن تک حاضر نہ ہوئے۔ آخر بادشاہ سلامت کو اللہ نے سمجھ دی اور وہ یہ سمجھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی جو میں پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر نہ ہوا' مگر اب چلنا چاہیے خود بدولت ہاتھی پر سوار ہوئے' حکیم احسن اللہ صاحب وزیر کو ساتھ لیا۔ جب حضرت کے دروازے پر پہنچے تو ہاتھی پر سے اترے۔ حکیم صاحب سے کہا کہ رومال سے میرے ہاتھ باندھ دیجئے۔ اتنے میں حضرت کے صاحبزادے میاں غلام نظام الدین صاحب آ گئے' ان کی عمر اس وقت پانچ چھ برس سے زیادہ نہ تھی۔ بادشاہ سلامت کو دیکھ کر بھولے منہ سے فرمانے لگے' ہمارے اباجان کے پاس الٹے بالوں والے (یعنی سکھ) آئے تھے' نری اشرفیاں دے گئے ہیں' کوٹھڑی میں ڈھیر لگ رہا ہے۔ بادشاہ سلامت اس بات کو سن کر سُن ہو گئے۔ اطلاع کرائی کہ بہادر حاضر ہے' حکم ہو تو روبرو حاضر ہو' جواب ملا شوق سے تشریف لائیں' جب بادشاہ میاں صاحب کے سامنے رومال سے ہاتھ بندھے پہنچے تو کہا:

بر درآمد بندۂ بگریختہ آبروئے خود بصیاں ریختہ

اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ میاں کالے صاحب نے اٹھ کر بادشاہ سلامت کے ہاتھ کھول دیے اور گلے سے لگایا۔

بادشاہ سلامت: حضور! اپنے بڑوں کا صدقہ اس غلام کی خطا معاف کیجئے!

میاں کالے صاحب: میں نے تمہاری خطا معاف کی اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ میرے اور تمہارے گناہوں کو بخش دے۔ ابوظفر تم نے جو یہ خیال پکا یا تھا کہ غلام نصیر الدین کے بال بچے لال قلعہ سے پلتے ہیں' یہ تمہارے دماغ کا قصور تھا' تمہیں یہ بھید نہیں معلوم جب میں نے تونسہ شریف حاضر ہو کر شاہ سلیمان صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تو حضرت نے فرمایا' دیکھو! ہم بات ضرورت سے زیادہ نہ کرنا۔ میں نے عرض کی' بہت خوب۔ اس دن سے میں برائے نام بولتا ہوں' نہیں اشاروں ہی سے کام لیتا ہوں' پھر ارشاد کیا کہ آنکھیں بند کرو۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کیں' تو دیکھا کہ میں ایسی زمین پر ہوں' جو سونے کی بنی ہوئی ہے اور شاہ سلیمان صاحب کے ہاتھ میں چاندی کا کھرپا ہے وہ کھرپا آپ نے میرے ہاتھ میں دے کر فرمایا سونے کی جس قدر ضرورت ہو اس زمین میں سے کھود لینا اور خرچ کرنا' مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے' اس زمین میں سے سونا کھودتا ہوں اور خرچ کرتا ہوں۔ اس اٹھوارہ میں جو تم نہیں آئے کسی نے مجھے چاندی کا روپیہ نہیں دیا' جس نے دی اشرفی سونے کی دی۔ ایک فوج کی فوج سکھوں کی آئی اور ڈھیر ساری اشرفیاں دے گئی۔'' یہ فرما کر میاں نے نوکر کو اشارہ کیا' اس نے کوٹھڑی کا دروازہ چوپٹ کھول دیا اور بادشاہ سلامت نے دیکھا کہ کوٹھڑی اشرفیوں سے پڑی جگمگا رہی ہے۔ بادشاہ سلامت نے یہ تماشا دیکھ کر اپنے جی میں کہا' چھوٹے میاں نے ڈیوڑھی پر چچ فرمایا۔ فراق صاحب ہی لکھتے ہیں کہ غدر میں جب میاں کالے صاحب کی حویلی لٹی ہے تو لوٹنے والوں نے چودہ چھکڑے سونے چاندی کے پائے پٹیوں والے پلنگ سے بھرے تھے[5]۔

''ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ تم نے کسی سے محبت بھی کی ہے؟ کہا کہ ہاں! حضرت علی المرتضیٰؓ سے۔ پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا' واہ صاحب! آپ تو مغل بچے ہو کر علی المرتضیٰؓ کی محبت کا دم بھریں' ہم ان کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آ سکتی ہے؟''

(تذکرۂ غوثیہ)[6]

سید غوث علی شاہ قلندر قادری ۷ دسمبر ۱۸۰۴ء بروز جمعہ کو پانی پت میں پیدا ہوئے' آپ حسنی سادات میں سے تھے' ابوالحسن خورشید علی (۱۸۸۰ء میں انتقال فرمایا) عرف سید غوث علی شاہ قلندر بن سید احمد حسن عرف احمد علی بن سید ظہور الحسن سترہ سلسلوں سے آپ کا نسب حضرت غوث اعظم سید عبدالقادر جیلانی سے جا ملتا ہے

اور بتیس واسطوں سے حضرت امام حسن مجتبیٰ سے۔

مولانا شاہ گل حسن قادری لکھتے ہیں:[7]

''چونکہ والدہ ماجدہ شریفہ حضرت رحمۃ اللہ علیہا کو ایک قسم کا جنون تھا، اس لیے جد امجد یعنی جناب سید ظہور الحسن صاحب نے ان کا دودھ پلانا مناسب نہ سمجھا۔ فکر رضاعت میں سرگرم ہوئے۔ اتفاقاً قرب وجوار میں ایک پنڈت نیک شعار رام سینہی نام رہتے تھے، معلوم ہوا کہ ان کی بیوی جو نیک منش اور حمیدہ خصائل ہیں، دودھ پلا سکتی ہیں۔ آپ نے ان کو طلب فرمایا اور ان کے دامن تمنا کو ثمر مراد سے پُر کیا۔

اُٹھو اے مدتوں کے سونے والو
تمہارے در پہ یہ دولت کھڑی ہے

زہے قسمت اس پنڈتانی مائی کی جس کو یہ دولت سرمدی نصیب ہوئی۔ سچ ہے ''بن مانگے موتی ملیں مانگے ملے نہ بھیک''، بخوشی وخرمی دودھ پلانا شروع کیا۔ نام آپ کا حضرت جد امجد نے خورشید علی شاہ رکھا تھا اور والد بزرگوار نے ابوالحسن، بڑی والدہ صاحبہ نے غوث علی اور پنڈتانی مائی نے گنگا بشن۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم چار برس چار مہینے کے ہوئے تو بڑی والدہ صاحبہ نے بسم اللہ پڑھا کر قرآن شریف شروع کرایا اور پنڈت رام سینہی صاحب نے جو پدر رضاعی تھے، نرنکار کا نام لے کر شاستر کا آرنبھ کیا۔ دس برس کی عمر میں قرآن شریف نصف حفظ کر لیا اور نصف ناظرہ پڑھا۔ کتب فارسیہ بھی تا سکندر نامہ بڑی والدہ صاحبہ سے پڑھیں اور سنسکرت سارتھ سدھ چندر کا تک پنڈت جی سے حاصل کی اور عربی کی صرف نحو نانا محمد حیات صاحب سے، جو بڑی والدہ صاحبہ کے والد تھے، پڑھی۔ بعد چند مدت کے ہمارے والد ماجد نے اپنے پاس دہلی میں بلا لیا۔ یہاں مولوی محمد اسماعیل صاحب سے ایک سبق کافیہ کا اور مولوی شاہ اسحاق صاحب سے اور مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب سے حدیث شریف پڑھی۔ باقی کتابیں مولوی فضل امام صاحب خیر آبادی سے پڑھیں[8]۔

ابتدائی بیعت والد ماجد سے کی، پھر والد بزرگوار اولیاء اللہ کی خدمت میں لے جانے لگے اور بیعت بھی کرائی۔ اعظم علی شاہ صاحب سے بیعت ہوئے، انہوں نے خلافت عطا کی اور اپنی اولاد کو ان سے بیعت کرایا، پھر انہوں نے ہی میرٹھ مولوی حبیب اللہ شاہ صاحب کے پاس بھیجا۔ ایک برس وہاں رہے، جب سلوک طے ہو گیا تو مولوی صاحب نے خلافت عطا فرمائی اور اپنی اولاد کو مرید کرایا۔ سیروا فی الارض کے مصداق عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ اللہ کی زمین کی سیر وسیاحت میں گزارا۔ ایک بار چھ ماہ تک دہلی کی زینت المساجد میں قیام پذیر رہے۔ تذکرہ میں ہے:

''ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے، نہایت حسن اخلاق سے ملے۔ لب فرش تک آ کر لے گئے، تمام حال دریافت کیا، ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند ہے، علی

بالخصوص یہ شعر:

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو
تیرے کوچہ کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب! یہ شعر میرا تو نہیں کسی استاد کا ہے، فی الحقیقت نہایت اچھا ہے۔

اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کرلیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلیف نہ کیجئے، مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ میخوار وسیاہ کار گنہ گار مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ البتہ اوش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔ ان کے مزاج میں کمال کسر نفسی اور فروتنی تھی[9]۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ مرزا رجب علی سرور مصنف ''فسانہ عجائب'' لکھنو سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے؟ کہا چہار درویش کی! میاں رجب علی بولے اور ''فسانہ عجائب'' کیسی ہے؟ مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے اجی لاحول ولاقوۃ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔ اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا، بہت افسوس کیا اور کہا کہ ظالمو! پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا۔ آیئے آج ان کے مکان پر چلیں۔ کل کی مکافات کر آئیں۔ ہم ان کے ہمراہ ہو لیے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات میں نے ''فسانہ عجائب'' کو جو بغور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں' نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی اور نہ آگے ہوگی اور کیوں کہ اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت بھی کی اور ہم کو بھی بلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور درحقیقت یہ خیال درست تھا۔ المومن من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ:

مباش در پے آزار و ہرچہ خواہی کن
کہ در طریقت ماغیر ازیں گنا ہے نیست

(کسی کو تکلیف پہنچانے کے درپے نہ ہو اور جو جی میں آئے کر کیونکہ ہمارے مسلک میں اس کے سوا کوئی اور گناہ نہیں)[10]۔

حوالہ جات

1- مثنوی چراغ دیر (کلیات فارسی غالب)
2- مہر نیمروز مصنفہ مرزا اسد اللہ خان غالب، ترجمہ پروفیسر عبدالرشید فاضل
3- لال قلعہ کی ایک جھلک از سید ناصر نذیر فراق دہلوی
4- بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین لاہوری
5- لال قلعہ کی ایک جھلک از سید ناصر نذیر فراق دہلوی
6- تذکرہ غوثیہ از حضرت غوث علی قلندر قادری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
7-8- ایضاً
9-10- ایضاً

دی گریٹ گیم.....روس، ایران، افغانستان

''دہلی کے عوام خصوصاً ہندوؤں میں ایک پیشگوئی جس پر عموماً یقین کیا جاتا ہے گردش کرتی رہی ہے، وہ یہ کہ برطانوی راج ایک سو پچیس سال میں ختم ہو جائے گا۔ لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ روسی افغانوں کی پشت پر ہیں۔ برطانوی بہت عرصے سے روسی حملے کی باتیں کرتے رہے ہیں، اب ہندوستانیوں نے اس پر یقین کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے متعدد بار سنا کہ اگر روسیوں نے حملہ کیا تو غیر مطمئن ہندوستانی ان کا ساتھ دیں گے۔ اگر چہ اب برطانویوں نے اپنی اصلاح کر لی ہے اور لوگوں کو روس کے رومانس میں مبتلا دیکھ کر انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ روس بہت کمزور اور غریب ملک ہے اور خود اندرونی مسائل خصوصاً لاموجودیت Nihilism کے فتنے میں مبتلا ہے۔''(1)

یہ بیان ایک امریکی صحافی کا ہے جو ۱۸۸۰ء میں دہلی آیا تھا لیکن اس مسئلے پر غالب کوئی چالیس برس قبل اپنی رائے کا اظہار کر چکے تھے۔

نواب مصطفیٰ خان بہادر شیفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''روسیوں کی شاہِ ایران کے ساتھ آویزش ہے۔ یہ دونوں گروہ مل کر ہندوستان کی طرف رُخ کرنے والے ہیں، یہ افواہیں دیو پری کے افسانے سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ خردمندوں کے لیے زیادہ مناسب یہی ہے کہ ان باتوں پر کان نہ دھریں اور ایسی کوئی بات اپنی زبان پر نہ لائیں۔''[2]

یہ خط ۱۸۳۱ء اور ۱۸۴۳ء کے درمیان کسی وقت لکھا گیا۔

۲۳ اپریل ۱۸۶۲ء کو اودھ اخبار میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:[3]

''یارب! دنیا میں جتنے ترے بندے ہیں سب اپنا بھلا چاہتے ہیں۔ آیا یہ کج فہم واقعہ طلب لوگ کیا چاہتے ہیں؟ فتنہ و فساد سے خوش اور امن و امان کے دشمن ہیں گویا زن و فرزند و مال و جان کے دشمن ہیں۔ اگر چہ اس ہنگامے میں آپ بھی برباد ہوتے ہیں لیکن جہاں ہنگامے کی خبر سنتے ہیں شاد ہوتے ہیں۔ ابھی سرزمین ہند کو موج زن دریا میں سرگوں دیکھ چکے ہیں پر یہ عافیت دشمن عبرت نہیں پکڑتے ہیں اور جو کوئی ان کو سمجھائے تو اس سے جھگڑتے ہیں۔ کابل کے اخبار پر کس رغبت سے کان دھرتے ہیں اور پھر اس اخبار پر کیا کیا اخبار مرتب

کرتے ہیں۔ سرکار انگریزی کہ از بسکہ توجہ طرف رفاہ عام کے ہے یا قصہ جو کچھ ہے واسطے انتظام کے ہے۔ بفرضِ محال اگر اس گروہ میں سے بڑھ کر کسی نے حوصلہ کیا اور صاحبان عالیشان وجلالت نشان کا مقابلہ کیا' بات صاف صاف ہے جائے انصاف ہے۔ جن موید من اللہ حاکموں نے اپنی فوج باغی کو صرف اپنے حسن تدبیر و ضرب شمشیر سے زیر کیا ہے' اب جو یہ فوج جرار و لشکر بے شمار ساتھ ہے' مخالفت کا رفع کرنا مشکل کیا ہے؟ ہندو و مسلمان اہل ہند جو اگلے فتنہ و فساد سے بچ رہے ہیں اور بعد اس کے وبا اور قحط کے دکھ سہے ہیں' وہ اپنی عاقبت و صحت پر خدا کا شکر بجا لائیں' اپنا پاکیزہ سستا اناج فراغت سے کھائیں' اگنی بوٹ اور ریل گاڑی کی صنعت کو دیکھیں' تار بجلی میں پیام بھیجنے کی سرعت کو دیکھیں۔ مدرسوں کی رونق اور رواجِ علم کی کثرت ملاحظہ فرمائیں۔ حکام کی مہربانیاں اپنی نسبت ملاحظہ فرمائیں' ملک سراسر بے خس وخار ہو گیا ہے' قلم رو ہند نمونہ گلزار ہو گیا ہے' بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا' اب زندگی میں موجود ہے' وہ احمق ہے وہ ناقدردان ہے' جو انگریزی عملداری سے ناخوشنود ہے' حکام کو ملک کی آبادی اور رعایا کی آسودگی منظور بہر صورت ہے۔ اگر احیاناً کوئی اپنے حق کو نہ پوچھے تو اس شخص کی خوبی قسمت ہے' آدمی زحمت خاص کو نہ دیکھے رحمت عام پر نظر رکھے۔ اگر اس کا کوئی مدعا حاصل نہ ہو تو اپنے بخت و قسمت کا گلا کرے۔

امن و امان کا طالب بخت و قسمت کا شاکی ''غالب'' فقط۔

اس مضمون کے ساتھ ہی ''ہندوستانی کی سمجھ'' کے عنوان سے ادارتی نوٹ چھپا ''افغانستان کا روزنامہ مدتِ دراز سے سنا جاتا ہے' دس برس سے زیادہ ہوئے کہ مخالف اخبار میں دیکھا جاتا ہے' غرض سالہا گزر گئے سنتے سنتے کان بھر گئے' کسی امر کا ظہور نہ پایا' افسانے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ان دنوں بھی ویسی ہی باتوں نے شہرتیں پائیں' چاروں طرف لوگوں نے بے پر کی اڑائیں.....

.....اے بے فکرو! خدا سے ڈرو' ناحق عالم کو پریشان نہ کرو' معلوم نہیں یہ بے اصل باتیں کون گھڑا کرتا ہے..... آج کل دانائے روزگار سر آمد اولی الابصار' ارسطو فطرت' فلاطوں فطنت جناب والا شان عالی مناقب' مرزا اسداللہ خان غالب نے جن کے سلامت ذہن مستقیم پر قسم کھایئے استقامت رائے سلیم کے صدقے جایئے نافہموں کی فہمائش میں ایک نثر تحریر فرمائی..... ہم اس کو درجِ اخبار کرتے ہیں' اہل جہاں پر آشکار کرتے ہیں۔''

اس مضمون کی حمایت میں ایک خط جناب مردان علی خان رعنا کا شائع ہوا' جس میں تھا:

''مکرم خاکسار' صاحب اودھ اخبار سلامت! آپ کے اخبار حق نگار مطبوعہ ۲۳ اپریل سن رواں کے صفحہ ۲ میں عبارت نثر ریختہ قلم جواہر رقم حضرت اوستادی جناب والا مناقب مرزا اسداللہ خان غالب دہلوی دام افضالہم کی درباب تہدیہ و تنبیہ عوام کج فہمان ہند میری نظر سے گزری' جس سے یہ مقصود ہے کہ افواہ جنگ ایرانیان با افغانان میں خام خیال لوگ کیا کیا خیال خام کرتے ہیں.....''[4]

زار شاہی روس اور وکٹورین برطانیہ کے درمیان وسط ایشیا پر بالادستی کے لیے ہونے والا کھیل گریٹ گیم

کہلاتا ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں یہ دونوں حریف ملک ایک دوسرے سے دو ہزار میل کی دوری پر تھے جبکہ صدی کے آخر میں ان کا درمیانی فاصلہ صرف بیس میل رہ گیا۔ اس عظیم کھیل میں روس اپنی سرحدوں میں توسیع کی کوشش کر رہا تھا جبکہ برطانیہ اپنی طلائی کلید ہندوستان پر اپنے قبضہ کو مستحکم کرنے میں مصروف تھا۔ اسی کشمکش کے ایک جزو کے طور پر بلوچستان پر قبضہ ہوا۔ افغانستان پر قبضہ ہوا پھر افغانستان سے نکلنے کے بعد ایک بار پھر قبضہ کیا گیا۔

فارورڈ پالیسی تشکیل دی گئی۔ سندھ پر قبضہ ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی برطانویوں کو روس اور ایران کا ہاتھ نظر آیا۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد معزول بادشاہ بہادر شاہ ظفر پر چلائے جانے والے مقدمے میں یہ ایک اہم نکتہ تھا۔

۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو توپخانہ کے لیفٹیننٹ کرنل ڈاس کی صدارت میں ایک فوجی عدالت قائم ہوئی، جس کا اجلاس قلعہ کے دربار خاص میں ہوا۔

ریذیڈنٹ دہلی سر تھامس تھیوفیلس مٹکاف پر جرح کی ایک جھلک:[5]

سوال:- کیا ایرانیوں کی ہرات پر چڑھائی کرنے کا چرچا ہندوستان میں اکثر ہوتا تھا؟

جواب:- ہاں! اکثر ایسا ہوتا تھا مگر روسیوں کے ہندوستان پر حملہ کرنے کا ذکر بیشتر ہوتا تھا۔ اس وقت ہر ہندوستانی اخبار نے اپنا اپنا کارسپانڈنٹ کابل میں مقرر کیا تھا جس کے ذریعے برابر وہاں کی خبر لگا کرتی تھی۔

حکیم احسن اللہ خان پر ہونے والی جرح میں[6]

سوال:- کیا بادشاہ نے مرزا نجف کو شاہ ایران سے مدد لینے کے لیے بھیجا تھا؟

جواب:- مرزا نجف کے ایران جانے کی خبر اڑی' مرزا نجف مرزا حیدر کے بھائی اور بادشاہ کے بھتیجے تھے۔ یہ خبر مولوی باقر کے اخبار میں چھپی تھی۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ شاہ ایران نے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔ میں نے مرزا نجف کے بڑے دوست مرزا علی بخت سے دریافت کیا تھا کہ وہ بادشاہ کی طرف سے کوئی خط شاہ ایران کے نام لے گئے ہیں؟ انہوں نے خط کا اقرار کیا اور کہا اس میں بادشاہ نے لکھوایا کہ میں شیعہ ہو گیا ہوں۔ میری مدد کرو میری حالت اس وقت بہت زبوں ہے مگر اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔

سوال:- کیا قلعہ میں انگریزوں اور ایرانیوں کی لڑائی کے تذکرے اکثر ہوتے تھے اور بادشاہ اس گفتگو میں دلچسپی ظاہر کیا کرتے تھے؟

جواب:- اس مضمون پر دلچسپی اور گفتگو خاص کر نہ ہوتی تھی۔ ہندوستانی اخبار جو قلعہ میں آتا تھا اس سے لڑائی کی ترقی کا حال معلوم ہوتا تھا اور بادشاہ بھی کسی طرح ان میں قابل لحاظ دلچسپی ظاہر نہیں کرتے تھے۔

سوال:- کیا تمہیں معلوم ہے اس شخص حسن عسکری کی معرفت شاہ ایران سے قیدی (شاہ ظفر) کی خط و کتابت ہوئی تھی؟

جواب:- ہاں مجھے معلوم ہے خط جایا کرتے تھے!!

سوال:- کیا تم نے کسی خواب کا حال سنا جس کی تعبیر حسن عسکری نے بادشاہ کو دی ہو؟

جواب:- ہاں! جس وقت ایرانی فوجیں ہرات میں آ گئیں' اس وقت ایک خواب کا حال سنا تھا۔ اس وقت حسن عسکری نے اپنا خواب بادشاہ کے سامنے بیان کر کے اس کی تعبیر یہ دی کہ شاہ ایران ایشیا میں انگریزی فوجوں کو برباد کر کے بادشاہ کو اس کے تخت پر بٹھائے گا اور اس کی سلطنت پھر اس کے قبضے میں آ جائے گی اور کافر یعنی انگریز قتل ہو جائیں گے۔

مخبر چنی لال پر ہونے والی جرح سے اقتباس[7]

سوال:- کیا بادشاہ کا کوئی ایلچی اس وقت شاہ فارس کے پاس ہے یا پیشتر گیا تھا؟

جواب:- نہیں! موجودہ زمانے کی بابت تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا' کوئی دو یا تین سال گزرے ہوں گے' مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے محمد باقر والے اخبار میں پڑھا تھا کہ مرزا نجف قیدی کا بھتیجا ایرانی دربار میں گیا تھا اور شاہ فارس بڑی تواضع سے پیش آئے تھے۔

سوال:- کیا کوئی شہزادہ ایرانیوں کے متعلق مضامین دلچسپی سے پڑھتا تھا یا ان مضامین کو ضروری سمجھتا تھا اور ایرانیوں کے انگریزوں کو پسپا کرنے کی بابت رائے زنی کرتا تھا؟

جواب:- میں نے خود تو وہ اخبار نہیں پڑھا' مگر سنتا ہوں کہ اس میں ایرانیوں کے انگریزوں کو مغلوب کرنے کے مضامین اکثر ہوا کرتے تھے اور شہزادے ان خبروں کو ضروری سمجھ کر وقعت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔

گواہ کشن سنگھ چپراسی مدیر اخبار دہلی پر ہونے والی جرح کا ایک حصہ:[8]

سوال:- جس زمانے میں ایرانیوں کے آنے کی افواہ تھی' کیا روسیوں کی بابت بھی تذکرہ ہوتا تھا؟

جواب:- ہاں! دونوں کا تذکرہ ہوتا تھا' مگر بیشتر ذکر ایرانیوں کا ہوتا تھا۔

سوال:- تم نے بیان کیا ہے کہ صادق الاخبار کی تحریر انگریزی گورنمنٹ کے خلاف ہوتی تھی' تمہیں کوئی ایسا مضمون یاد ہے' جس سے اس بات کا یقین ہو؟

جواب:- مجھے کوئی خاص مضمون یاد نہیں' جس میں مقابلہ دیگر مضامین کے زیادہ مخالفت ہو' مگر جو مضامین ایرانیوں اور روسیوں کے متعلق شائع ہوئے' ان کی تحریر ہمیشہ مخالفانہ رہی ہے۔

حوالہ جات

1- Historic Delhi (By H. K. Kaul.)

2- پنج آہنگ غالب' ترجمہ تنویر احمد علوی

3-4- خیابانِ غالب از نادم سیتاپوری

5 تا 8- چراغ دہلی از مرزا حیرت دہلوی۔ کرزن پریس دہلی

غالب اور غدر...۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۹ء کی دہلی

بسکہ فعال مایرید ہے آج ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کیا کیے باہم ماجرہ دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

(مکتوب بنام علاؤالدین احمد خان علائی ۱۸۵۸ء)

۱۸۵۷ء کی شورش نے' اسے غدر کہیے یا جنگ آزادی' برصغیر پر گہرے اثرات چھوڑے۔ اس کشمکش کے تمام فریقوں انگریز' ہندو' مسلمان سب نے اپنی اپنی حکمت عملی تبدیل کی' سب نے اپنی بقاء کے لیے نئے نئے راستے ڈھونڈے اور اختیار کیے' کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوا' عسکری جدوجہد کی جگہ سیاسی تحریک نے لی۔ غالب اس قضیئے کو ''رستخیز بے جا'' کہتے ہیں۔

ان ایام کا ایک روزنامچہ انہوں نے لکھا اور نومبر ۱۸۵۸ء میں اسے ''دستنبو'' کے نام سے شائع کرایا۔ یہ کتاب خالص فارسی میں ہے۔ عربی سے مبرہ اور تاریخ سے زیادہ انشا پردازی کا نمونہ..... اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ غالب کوئی بہت اچھے روزنامچہ نگار نہ تھے' لیکن ''دستنبو'' کے حوالے سے غالب کے خطوط پڑھیں تو واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب انہوں نے روزنامچہ یا تاریخ کے طور پر نہیں اپنی جان بچانے کے لیے لکھی تھی۔ وہ استادِ شاہ تھے' شاعر دربار تھے' شاہی تاریخ نویس تھے۔ ایک سرکاری مخبر جیون لال کے روزنامچے کے مطابق

جب باغیوں نے بہادر شاہ ظفر کو تخت پر بٹھایا اور ان کے مطلق العنان شہنشاہ ہند ہونے کا اعلان کیا تو اس موقع پر مرزا غالب نے ایک قصیدہ سر دربار پیش کیا۔ چنانچہ غالب نے ان الزامات سے بری الذمہ ہونے کی ایک کوشش کے طور پر دستنبو تحریر کی۔ یہ ان کی بقا اور روزی روٹی کا مسئلہ تھا۔ بادشاہت کے خاتمے کے بعد ان کا انحصار محض انگریزوں کی پنشن پر رہ گیا تھا۔

اپنی اس کاوش میں قابل فہم طور پر انہوں نے انگریزوں کے علم و دانش اور عدل و انصاف کی تعریف میں جا و بے جا جملے شامل کر دیئے ہیں۔ تاہم انہوں نے تاریخ کو مسخ نہیں کیا۔ گوروں کی طرف سے معذرت خواہی کرتے ہوئے ہی سہی ان کے تمام مظالم بے کم و کاست بیان کر دیئے گئے بلکہ کالوں سے زیادہ گوروں کے مظالم بیان کیے۔ اہل شہر کے زیادہ تر جو مصائب انہوں نے بیان کیے وہ انگریزوں کی فتح دہلی کے بعد کے ہیں۔ نامور محقق جناب رشید حسن خان نے دستنبو کا اردو ترجمہ کیا' اس میں سے اقتباسات یہاں پیش کیے جا رہے ہیں:

---

۱۶ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ کو پیر کے دن دوپہر کے وقت مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرز اٹھیں' میں زلزلے کی بات نہیں کر رہا ہوں' اس منحوس دن کو میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر میں آئے' نہایت ظالم و مفسد اور نمک حرامی کے سبب انگریزوں کے خون کے پیاسے۔ شہر کے مختلف دروازوں کے محافظ جوان فسادیوں کے ہم پیشہ اور بھائی بند تھے بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ پہلے ہی سے ان محافظوں اور فسادیوں میں سازش ہو گئی ہو۔ شہر کی حفاظت اور ذمہ داری اور حق نمک ہر چیز کو بھول گئے۔ ان بن بلائے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ ان مدہوش سواروں اور اکھڑ پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور محافظ مہمان نواز ہیں' دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر دوڑ پڑے' جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابل احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے' جب تک ان افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا' اُدھر سے رُخ نہیں پھیرا۔

میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ شور و غوغا سنا۔ چاہتا تھا کہ کچھ معلوم کروں کہ اتنے میں شور مچ گیا کہ اندرون قلعہ صاحب اجنٹ بہادر اور قلعہ دار قتل کر دیئے گئے ہیں' ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں' زمین ہر طرف گل اندا موں کے خون سے رنگین ہو گئی۔ افسوس وہ پیکر علم و حکمت' انصاف سکھانے والے' خوش اخلاق اور نیک حاکم۔ صد افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن خواتین' جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور بدن کچی چاندی کی طرح دمکتے تھے۔ حیف وہ بچے' جنہوں نے ابھی دنیا کو (اچھی طرح) دیکھا بھی نہیں تھا' جن کے ہنس مکھ چہرے گلاب و لالہ کے پھولوں کو شرماتے تھے اور جن کی خوش

رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بدنما معلوم ہوتی تھی، یہ سب ایک دم قتل و خون کے بھنور میں پھنس گئے، کر بحرِ فنا میں ڈوب گئے۔

خدا خدا کر کے وہ منحوس دن ختم ہوا، ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا، ان سیاہ باطنوں اور بے رحم قاتلوں نے شہر میں جابجا پڑاؤ ڈالا۔ اندرونِ قلعہ شاہی باغ کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور نشیمن سلطانی کو خواب گاہ۔ رفتہ رفتہ دُور کے شہروں سے خبریں آئیں کہ مختلف فوجوں کے باغیوں نے ہر چھاؤنی میں افسروں کو قتل کر دیا ہے اور نمک حراموں نے کھلم کھلا بغاوت کا شور مچا رکھا ہے۔ گروہ کے گروہ خواہ سپاہی ہوں یا زمیندار، سب یکدل ہو گئے ہیں اور کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر دُور نزدیک ہر جگہ ایک ہی کام کے لیے کمربستہ ہو گئے اور پھر کیسی مضبوطی سے کمریں کسی تھیں کہ صرف اس دریائے خوں کی موجیں ہی انہیں کھول سکتی تھیں..... بہت سے لشکر سرداروں کے بغیر تیار ہو گئے، بہت سی فوجیں افسروں کے بغیر لڑائی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں، توپیں، گولہ بارود، چھرے غرض سارا سامان انگریزوں سے حاصل کیا گیا، لڑائی کے سارے طریقے انگریزوں سے سیکھے اور انہی سکھانے والوں اور مالکوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔

لٹیرے ہر قسم کی پابندیوں سے اور سوداگر محصول ادا کرنے کی ذمہ داریوں سے آزاد، گھر ویرانے معلوم ہوتے ہیں اور مکانات (لوٹ مار کرنے والوں کے لیے) خوانِ مفت کا حکم رکھتے ہیں۔ جو لوگ گمنامی کے گوشوں میں چھپے ہوئے تھے، وہ گروہ در گروہ اور خنجر بکف اپنی آرائش اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں۔ امن پسند اور نیک نہاد لوگ گھر سے بازار تک آتے ہوئے راستے میں بیسیوں جگہ عاجزی اور مظلومیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ لٹیرے دن میں دلیری کے ساتھ لوٹ مار میں مصروف ہیں اور رات میں ریشمی بستروں پر محوِ خواب۔ بڑے بڑے عالی خاندان لوگوں کے گھروں میں چراغ جلانے کے لیے تیل نہیں..... وہ کم رُتبہ لوگ جو سارا دن مٹی بیچنے کے لیے زمین کھودتے تھے، ان کو مٹی میں سونے کے ٹکڑے مل گئے اور جن لوگوں کی محفل میں دن رات آرائش گل سے چراغ روشن رہتے تھے، اندھیرے گھروں میں ناکامی و نامرادی کے غم میں مبتلا ہیں.... کوتوال شہر کی زن و دختر کے علاوہ ساری نازنینانِ شہر کا زیور بزدل اور سیاہ کار رہزنوں کے قبضے میں ہے.... بڑے بڑے عالموں اور ناموروں کی آبرو مٹی میں ملا دی گئی اور جن لوگوں کے پاس نہ دولت تھی نہ عزت وہ بے اندازہ زر و جواہر اور عزت و آبرو کے مالک ہیں۔

ڈاک کا نظام درہم برہم ہو گیا، جس کے سبب سے بہت سے کام رُک گئے، ہرکاروں نے آنا جانا اور ڈاک لے جانا بند کر دیا۔ ڈاک میں پیام بجنسہٖ پہنچانے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ہاں خطوط کی آمد و رفت کا قاعدہ

ہے مگر اس محکمے کی ایک شاخ ہے (ٹیلیگراف) کہ نہ مضراب کی جنبش بلکہ جنبش کی مضراب سے جو اس سے پیدا ہوتی ہے ہزاروں پیام (خبریں) اندر سے باہر نکلتے (پہنچتے) ہیں (جو لوگ) مذہب اور قانون کے بے حد پابند ہیں انصاف کو نظر انداز نہ کریں اور بتائیں کہ اس سارے نظام کا درہم برہم ہو جانا خدا کی بخشی ہوئی دولت کا لٹ جانا ڈاک کا نظام درہم برہم ہو جانا اور دوستوں کے حالات معلوم نہ ہونا کیا یہ ساری باتیں اس لائق نہیں کہ ان کا ماتم کیا جائے اور آنسو بہائے جائیں۔

جب پہلی بار وہ گمراہ جنگجو آئے تو جو خزانہ وہ اپنے ساتھ لائے تھے خزانے میں جمع کر دیا اور اپنے سر شاہی آستانے پر جھکا دیے۔ جلد ہی زمانے میں کچھ ایسا انتظام کیا کہ ہر طرف سے فوجیں جمع ہونا شروع ہو گئیں اور اس سرزمین (دہلی) کی طرف روانہ ہو گئیں۔ بادشاہ جب فوج کا انتظام نہ کر سکے فوج نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بادشاہ مجبور ہو کر رہ گئے.... یہ شہرت طلب جنگجو جس مقام سے چلے وہاں کے قید خانے کا دروازہ کھول دیا اور قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ وہ پرانے پرانے قیدی جنھوں نے نئی نئی آزادی پائی تھی شاہی دربار میں آئے سجدہ کیا اور کسی علاقے کی صوبیداری چاہی۔

اب دہلی کے اندر اور باہر تقریباً پچاس ہزار سواروں اور پیادوں کی فوج پڑی ہوئی ہے۔ صاحبانِ علم و دانش انگریزی حکام کے قبضے میں اس وسیع شہر کا کوئی علاقہ نہیں صرف شہر کے جانب مغرب ایک پہاڑی پر ان کا قبضہ ہے۔ یہ پہاڑی شہر سے کچھ زیادہ دُور نہیں۔ (انگریزوں نے) نہایت ہنر مندی سے اس جگہ پر مورچہ قائم کر کے ایک مضبوط قلعہ سا بنا لیا ہے اور اس کے چاروں طرف کئی اژدھا صفت اور رعد خراش توپیں لگا دی ہیں.... شہر کی فوج نے جو میگزین اسی شہر سے حاصل کیا تھا اس میں سے چند توپیں شہر کی فصیل پر جما دی ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو جنگجو سرداروں کا حریف فرض کر لیا ہے۔ توپوں اور بندوقوں کے دھوئیں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے اور اس سے اولے برس رہے ہیں۔ رات دن دونوں طرف سے گولہ باری ہوتی ہے جیسے اوپر (آسمان) سے پتھر برس رہے ہیں۔ مئی جون کی گرمیاں ہیں۔ دھوپ کی تیزی روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ مختلف مقامات سے آئے ہوئے سپاہی دن چڑھے شیر دل انگریزوں سے لڑنے کے لیے جاتے ہیں اور سورج ڈوبنے سے پہلے ہی واپس آ جاتے ہیں۔

ایک دن کچھ لوگ حکیم صاحب (احسن اللہ خان) کو قتل کرنے کے لیے ان کے محل پر چڑھ دوڑے۔ حکیم صاحب اس وقت قلعے میں بادشاہ کے پاس تھے۔ چند آشفتہ سر قلعے میں گئے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ بادشاہ نے انتہائی محبت و بندہ پروری سے اپنے آپ کو ان کے (حکیم صاحب) اوپر گرا دیا۔ اس طرح

حکیم صاحب بچے۔ جان تو بچ گئی لیکن یہ فتنہ اس وقت تک ختم نہیں ہوا جب تک ان کا سارا گھر تباہ نہیں ہو گیا۔ یہ گھر جو نگار خانۂ چین کی طرح تھا لوٹ لیا گیا۔ ایوان کی چھت کو آگ لگا دی گئی۔

فوجیں ہر طرف سے آ آ کر جمع ہو رہی تھیں' بادشاہ کا نام لگا ہوا تھا' اس وجہ سے دُور دُور کے سرداران فوج اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فرخ آباد کے نام ور تفضل حسین خان نے جن کو بادشاہ سے کبھی علاقہ نیاز مندی نہیں تھا' دُور ہی سے آستانِ شاہی کو سجدہ کیا اور خط میں اپنے آپ کو نیاز مند قدیم کہا۔ خان بہادر خان نے جو گمراہ شہرت طلب تھا اور جو بریلی میں کچھ لشکر جمع کر کے سردار بن بیٹھا تھا' ایک سو ایک اشرفیاں' نقرئی سامان سے آراستہ ہاتھی اور گھوڑا بارگاہِ شاہی میں بھیجا۔ چشم بد دُور خورشید نشان نواب یوسف علی خان بہادر فرماں روائے رام پور نے' جو اس علاقے میں باپ دادا کی جانشینی کا حق ادا کر رہے ہیں اور انگریزی حکومت کے ساتھ ان کا رشتہ دوستی اتنا مضبوط ہے کہ زمانہ ہزار برس میں کسی طریقے سے اسے نہیں توڑ سکتا' مجبوراً صرف زبانی پیام بھیج کر لوگوں کی زبان کو بند کیا۔

لکھنؤ میں جب فوج نے انگریزوں سے رشتۂ تعلق توڑ لیا' بیشتر انگریز دشمنی کی اس آگ سے بچ کر دوسرے مقامات پر اپنے متعلقین کے پاس چلے گئے' لیکن (افواج کے) چند سرداران نے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر بیلی گارد میں قیام کیا' جو لکھنؤ کا ایک مشہور مقام ہے اور بہادری کے ساتھ دروازے بند کر لیے۔ شرف الدولہ نے جو بڑے واقف کار اور معاملات کو سمجھنے والے اور جو نوابانِ اودھ کے زمانے میں وزارت پر سرفراز تھے واجد علی شاہ کے دس سالہ لڑکے کو تختِ حکومت پر بٹھا دیا اور اس کو شہنشاہ ہندوستان کا وزیر اور اپنے آپ کو پیشکار اور نائب وزیر فرض کر لیا۔ اور ایک منتخب شخص کو مناسب پیشکش کے ساتھ (دہلی) روانہ کر دیا۔ قاصد آیا' دو روز آرام کیا' پھر بارگاہِ شاہی میں حاضر ہوا' دو صبا رفتار گھوڑے' دو کوہ صفت ہاتھی' ایک سو ایک اشرفیاں اور ایک سنہری کلاہ جو رنگ برنگ کے نایاب موتیوں سے مزین تھی' پیش کی اور ایک جوڑا بازو بند جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے ملکہ کی خدمت میں محل میں بھیجا۔ جس دن وہ سبز قدم قاصد آیا اور بادشاہ نے بندہ پروری فرمائی اس کے کل کو پیر کے دن قمری مہینے کی چوبیس اور ستمبر کی چودہ تاریخ کو پہاڑی کے دامن میں بیٹھے ہوئے (انگریزوں نے) شان و شکوہ کے ساتھ کشمیری دروازے پر ایسا حملہ کیا کہ کالوں کی فوج کو بھاگتے ہی بنی...

مختصر یہ کہ فاتحین نے راستے میں جس شخص کو پایا قتل کر دیا۔ شہر کے عالی خاندان اور صاحب عزت افراد عزت اور آبرو کو بچانے کے لیے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے... دو تین دن تک کشمیری دروازے سے لے کر چوک تک تمام راستے میدانِ جنگ بنے رہے۔ دہلی دروازہ' ترکمان دروازہ' اجمیری دروازہ یہ تینوں دروازے اس فوج کے قبضے میں رہ گئے۔ مجھ مردہ دل کا غم کدہ (مکان) وسط شہر میں کشمیری دروازے اور دہلی

دروازے کے درمیان ہے اور میرے مکان سے ان دونوں کا فاصلہ برابر ہے۔ اگرچہ گلی کا دروازہ بند کرلیا گیا تھا' لیکن ابھی اتنا حوصلہ تھا کہ دروازہ کھول کر باہر چلے جاتے تھے اور کھانے پینے کا سامان لے آتے تھے۔

میں نے ابھی کہا کہ غضب ناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی کچھ بے سروسامان لوگوں کو قتل کرنا اور چند مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔ ہاں' جس مقام کو لڑ کر فتح کرتے ہیں' لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کرتے ہیں۔ اس غصے اور دشمنی کو دیکھ کر لوگوں کے منہ فق ہو گئے۔ بیشمار مردوں اور عورتوں کے گروہ' جن میں معمولی لوگ بھی تھے اور صاحب حیثیت بھی' ان تینوں دروازوں سے باہر نکل گئے' شہر کے باہر جو چھوٹی چھوٹی بستیاں اور مقبرے تھے' ان میں پناہ گزین ہو گئے۔ اس خیال سے کہ کسی مناسب وقت پر شہر میں آجائیں گے' یا کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے۔ میرے دل پر نہ خوف و دہشت کا اثر ہوا اور نہ پائے استقلال کو جنبش ہوئی۔

جمعہ کے دن محرم کی چھبیس تاریخ تھی اور ستمبر کی اٹھائیس' دن چڑھے دنیا کو خوشی بخشنے والا آفتاب عالم تاب برج سنبلہ کے ایک درجے میں پہنچ کر کسوف میں آگیا اور اہل عالم کی چشم جہاں میں پھر تاریکی نے ظلم ڈھایا۔ گمراہ باغی اندرون اور بیرون شہر سے خنزیروں کی طرح بھاگنے لگے اور فاتحین نے شہر اور قلعے پر قبضہ کرلیا' کشت و خون اور پکڑ دھکڑ (کی آفت) اس گلی تک آگئی' خوف سے لوگوں کے دل دہل گئے۔ اس گلی میں صرف دس بارہ گھر ہیں اور راستہ ایک ہی طرف سے ہے۔ گلی میں کوئی کنواں نہیں ہے۔ زیادہ تر رہنے والے چلے گئے ہیں (اسی طرح کہ) عورتیں بچوں کو چھاتی سے لگائے ہوئے تھیں اور مردوں کے کاندھوں پر سامان کی گٹھڑیاں تھیں' کچھ ہی لوگ باقی رہ گئے تھے۔ ہم سب نے مل کر گلی کا دروازہ اندر سے بند کرلیا اور پتھر چن دیئے' گلی سربستہ تو تھی ہی دربستہ بھی ہو گئی۔... (اتفاقاً) اس مصیبت میں کام بننے کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔

فلک مرتبہ مریخ حشم مہاراجہ نرندر سنگھ بہادر فرماں روائے پٹیالہ اس جنگ میں فاتحین کے ساتھ ہیں اور ان کی فوج شروع سے انگریزی لشکر کی مددگار ہے۔ راجہ کے چند ملازمین خاص جو ان کی سرکار میں اونچے عہدوں پر ہیں اور شہر کے نامور لوگوں میں سے ہیں (میری مراد ہے) حکیم محمود خان' حکیم مرتضٰی خان' حکیم غلام اللہ خان نے جو حکیم شریف خان جنت مکانی کی اولاد میں سے ہیں' اس کوچے میں رہتے ہیں اور دُور تک ان کی دورویہ عمارتیں چلی گئی ہیں۔ میں دس سال سے ان میں سے ایک صاحب جاہ و ثروت کا پڑوسی ہوں.... چونکہ دہلی کی فتح متوقع تھی' راجہ نے ازراہ بندہ پروری طاقتور اور جنگجو (انگریزوں) سے طے کرلیا تھا کہ جب شہر فتح ہوگا' اس گلی کے دروازے پر محافظ مقرر کر دیئے جائیں گے' تاکہ انگریز فوجی جن کو گورا کہتے ہیں' گھروں کو نقصان نہ پہنچائیں۔

سارے شہر میں پندرہ ستمبر سے ہر گھر کا دروازہ بند ہے۔ دکاندار اور خریدار دونوں غائب ہیں' نہ گندم فروش کہ گیہوں خریدیں' نہ دھوبی ہے کہ کپڑے دُھلنے کو دیں' حجام کو کہاں ڈھونڈیں کہ سر کے بال تراشے اور مہتر

کو کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں کہ صفائی کرے۔ بہرحال جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے ان پانچ مہینوں میں (گلی کے لوگ) باہر نکل کر پانی تو برابر لے آتے تھے ..کبھی کبھی آٹا دغیرہ بھی مل جاتا تھا' لیکن اس کے بعد یہ صورتحال ختم ہوگئی....گھروں میں کھانے کا جس قدر سامان تھا رفتہ رفتہ ختم ہوگیا۔ پانی اگرچہ بے حد احتیاط سے پیا گیا' لیکن آخرکار کوزے یا گھڑے میں ایک قطرہ نہیں رہا.... ہرچہ بادا باد کہتے ہوئے پہرے داروں سے باہر جانے کی اجازت چاہی' یہ پہرہ ازراہِ دوستی تھا نا کہ ازراہِ دشمنی' اس لیے یہ کہا گیا کہ چوک کے بازار تک جاسکتے ہیں' چوک سے آگے قتل دخون کا بازار گرم ہے اور رستہ پُرخطر ہے۔ مجبور و پریشان لوگوں نے دروازہ کھول دیا۔ بہشتی اور مشک کا ملنا ناممکن تھا' اس لیے ہر گھر سے ایک مرد اور میرے ملازمین میں سے دو شخص گئے۔ میٹھا پانی دُور تھا اور اتنی دُور جا نہیں سکتے تھے' مجبوراً نیم شور پانی مٹکوں اور گھڑوں میں بھر لائے' اس طرح نمکین پانی سے وہ آگ بجھی' جس کا دوسرا نام پیاس ہے۔ آج کل ہم لوگ اپنے آپ کو قیدی سمجھ رہے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ بالکل قیدیوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک دن اچانک بادل آیا' پانی برسا۔ ہم نے چادر باندھ لی اور ایک مٹکا اس کے نیچے رکھ دیا اور پانی حاصل کیا۔

ستمبر کی تیسویں تاریخ کو بدھ کے روز شہر کی فتح اور گلی کا دروازہ بند کرنے کے تیرہویں دن لوگ خبر لائے کہ لوٹ مار کرنے والے بھائی (مرزا یوسف) کے گھر پر چڑھ دوڑے' گلی اور گھر میں لوٹ مار کی۔ دیوانے مرزا یوسف اور دونوں بڈھا بڈھی (ملازمین) کو زندہ چھوڑ دیا۔ اس بھاگڑ میں دو ہندو کہیں سے آ کر گھر میں پناہ گزین ہوگئے تھے' بوڑھے دربان اور بڑھیا ماما نے ان ہندوؤں کی مدد سے کھانے پینے کا انتظام کرنے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ واضح ہو کہ اس پکڑ دھکڑ اور قیامت کے عالم میں جس طرح ہر کوچے اور بازار میں اس مصیبت کی صورت یکساں نہیں ہے' اسی طرح قتل کرنے اور لوٹ مار میں بھی سبھی سپاہیوں کا انداز ایک نہیں' اگر کوئی رحم کرتا ہے یا دوسرا سختی کرتا ہے' تو یہ ذاتی رحمدلی اور سنگدلی کا نتیجہ ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو شخص اظہار اطاعت کرے' اسے قتل نہ کیا جائے' مال چھین لیا جائے اور جو شخص مقابلہ کرے مال کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی بھی چھین لی جائے۔ مقتولین کے متعلق یہ خیال ہے کہ انہوں نے یقیناً اطاعت نہیں کی' اس وجہ سے ان کو قتل کر دیا گیا۔ مشہور بھی یہی ہے کہ عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں' قتل نہیں کرتے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے اور وہ بھی صرف دو تین کوچوں میں کہ پہلے قتل کر دیا' پھر سامان لوٹ لیا' البتہ بوڑھوں' عورتوں اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔

شہر کے بیشتر لوگوں کو باہر نکال دیا ہے۔ کچھ لوگ بدستور امید وبیم میں گرفتار (شہر کے اندر) موجود ہیں' ان کے بارے میں ابھی کوئی حکم صادر نہیں ہوا۔ جو لوگ باہر نکل گئے ہیں' یا جو لوگ شہر کے اندر مبتلائے

پریشانی ہیں' ان کے درد کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ کاش اندر رہ جانے والے اور باہر جا بسنے والے ایک دوسرے کی زندگی و موت سے واقف ہوتے کہ بے تابی و پریشانی نہ ہوتی۔ بس یہ جاننا کافی ہے کہ جو جس جگہ ہے' پریشان ہے۔ شہر کے اندر رہنے والے مجبور لوگ ہوں یا باہر کے پریشان حال' سب کے دل درد سے بھرے ہوئے ہیں اور سب قتل عام کے خوف سے ہراساں ہیں۔

---

۱۵ اکتوبر کو پیر کا مصیبت آفرین دن تھا' دوپہر کے وقت اچانک چند گورے اس دیوار پر چڑھ گئے' جو بند کردہ دروازے سے ملی ہوئی ہے اور وہاں سے ایک چھت پر اور (چھت سے) کود کر گلی میں آ گئے۔ راجہ نریندر سنگھ کے سپاہیوں کا روکنا کچھ کارگر نہ ہوا۔ دوسرے چھوٹے چھوٹے مکانات کو نظر انداز کر کے راقم الحروف کے گھر میں گھس آئے۔ بھلی مانسی سے سامان کو ہاتھ نہیں لگایا' مجھ کو ان دونوں بچوں' دو تین ملازمین اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ گلی سے دو فرلانگ سے کچھ زیادہ فاصلے پر حقیقت پسند دانشور کرنل برون کے پاس لے گئے' جو چوک سے اس طرف قطب الدین سوداگر کی حویلی میں مقیم ہے۔ (کرنل) نے مجھ سے بہت نرمی و انسانیت سے بات چیت کی۔ مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا' خوش اسلوبی کے ساتھ اسی وقت رخصت کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس خوش اخلاق (کرنل) کی تعریف کی اور گھر چلا آیا۔

واضح رہے کہ ابھی باغیوں کے بہت سے گروہ بریلی' فرخ آباد اور لکھنؤ میں جگہ جگہ شورش پھیلانے اور بے فائدہ مقابلہ کرنے میں مصروف ہیں.... ادھر سونہ اور نواح کے علاقے میں میواتیوں نے بے طرح شورش پھیلا رکھی ہے' جیسے دیوانے زنجیروں سے آزاد ہو گئے ہوں۔ تلارام نامی شورش پسند کچھ دن تک ریواڑی میں ہنگامہ آرا رہا' پھر شیطان کی رہنمائی سے میواتیوں کے ساتھ مل گیا۔ یہ گروہ میدانوں اور پہاڑوں میں حاکموں کے ساتھ برسر جنگ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر ہر طرف تیز آندھیوں اور بھڑکتی ہوئی آگ کے ہنگامے برپا ہیں۔

ان غم انگیز حالات میں جن کا آغاز یاد نہیں ہے اور انجام معلوم نہیں' رونے کے علاوہ کچھ دیکھا ہو تو آنکھوں کے روزن خاک سے بھر جائیں۔ روز سیاہ کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں' جس کے متعلق کہوں کہ آنکھوں نے اسے دیکھا۔ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ روز سیاہ تو وہ چیز ہے' جس کی تاریکی میں کچھ دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ جس دن گورے مجھ کو پکڑ کر لے گئے تھے' اس دن کے علاوہ چوکھٹ پر قدم رکھنا' گھر سے باہر نکلنا' گلی یا بازار میں چلنا یا دُور سے چوک کو دیکھ لینا نصیب نہیں ہوا ہے۔

اور یہ جو بادشاہ اور بادشاہ زادوں کے انجام کے متعلق میں نے کچھ نہیں لکھا (حالانکہ) فتح

شہر کی داستان کے دیباچے کے طور پر لکھنا چاہیے تھا' اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس تحریر کے سلسلے میں میرا سارا سرمایہ سخن ہائے شنیدہ ہیں اور ابھی بغیر سنی ہوئی باتیں بہت ہیں' یقیناً جب اس جائے تنگ سے باہر نکلوں گا جو باتیں اب تک نہیں سنی ہیں' ادھر ادھر سے جمع کروں گا اور تب واقف کاروں کی طرح یہ راز کی باتیں لکھوں گا۔

انیس اکتوبر کو پیر کے دن نے' جس کا نام ہفتے کے رجسٹر سے کاٹ دینا چاہیے' آتش فشاں اژدھے کی طرح دنیا کو نگل لیا۔ اس کے دن صبح کے وقت وہ کمبخت دربان بھائی کے مرنے کی خبر لایا' کہتا تھا گرفتارِ راہِ فنا پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ پانی' رومال' غسال' گورکن' اینٹ' چونے اور گارے وغیرہ کا ذکر چھوڑو' یہ بتاؤ کہ میں کیسے جاؤں اور میت کہاں لے جاؤں۔ کس قبرستان میں سپردِ خاک کروں' بازار میں اچھا برا کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا ہے۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کے کنارے لے جا کر جلا سکتے ہیں' مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ دو تین اشخاص ساتھ ساتھ راستے سے گزریں' چہ جائیکہ میت کو شہر سے باہر کہیں لے جائیں۔ پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور اس کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہوئے۔ پٹیالے کے ایک سپاہی کو آگے کیا' میرے دو نوکروں کو ساتھ لیا اور چل دیے۔ میت کو غسل دیا' دو تین سفید چادریں یہاں سے لے گئے تھے' ان میں لپیٹا اور مسجد میں' جو مکان کے برابر تھی' زمین کھودی' میت کو اس میں رکھ دیا اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے.... یہ نیک سرشت لیکن بدقسمت شخص' جس نے زندگی کے ساٹھ سال خوش و ناخوش گزارے' تیس سال ہوش مندی کے ساتھ اور تیس سال بے ہوشی کے عالم میں' زمانہ ہوش مندی میں غصہ ضبط کرنا اور عالم دیوانگی میں کسی کو تکلیف نہ پہنچانا جس کا شعار تھا تو صفر ۱۲۷۴ھ کی شب مر گیا ہے۔

(مرزا یوسف کی بیماری سے وفات کا ذکر' غالب کی مصلحت پسندی کا ایک نمونہ ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ مخبر معین الدین حسن خان کے روزنامچے میں ہے "مرزا اسد اللہ خان کے بھائی مرزا یوسف خان' جو مدت دراز سے حالت جنون میں تھے' گولیوں کا شور سن کر یکا یک باہر نکلے اور مارے گئے)

جس ہفتے انگریزی فوج نے شہر کو فتح کیا' اسی ہفتے نامورانِ دانشمند امین الدین احمد خان بہادر اور ضیاء الدین احمد خان بہادر نے حفظ وضع کی خاطر اور امیدِ بہتری پر شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ بیوی' بچوں کے علاوہ تین ہاتھی اور چالیس گھوڑے ساتھ تھے۔ پرگنہ لوہارو کا رُخ کیا' جو ان کی آبائی جاگیر ہے' پہلے مہرولی گئے اور اس گورستانِ پُر انوار میں قیام کیا۔ دو تین روز قیام کیا' اسی دوران میں لٹیرے سپاہیوں نے قیام گاہ کو گھیر لیا' جو کپڑے پہنے ہوئے تھے' ان کے علاوہ سارا سامان چھین لیا اور چلے گئے.... لوٹ مار کی مصیبت اٹھا کر بے سروسامانی کے ساتھ دوجانہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

نیک کردار حسن علی خان بہادر نے ازراہِ انسانیت وفیاضی ان کا استقبال کیا۔...صاحب کمشنر بہادر نے (حالات سے) واقف ہوکر اپنے پاس بلالیا۔ (یہ لوگ) شہر میں آئے اور حاکم سے ملاقات کی تو اس نے کچھ دیر طعن وتشنیع کی، جب نرم جواب سنا تو پھر کچھ نہیں کہا۔ قلعہ کے اندر ایوانِ خان سامانی کے پہلو میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ تسلسل کلام کی رعایت کی وجہ سے اس خاندان کی تباہی کی داستان نہیں لکھ سکا، یوں سمجھو کہ مہرولی میں ان لوگوں کو لوٹا گیا اور دہلی میں ان کے مکانات جو مالکوں سے خالی تھے، نذرِ غارتگری ہوئے، جو سامان یہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے، لوٹ مار کرنے والوں کے حصے میں آیا اور جو سامان یہاں محلات میں تھا، سب لٹ گیا، بس اینٹیں پتھر باقی رہ گئے۔

یقیناً اکتوبر کی ۱۶ تاریخ تھی اور سنیچر کا دن کہ یہ دونوں دانشمندانِ یگانہ (امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان) شہر میں آئے اور جیسا کہ میں نے کہا قلعے میں قیام کیا۔ اس واقعہ کے دو تین دن بعد فوج کو حکم دیا گیا، فوج گئی اور جھجر کے حاکم عبدالرحمٰن کو مجرموں کی طرح لائی، قلعے کے اندر ایک گوشے میں، جس کو دیوانِ عام کہتے ہیں جگہ دی گئی اور ان کی ساری جاگیر انگریزی حکومت نے ضبط کرلی۔

۳۱ اکتوبر کو جمعہ کے دن فرخ نگر کے حاکم احمد علی خان کو اس طرح (گرفتار کرکے) لائے جیسے عبدالرحمٰن خان کو لائے تھے اور قلعہ دہلی میں ایک جگہ ان کو ٹھہرایا گیا۔ فرخ نگر بھی تیز دست تباہ کاروں (انگریزوں) کا نشانہ بنا اور شہر والوں کا مال واسباب لٹ گیا۔

۲ نومبر کو پیر کے دن دادری اور بہادر گڑھ کے حاکم بہادر جنگ خان گرفتار ہوکر آ گئے اور قلعے میں جہاں ٹھہرایا گیا، ٹھہرے۔

۷ نومبر کو سنیچر کے روز راجا ناہر سنگھ حاکم بلب گڑھ کے آ جانے سے قلعے میں وہ سردار جو مختلف مقامات پر ایک دوسرے سے دُور مقیم تھے، ان میں ایک کا اور اضافہ ہوا۔

یہ بات پوشیدہ نہیں رہے گی کہ مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خان اور ذوالفقار الدین حیدر خان، جن کا لقب حسین میرزا ہے، اس ہنگامے میں دوسرے باعزت لوگوں کی طرح بیوی بچوں کے ساتھ شہر سے باہر چلے گئے، قیمتی سامان سے بھرے ہوئے گھر چھوڑ دیئے اور صحرانوردی اختیار کی۔ ان لوگوں کے کئی مکانات محل اور ایوان ہیں باہم متصل۔ اتنے وسیع اگر زمین کی پیمائش کی جائے تو شہر نہ سہی، ایک گاؤں کے برابر تو ہوگا۔ اتنے بڑے محل اس عالم میں کہ ان میں کوئی آدمی تھا ہی نہیں، لوٹ مار کرنے والوں کے ہاتھوں صاف اور ویران ہوگئے۔ کچھ کم قیمت اور بھاری سامان جیسے ایوان کے پردے، شامیانے، سائبان، شطرنجیاں اور دوسرا فرش ان قیام گاہوں میں باقی رہ گیا تھا۔ اچانک ایک رات جس صبح کو راجا ناہر سنگھ گرفتار ہوئے، اس سامان میں آگ لگ گئی، لپٹیں اٹھنے لگیں، لکڑی، پتھر دیواریں سب جل گئیں۔

شاہ زادوں کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعض کو گولی ماردی گئی۔ موت کے اژدھے نے ان کو نگل لیا۔ کچھ کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا گیا۔

رسن دار کی کشاکش سے ان کی روح ٹھٹھر گئی' چند افسردہ دل قید خانے میں ہیں اور بعض (عالم غربت میں) آوارہ و پریشان پھر رہے ہیں۔ کمزور و ضعیف بادشاہ پر مقدمہ چل رہا ہے۔ جھجر' بلب گڑھ اور فرخ نگر کے جاگیرداروں کو علاحدہ علاحدہ مختلف دنوں میں پھانسی پر لٹکایا گیا۔ (انہیں) اس طرح ہلاک کیا گیا کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ خون بہایا گیا۔

جنوری ۱۸۵۸ء کے آغاز میں ہندوؤں کو فرمانِ آزادی مل گیا اور (شہر میں) آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ لوگ جہاں جہاں تھے' شہر کی طرف چل پڑے' خانماں برباد مسلمانوں کے گھروں میں (خالی پڑے رہنے کے سبب) سبزہ اس قدر اُگ گیا ہے کہ در و دیوار سرسبز ہیں۔

شاید بدخصلت مخبروں کے کہنے سے حاکم شہر کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ راجہ نریندر سنگھ بہادر کے طبیبوں کا مکان مسلمانوں کی جائے پناہ اور جمع ہونے کی جگہ ہے.... اس خیال سے دو فروری کو حاکم شہر کچھ سپاہیوں کے ساتھ اس جگہ آیا اور مکان کے مالکوں کو ساتھ دوسرے نیک دل پناہ گزینوں کے اپنے ہمراہ لے گیا۔ اگرچہ کئی رات دن تک حوالات میں رکھا' لیکن باعزت لوگوں کی عزت کا خیال رکھا۔

پانچ فروری کو جمعہ کے دن حکیم محمود خان' حکیم مرتضٰی خان اور ان کے بھانجے عبدالحکیم عرف حکیم کالے کو واپسی کی اجازت مل گئی۔ بارہ فروری کو جمعہ کے دن چند دوسرے اشخاص اور تیرہ فروری کو سنیچر کے روز تین اور اشخاص واپس آ گئے' باقی نصف سے زیادہ حوالات میں رہ گئے۔ یہ مصیبت جو پڑوس میں نازل ہوئی اور یہ ہنگامہ جو گلی میں برپا ہوا (اس کی وجہ سے) مجھ درویش غم زدہ کا دل بھی قابو میں نہیں۔ اس کے باوجود کہ اس دار و گیر میں مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا' اب تک یہ عالم ہے کہ دن بھر متفکر رہتا ہوں اور رات میں آرام کی نیند نہیں سو پاتا ہوں۔ ۲۷ فروری کو جب سنیچر کا دن ختم ہوا اور رات آئی' رات کے تین پہر گزر گئے (اس وقت) مظلوموں کے دل کا دھواں چاند پر اس طرح چھا گیا کہ دیکھنے والے بے اختیار چلا اٹھے کہ چاند گہن میں آ گیا۔ اسی سنیچر کو حکم دور باش ختم ہوئی' انصاف چاہنے والے اور پریشان حال لوگوں کو حاضر ہونے کی اجازت اور خواہشمندوں کو پناہ دے دی گئی۔

اس شہر میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات اندرونِ شہر۔ ان دونوں میں بیشمار لوگوں کو بھر دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی میں آدمی سمویا جا رہا ہے۔ ان دونوں قید خانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دنوں میں پھانسی دے دی گئی ہے' ان کی تعداد فرشتہ موت ہی جانتا ہے۔ شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں پاؤ گے' میں ان میں سے ایک ہوں۔ جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں' ان میں سے کچھ لوگ اس قدر دُور نکل گئے ہیں' گویا

وہ اس سرزمین کے باشندے تھے ہی نہیں۔ بہت سے عالی مرتبہ لوگ شہر کے اردگرد دو دو چار کوس پر ٹیلوں، گڑھوں، چھپروں اور کچے مکانوں میں اپنے نصیب کی طرح آنکھیں بند کیے پڑے ہیں۔ اس ویرانہ نشین گروہ میں یا تو وہ لوگ ہیں جو شہر میں رہنے کے خواہشمند ہیں یا گرفتار شدہ لوگوں کے رشتہ دار ہیں یا خیرات خوار یعنی پنشن دار ہیں، لوگوں کی درخواستوں میں رہائی، آبادی اور اجرائے پنشن کے علاوہ اور کوئی مضمون نہیں پاؤ گے۔ دادخواہوں کی دو تین ہزار درخواستیں عدالت میں پہنچ چکی ہیں، انصاف طلب، چشم براہ اور گوش برآواز ہیں کہ کیا سننے اور دیکھنے میں آتا ہے۔

اٹھارہ مارچ کو جمع کے دن شام کے وقت روح کو توانائی بخشنے والی صدائے توپ آسمان کے نیلے گنبد میں گونج اٹھی (جس سے) لکھنؤ کا فتح ہونا اور اس شہر میں کینہ خواہ انگریزی فوج کا حسب دل خواہ پھیل جانا معلوم ہوا۔ اس شہر میں قلعہ، فصیل، دروازہ کچھ نہیں ہے یقیناً وہاں کے باغیوں کی فوج کی دیوار اس طرف کے بہادروں کا راستہ روکے ہوئے ہوگی۔ جب وہ کمزور دیوار بہادروں کی کوششوں کی آندھی سے گر گئی ہوگی تو بالیقین سوار اور پیادوں کے چلنے سے ہر راستے سے گرد و غبار بلند ہوا ہوگا۔

اپریل کے مہینے میں حکیم محمود خان کے ساتھ جو لوگ قید خانے میں باقی تھے، رہا ہو گئے۔ ہر ایک نے اپنا راستہ لیا۔ وہ ناز پروردہ، صاف طینت (حکیم محمود خان) سارے رشتہ داروں، بیوی، بچوں اور متعلقین کے ساتھ پٹیالے کی طرف چلا گیا۔

مئی کے شروع میں یہ خبر سننے کا فخر حاصل ہوا کہ سپاہِ کینہ خواہ کے بہادروں نے مرادآباد کو فتح کر لیا، جو بداندیش (باغیوں) کی گزرگاہ تھا اور اس شہر کو انصاف سے آراستہ کرنے کے لیے عالی نسب سرچشمہ علم و دانش نواب یوسف علی خان بہادر کے حوالے کر دیا۔

ماہ جون کے گزرے ہوئے دنوں کی تعداد کے برابر رعد کی طرح گرجنے والی توپوں (۲۱) کی آواز بلند ہوئی، جس نے دوستوں کے دلوں کو مسرت و شادمانی سے معمور کر دیا.... گوالیار کا شہر فتح ہو جانے اور اس سنگین قلعے کے ہاتھ آنے کی خوشخبری۔

.... یہ داستان یوں ہے کہ باغیوں نے گوالیار پر قبضہ کر لیا.... فرماں روائے گوالیار مہاراجہ جیاجی راؤ حکومت اور شہر دونوں چھوڑ کر آگے چلے گئے اور انگریزوں سے مدد چاہی، امدادی فوج لے کر اپنے وطن کی طرف گئے اور فتح حاصل کی۔ باغیوں نے بھاگم بھاگ ہر طرف سے گوالیار کا رُخ کیا تھا، یہاں ایسی شکست فاش ہوئی۔

راقم الحروف کی زندگی کے تریسٹھ سال گزر چکے ہیں۔ ان طرح طرح کے روح فرسا غموں کے سبب سے ظاہر ہے کہ اب زمانے سے اور زیادہ فرصت کی توقع بے جا ہے.... فی الحقیقت سچی بات کو چھپانا اچھے لوگوں کا طریقہ نہیں ہے.... میں نیم مسلمان مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوں اور بدنامی ورسوائی کے رنج سے بے نیاز' ہمیشہ سے رات میں صرف ولایتی شراب پینے کی عادت تھی۔ ولایتی شراب نہیں ملتی تھی تو نیند نہیں آتی تھی۔ آج کل جبکہ انگریزی شراب شہر میں بہت مہنگی ہے اور میں بالکل مفلس ہوں' اگر خدا دوست' خدا شناس' فیاض' دریا دل' ہمیش داس دیسی شرابِ قند جو رنگ میں ولایتی شراب کے برابر اور بُو میں اس سے بڑھ کر ہے' بھیج کر آتش دل کو سرد نہ کرتے تو میں زندہ نہیں رہتا' اسی عالم جگر تشنگی میں مرجاتا....

جب یہ داستان دوستوں کے ہاتھوں میں آئے تو وہ سمجھ لیں کہ شہر مسلمانوں سے خالی ہے۔ راتوں کو ان لوگوں کے گھر چراغوں سے محروم رہتے ہیں اور دن میں دیواروں کے روزن دھویں سے۔ غالب جس کے شہر میں ہزاروں دوست تھے' ہر گھر میں شناسا اور واقف کار موجود تھے' اس تنہائی میں قلم کے سوا کوئی اس کا ہم زبان اور اپنے سائے کے علاوہ کوئی ساتھی نہیں ہے۔

اس لوٹ مار میں جبکہ شہر میں کسی گھر میں مٹی بھی نہیں بچی' اگرچہ میرا گھر لوٹ مار کرنے والوں کی دراز دستی سے محفوظ رہا' لیکن میں قسم کھا سکتا ہوں کہ بستر اور پہننے کے کپڑوں کے علاوہ گھر میں کچھ نہیں رہا۔ اس عقدۂ دشوار کا حل اور اس دروغ نما سچ کی حقیقت یہ ہے کہ جس وقت کالوں نے شہر پر قبضہ کیا' بیگم نے مجھ سے کہے بغیر قیمتی چیزیں زیور وغیرہ جو کچھ تھا' خفیہ طور پر کالے صاحب پیرزادہ کے یہاں بھیج دیا' وہاں تہ خانے میں محفوظ کر دیا گیا اور دروازہ مٹی سے پاٹ دیا گیا۔ جب فاتح لشکر نے شہر فتح کیا اور سپاہ کو لوٹ مار کا حکم مل گیا' تب بیگم نے یہ راز مجھ سے کہا۔ وقت نکل چکا تھا' وہاں تک جانے اور سامان لانے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی' میں خاموش ہو گیا اور دل کو سمجھا لیا کہ یہ چیزیں جانے والی ہی تھیں' اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گئیں۔

اب یہ جولائی کا پندرھواں مہینہ ہے' قدیم پنشن جو سرکار انگریزی سے ملتی تھی' اس کے ملنے کا کوئی ذریعہ نہ نکلا۔ بستر اور کپڑے بیچ بیچ کر زندگی گزار رہا ہوں۔ گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں' میں کپڑے کھاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ جب کپڑے کھا لوں گا' عالمِ برہنگی میں بھوک سے مرجاؤں گا۔

مئی سال گزشتہ سے لے کر جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد میں نے لکھی ہے' یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ کاش! میری ان تین خواہشوں یعنی خطاب' خلعت اور پنشن کے اجراء کا حکم شہنشاہ فیروز بخت کے حضور سے آجائے' جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی لکھا ہے۔

غدر اور مابعد غدر کی دہلی کا تذکرہ خطوطِ غالب میں

"غم مرگ میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کہ اہل شہر کو گنتا ہوں' مظفرالدولہ میر ناصرالدین' مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا' اس کا بیٹا احمد میرزا انیس برس کا بچہ' مصطفیٰ خان ابن اعظم الدولہ' اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خان اور مرتضیٰ خان' قاضی فیض اللہ' کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا' اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین احمد خان' میر احمد حسین میکش' اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں غم فراق حسین میرزا' میر مہدی' سید سرفراز حسین' میرن صاحب خدا ان کو جیتا رکھے' کاش! یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے' گھر ان کے بے چراغ' وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے' کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے؟ مگر میں علیؑ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

(۲۶ نومبر ۱۸۵۹ء بنام یوسف میرزا)

کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلّی بڑا شہر ہے' ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وہ دلّی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے' وہ دلّی نہیں جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ دلّی نہیں' جہاں میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔

ایک کیمپ ہے' مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں' وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں کٹنیاں اور جو جوان ہیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو' حسن علی خان بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشن' دو سو روپے مہینہ کا روزینہ خوار بن کر نامرادانہ مر گیا۔ میر نصیرالدین باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ' مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خان کا بیٹا خود بھی بخشی ہو چکا ہے' بیمار پڑا نہ دوا نہ غذا انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار کی طرف سے تجہیز و تکفین ہوئی۔... قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے۔

(بنام علاءالدین احمد خان علائی' فروری ۱۸۶۳ء)

ہے ہے کیوں کر لکھوں؟ حکیم رضی الدین خان کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی اور احمد حسین خان ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خان کے دو بیٹے رخصت لے کر آئے تھے' غدر کے سبب نہ جا سکے۔ یہیں رہے' بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خان ٹونک میں زندہ ہیں' پر یقین ہے کہ مردے سے بدتر ہوں گے۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔

(۱۸۶۰ء' بنام انوارالدولہ شفق)

حضرت انہدام ساکن و مساجد میں کیا حال گزارش کروں؟ بانئ شہر کو وہ اہتمام مکانات کے بنانے

میں نہ ہوگا' جواب والیانِ ملک کو ڈھانے میں ہے۔ اللہ اللہ قلعے میں اکثر اور شہر میں بعض بعض وہ شاہجہانی عمارتیں ڈھائی گئی ہیں کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں' بلکہ قلعے میں تو ان آلات سے کام نہ نکلا' سرنگیں کھودی گئیں' بارود بچھائی گئی اور مکانات سنگین اڑا دیے گئے۔

(۱۸۶۰ء بنام انوار الدولہ شفق)

روز اس شہر میں اِک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا سا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے' جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے' اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کہ کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے.... کل سے یہ حکم ملا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان و دکان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بنا چکے ہیں انہیں ڈھا دو اور آئندہ کی ممانعت کا حکم سنا دو۔

(۲ فروری ۱۸۵۹ء' سید سرفراز حسین)

خداوند نعمت کیا تم دلّی کو آباد اور قلعہ کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو جو حضرت شیخ کا کلام اور صاحبزادہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین رحمتہ اللہ علیہ کا حال پوچھتے ہو؟ ایں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد۔ بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو دی' کاغذ کا پرزا' سونے کا تار' پشمینے کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی علیہ الرحمہ کا مقبرہ اجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی' ان کی اولاد کے تمام لوگ اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں۔

(یکم ستمبر ۱۸۶۳ء' سید احمد حسن مودودی)

جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے' کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا' روبکاریاں ہوئیں' آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا' نوکری موقوف' جائیداد ضبط' ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لیفٹیننٹ گورنر نے ازراہِ ترحم نصف جائیداد واگزاشت کی' اب نصف جائیداد پر قابض ہیں' اپنی حویلی میں رہتے ہیں' کرائے پر معاش کا دار و مدار ہے۔

(۱۹ فروری ۱۸۶۰ء' سید احمد حسن مودودی)

مولانا (فضل حق خیر آبادی) کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا' کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس برقرار رہا' تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے' کیا ہوتا ہے' جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

(جون ۱۸۵۸ء بنام یوسف میرزا)

ہاں خان صاحب! آپ جو کلکتے پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرے میں اس کا کیا حال ہے۔ گزارا کس طرح ہوتا ہے۔

(بنام میاں داد خان سیاح' ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۱ء)

ایک لطیفہ پرسوں کا سنو! حافظ مموبے گناہ ثابت ہو چکے' رہائی پا چکے' حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں' املاک اپنی مانگتے ہیں' قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا' صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے مثل پیش ہوئی' حاکم نے پوچھا حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا میں! پھر پوچھا حافظ ممو کون؟ عرض کیا کہ اصل نام میرا محمد بخش ممو مموؔ مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم' حافظ ممو بھی تم' جو دنیا میں ہے' وہ بھی تم' ہم مکان کس کو دیں؟ مثل داخل دفتر ہوئی بھائی ممو اپنے گھر چلے آئے۔

(جون ۱۸۵۹ء نواب میرزا یوسف)

ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے اور یہ حکم ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے' البتہ اس کا معاوضہ بہ حساب وہ ایک سرکار سے ہو گا یعنی ہزار روپے مانگنے والے کو سو روپے ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے وہ ہدر اور بحل ہے' اس کا معاوضہ نہ ہو گا۔

(۳ دسمبر ۱۸۵۹ء حسین میرزا)

حکم ہوا کہ دوشنبہ کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت سب خیر خواہانِ انگریز اپنے اپنے گھر میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہو گی۔ فقیر بھی اس تہی دستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنشن مقرری نہیں پاتا' اپنے مکان پر روشنی کرے گا۔

(بنام شیو نرائن آرام نومبر ۱۸۵۸ء)

یہاں پہلی نومبر کو بدھ کے دن حسب الحکم حکام کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی اور شب کو کمپنی کا ٹھیکہ

ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاہی عمل میں آ نا سنا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کننگ بہادر کو ملکہ معظمہ انگلستان نے فرزند دار جمند کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندستان کا حاکم کیا۔

(جمعہ ۵ نومبر ۱۸۵۸ء انوارالدولہ شفق)

کیسی صاحبزادوں کی سی بات کرتے ہو۔ دلّی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسے آگے تھی؟ قاسم خان کی گلی میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ خان بیگ کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خان کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خان کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالی شان انگلستان تشریف رکھتے ہیں۔ ضیاء الدین خان اور ان کے بھائی مع قبائل و عشائر لوہارو میں ہیں۔ لال کنوئیں کے محلے میں خاک اڑتی ہے، لکھی کی دکان پر کتے لوٹتے ہیں۔

(۱۸۵۸ء بنام مولوی عزیزالدین خان)

دلّی کا حال تو یہ ہے:

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اِک حسرت تعمیر سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا وہ خبر محض غلط ہے، اگر کچھ ہے تو بدیں نمط ہے کہ چند روز گوروں نے اہل بازار کو ستایا تھا۔ اہل قلم اور اہل فوج نے بہ اتفاق ہمد گر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا، اب امن و امان ہے۔

(۱۸۵۹ء)

کئی لشکروں کا حملہ پے در پے اسی شہر پر ہوا، پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر حاکموں کا اس میں جان و مال و ناموس، مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔

(۱۸۶۰ء انوارالدولہ شفق)

اس باب کے تمام تر اقتباسات خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر مطبوعہ (شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور) اور ''دستنبو'' مصنفہ مرزا اسداللہ خان غالب ترجمہ رشید حسن خان سے لیے گئے ہیں۔

آہ غالب بمرد

''(حضرت) نظام الدین اولیاء کے مزار کے مرکزی دروازے کے قریب ایک چھوٹا سا قبرستان ہے، جس میں چند سادہ سی قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک شاعر غالب کی ہے۔ اس پر ایک فارسی کتبہ ہے جو آپ خود جا کر پڑھیں۔ تمام عظیم لوگوں کو بڑے بڑے مقابر نصیب نہیں ہوتے۔ اس پتھر کی سادہ سی لوح کے نیچے دلی کے عظیم فرزندوں میں سے ایک فرزند کی باقیات مدفون ہیں۔ غالب انیسویں صدی کے سب سے بڑے اردو شاعر تھے۔ وہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دوست اور شاعر دربار ذوق کے حریف تھے۔ اس پتھر کے سامنے احتراماً سر جھکا کر کھڑے ہو جایئے کیونکہ یہاں اردو کا شیکسپیئر ابدی نیند سو رہا ہے۔''

[1]T.G.P. Spears

اگرچہ غالب نے ۱۸۲۷ء میں جرم قمار بازی میں قید کاٹنے کے بعد لکھا تھا: ''چاہتا ہوں کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں''، اور پھر یہ بھی فرمایا تھا کہ:

ہے اب اس معمورے میں قحط غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

لیکن انہیں ہندوستان میں اور دلی ہی میں مزید بائیس سال کاٹنے پڑے۔ اس دوران انہوں نے دو ایک سفر رام پور کے ضرور کیے، جہاں ان کی قدر دانی ہوتی تھی لیکن اپنے حریف ذوق کے قول کے مطابق دلی کی گلیاں نہ چھوڑ سکے یہاں تک کہ دم واپسیں آ پہنچا۔

بقول حالی آخری دنوں میں یہ شعر زباں پر رہا کرتا تھا:[2]

دم واپسیں برسر راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

انہی دنوں کی حالت زار حبیب اللہ ذکا کے نام ایک خط میں بیان کرتے ہیں:

''زیستن دشوار! اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے بہتر واں برس شروع ہوا۔ غذا صبح کو

سات بادام کا شیرہ قند کے ساتھ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی، قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب، چھ گھڑی رات گئے پانچ روپیہ بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر۔

اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اٹھ نہیں سکتا اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چوپایہ بن کر اٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ معہذا دن بھر میں دس بار اور اسی قدر رات بھر میں پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے اٹھا اور پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ اسباب حیات میں سے یہ بات ہے کہ شب کو بدخواب نہیں ہوتا۔ بعد ازاقت بول بےتکلف نیند آ جاتی ہے۔

ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے کی آمد، تین سو کا خرچ، ہر مہینے میں ایک سو چالیس کا گھاٹا۔ کہو زندگی دشوار ہے یا نہیں؟ مروں نا گوار بدبھی ہے مرنا کیوں کر گوارا ہوگا؟"[3]

وفات سے تین ماہ قبل وہ آتش سیال جو رگ و پے میں حدت پیدا کرتی تھی، ترک کر دی اور توبہ کی تاریخ بھی کہی:[4]

یک روز بہ ترکِ بادہ گوئی غالب
رُخ روزِ دگر بہ بادہ شوئی غالب
زیں توبہ بے بقاچہ جوئی غالب
توبہ تب توبہ است گوئی غالب

(کیم شعبان ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۸۶۸ء)

اور وہ جو تواب و رحیم ہے اس سے بڑا توبہ قبول کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ اور پھر توبہ بھی اس کی جو اعتراف معاصی ان الفاظ میں کرے:

"میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر لے جا کر کتوں، چیلوں اور کووں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کو کھانا گوارا کریں) چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے، لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں، ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں لا الہ الا اللہ لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ۔"[5]

آخری ایام میں ایک کھلا خط اکمل الاخبار، اشرف الاخبار اور دیگر اخبارات میں شائع کرایا، جس میں احباب اور تلامذہ سے گزارش کی گئی کہ وہ اصلاح کے لیے کلام نہ بھیجیں اور خطوط کے جوابات کی بھی توقع نہ رکھیں، کیونکہ بوجہ پیری، ضعف، علالت اور نسیان یہ امور تقریباً ناممکن ہیں۔

"خط بکس میں یا کتاب میں رکھ دیتا ہوں اور بھول جاتا ہوں، آگے لیٹے لیٹے خط لکھتا تھا اب رعشہ

یوں بھی نہیں لکھتے دیتا... اس نگارش کی شہرت سے مقصود یہ ہے کہ میرے احباب میرے حال سے اطلاع پائیں۔ اگر خط کا جواب یا اصلاحی غزل دیر میں پہنچے تو تقاضا اور اگر نہ پہنچے تو شکایت نہ فرمائیں۔ میں دوستوں کی خدمت گزاری میں کبھی قاصر نہیں رہا اور خوشی خوشنودی سے کام کرتا رہا۔ جب بالکل نکما ہو گیا نہ حواس باقی نہ طاقت، پھر اب کیا کروں بقول خواجہ وزیر:

میں وفا کرتا ہوں لیکن دل وفا کرتا نہیں

اگر کسی صاحب کو میری طرف سے کچھ رنج وملال ہو تو خالصتاً للہ فرمائیں گے۔ اگر جوان ہوتا تو احباب سے دعائے صحت کا طلبگار ہوتا۔ اب جو بوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں.... غالب"[6]

مولانا حالی لکھتے ہیں:

"مرنے سے چند روز پہلے بے ہوشی طاری ہوگئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لیے افاقہ ہو جاتا تھا۔ جس روز انتقال ہوا اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا' اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا اور نواب علاؤ الدین احمد خان مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انہوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر جو غالباً سعدی کا تھا' لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا کہ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو' ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا" اور شعر کا پہلا مصرعہ مجھے یاد نہیں رہا' دوسرا مصرعہ یہ تھا:

نکرد ہجر مدارا بمن سر تو سلام

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر ورد زباں رہتا تھا:

دم واپسیں برسر راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

آخر ذیقعد ۱۲۸۵ھ کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرہویں کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی اور درگاہ حضرت نظام الدین قدس سرہ میں اپنے خسر کے پائیں مزار دفن کیے گئے۔" "آہ غالب بمرد" اس تاریخ وفات میں کئی حضرات کو توارد ہوا۔

میر مہدی مجروح نے لکھا:

کیوں نہ ویران ہو دیارِ سخن — مر گیا آج تاجدارِ سخن
بلبل خوش ترانہ معنی — گل رنگین و شاخسارِ سخن
نخل بند حدیقہ مضموں — تازگی بخش لالہ زارِ سخن
عرصہ نظم کیوں نہ ہو ویراں — ہے عناں کش وہ شہسوارِ سخن

کیوں نہ حرفوں کا ہو لباس سیاہ　　ہے غم مرگِ شہریارِ سخن
ساتھ ان کے گئی سخن سنجی　　ان کا مرقد ہی ہے مزارِ سخن
آبیاری تھی جس سے وہ نہ رہا　　اب خزاں ہو گئی بہارِ سخن
نغمہ پیرائیاں کہاں ویسی　　اب یہ نالہ ہائے زارِ سخن
رشک عرفی و فخر طالب مرد　　اسد اللہ خان غالب مرد[8]

منشی ہرگوپال تفتہ نے لکھا:

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے
ہم سے ہزار ہیچداں نامور ہوئے
فیض و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق
چھ لفظ اس کے مرنے سے بے پا و سر ہوئے[9]

خدائے سخن میر ببر علی انیس نے یوں خراج عقیدت پیش کیا:

گلزارِ جہاں سے باغِ جنت میں گئے
مرحوم ہوئے جوارِ رحمت میں گئے
مداحِ علی کا مرتبہ اعلیٰ ہے
غالب اسداللہ کی خدمت میں گئے[10]

مرزا حاتم علی بیگ مہر نے یوں تاریخ لکھی:

شاعر رند حضورِ غفار
للہ الحمد گرامی آمد
گفت ہاتف پے تاریخ اے مہر
بجناں غالب نامی آمد[11]

منیر شکوہ آبادی نے لکھا:

آں غالب دہلوی حکیم دوراں　　سلطان سخن غلام آل یٰسین
در نظم و زبانِ فارسی نامی دہر　　در نثر بہ مسند افاوات مکیں
برداشتہ رخت ازیں سرائے فانی　　یا ربّ برسانیش بفردوس بریں
دنیا ست سیہ بدیدۂ اہل سخن　　در برج لحد چو رفت آں مہر مبیں
تاریخ وفات او چنیں گفت منیر　　آہ افصح عصر و حیف ثانی حزیں[12]

حوالہ جات

Delhi its Monument and Hestory spear -1
2- یادگار غالب از الطاف حسین حالی
3- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر
4- فسانۂ عجائب از مالک رام
5- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر
6- مجموعہ نثر غالب مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی
7- یادگار غالب از الطاف حسین حالی
8- غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے از ڈاکٹر اکبر حیدری
9- تلامذۂ غالب از مالک رام
10- غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے از ڈاکٹر اکبر حیدری
11- ایضاً
12- کلیاتِ منیر، غالبیات از اکبر حیدری

کتابیات

1- دیوانِ غالب۔نسخہ طاہر۔سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔
2- دیوانِ غالب۔نسخہ حمیدیہ۔مجلس ترقی ادب لاہور۔
3- گل رعنا۔مرزا غالب۔تحقیق سید وزیر الحسن عابدی۔پنجاب یونیورسٹی لاہور 1969ء۔
4- سبد چین۔مرزا اسد اللہ غالب۔تحقیق سید وزیر الحسن عابدی۔پنجاب یونیورسٹی لاہور 1969ء۔
5- دستنبو۔مرزا غالب۔اردو ترجمہ رشید حسن خان (رسالہ اردوئے معلی۔دہلی 1961ء)۔
6- قادرنامہ غالب۔مرزا اسد اللہ خان غالب۔پنجاب یونیورسٹی لاہور 1969ء۔
7- مہرنیمروز۔میرزا غالب۔ترجمہ پروفیسر سید عبدالرشید فاضل۔انجمن ترقی اردو کراچی۔
8- مجموعہ نثر غالب۔خلیل الرحمٰن داؤدی۔مجلس ترقی ادب لاہور۔
9- خطوط غالب۔مرتبہ غلام رسول مہر۔شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔
10- نامہ ہائے فارسی غالب۔ترجمہ پرتو روہیلہ۔ادارہ یادگار غالب کراچی۔
11- غالب کی نادر تحریریں۔مرتبہ خلیق انجم۔مکتبہ شاہراہ دہلی۔
12- انشائے غالب۔مرتب رشید حسن خان۔ادارہ یادگار غالب کراچی۔
13- اردوئے معلی۔مرزا غالب۔تحقیق سید مرتضیٰ حسین فاضل۔مجلس ترقی ادب لاہور۔
14- عود ہندی۔مرزا غالب۔تحقیق سید مرتضیٰ حسین فاضل۔مجلس ترقی ادب لاہور۔
15- یادگار غالب۔مولانا الطاف حسین حالی۔خزینہ علم وادب لاہور۔
16- فسانہ غالب۔مالک رام۔مکتبہ شعر وادب لاہور۔
17- تلامذہ غالب۔مالک رام۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نیو دہلی۔
18- غالب دردن خانہ۔کالی داس گپتا رضا۔ساکار پبلشرز بمبئی۔
19- پنج آہنگ۔مرزا اسد اللہ خان غالب۔مجلس یادگار غالب لاہور۔
20- حیات غالب۔شیخ محمد اکرام۔ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔

یا حسن بسم اللہ الرحمن الرحیم یا حسین
ابو المعانی میرزا عبد القادر بیدل رضی اللہ عنہ

''دیوانِ غالب'' (قلمی) کا پہلا صفحہ

21- مرزا غالب۔نتالیا پری گارینا۔ترجمہ محمد اسامہ فاروقی۔مکتبہ دانیال' کراچی۔
22- غالبیات کے چند فراموش گوشے۔ڈاکٹر اکبر حیدری۔ادارہ یادگار غالب' کراچی۔
23- غالب کون ہے؟ شریف الحسن۔نگارشات' لاہور۔
24- خیابان غالب۔نادم سیتاپوری۔
25- اوراق معانی ترجمہ خطوط فارسی مشمولہ پنج آہنگ۔تنویر احمد علوی۔اردو اکادمی' دہلی۔
26- شعر العجم فی الہند۔شیخ اکرام الحق۔الاکرام نشتر روڈ' ملتان 1941ء۔
27- مکتوبات غالب۔ترجمہ نامہ ہائے غالب۔لطیف الزماں خان۔دانیال' کراچی۔
28- نقوش۔غالب نمبر 1984ء۔ادارہ فروغ اردو' لاہور۔
29- راوی۔غالب نمبر جنوری 1998ء۔گورنمنٹ کالج لاہور۔
30- نقد برہان قاطع مع ضمائم۔پروفیسر نذیر احمد۔غالب انسٹی ٹیوٹ' نئی دہلی۔
31- تلاش غالب۔پروفیسر نثار احمد فاروقی۔غالب انسٹی ٹیوٹ' نئی دہلی۔
32- اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ۔ڈاکٹر سنبل نگار۔دار النوادر۔
33- تاریخ ادب اردو۔رام بابو سکسینہ۔ترجمہ مرزا محمد عسکری۔مطبع نولکشور' لکھنؤ۔
34- حیات جاوید۔مولانا الطاف حسین حالی۔سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور۔
35- خطوط بنام سرسید۔مولانا محمد اسماعیل پانی پتی۔مجلس ترقی ادب' لاہور۔
36- ابن الوقت۔مصنفہ ڈپٹی نذیر احمد۔مجلس ترقی ادب' لاہور۔
37- تحقیق غالب۔ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔مکتبہ عالیہ' لاہور۔
38- محمد حسین آزاد (احوال و آثار) ڈاکٹر محمد صادق۔
39- مرحوم دہلی کالج۔مولوی عبدالحق۔انجمن ترقی ہند' نئی دہلی۔
40- سیر المنازل۔مرزا سنگین بیگ۔ترجمہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی۔دہلی یونیورسٹی۔
41- تفریح دہلی۔اے این ایم۔نواب قزلباش۔مقلپورہ اسٹریٹ فیض آباد' یوپی۔
42- لال قلعہ کی ایک جھلک۔خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی۔اردو اکادمی' دہلی۔
43- بزم آخر۔منشی فیض الدین۔اردو اکادمی' دہلی۔
44- بہادر شاہ ظفر۔اسلم پرویز۔اردو اکادمی' دہلی۔
45- بہادر شاہ ظفر کے شب و روز۔ضیاء الدین لاہوری۔
46- داستان غدر۔راقم الدولہ ظہیر دہلوی۔
47- اجڑا دیار۔شاہد احمد دہلوی۔کتبہ دانیال' کراچی۔

48- چراغ دہلی ۔ مرزا حیرت دہلوی ۔ کرزن پریس، دہلی ۔
49- دلّی تھا جس کا نام ۔ انتظار حسین ۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۔
50- سوانح دہلی ۔ شہزادہ مرزا احمد اختر گورگانی ۔ اردو اکادمی، دہلی ۔
51- آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان ۔ ڈاکٹر مبارک علی ۔ فکشن ہاؤس، لاہور ۔
52- قلعہ معلّیٰ کی جھلکیاں ۔ عرش تیموری ۔ اردو اکادمی، دہلی ۔
53- فرہنگ آصفیہ ۔ مولوی سید احمد دہلوی ۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۔
54- رسومِ دہلی ۔ مولوی سید احمد دہلوی ۔ اردو اکادمی، دہلی ۔
55- طاقِ نسیاں ۔ شاہد احمد دہلوی ۔ اردو اکیڈمی، بہاول پور ۔
56- اردو ہندی ایک تاریخی جائزہ ۔ جاوید اختر بھٹی ۔ دار الکتاب، لاہور ۔
57- جنگ آزادی 1857ء کے دو خفیہ روزنامچے ۔ معین الدین حسن خان و جیون لال ۔ تخلیقات، لاہور ۔
58- میرے زمانے کی دلّی ۔ ملا واحدی ۔
59- آثار الصنادید ۔ سر سید احمد خان ۔ 3 جلد، مرتبہ خلیق انجم، مطبوعہ دہلی ۔
60- سفر نامہ ہند ۔ پروفیسر محمد اسلم ۔ ریاض برادرز، لاہور ۔
61- برطانوی راج ایک تجزیہ ۔ ڈاکٹر مبارک علی ۔ فکشن ہاؤس، لاہور ۔
62- کلیات اقبال (اردو) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۔
Delhi, Its Monuments and History.p. Spear. Oxford, Delhi -63
Twilight of Mughals. Percival Spear. Oxford. -64
Delhi Through the Ages. R.E.Frykenberg . -65
Delhi between two Empires. Narayani Gupta. -66
Ghalib. Ralf Russell. Oxford, Delhi. -67
68- اردو کے یادگار ادبی معرکے ۔ محمد یعقوب عامر ۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۔
69- اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ ۔ ڈاکٹر سنبل نگار ۔
69- موہن لعل کاشمیری ۔ ہری رام گپتا ۔ بیکن بکس، ملتان ۔
70- دیوانِ غالب کامل کالی داس گپتا رضا ۔
71- ہندوستانی صحافت محمد عتیق صدیقی ۔
72- دلّی کالج میگزین قدیم دلّی کالج نمبر ۔

■ ■ ■ ■ ■ ■ ■

- دیوانِ غالب — اسداللہ خاں غالب
- شرح دِیوانِ غالب — جوش ملسیانی
- غالب کی نفسیاتِ غم — سمیع اللہ قریشی
- اُردوادب کی مختصر ترین تاریخ (ستائیسواں ایڈیشن) — ڈاکٹر سلیم اختر
- اُردوادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک — ڈاکٹر تبسم کاشمیری
- تاریخ ادب اُردو — رام بابو سکسینہ، مرزا محمد عسکری
- تاریخ ادب اُردو (ابتدا تا حال) — محمد اکرام چغتائی
- پنجاب میں اُردو (حافظ محمود شیرانی) — محمد اکرام چغتائی
- گذشتہ لکھنؤ (عبدالحلیم شرر) — محمد اکرام چغتائی
- محمد حسین آزاد (نئے دریافت شدہ ماٰخذ کی روشنی میں) — محمد اکرام چغتائی
- عمرِ دراز (خودنوشت سوانح عمری) — محمد اکرام چغتائی
- اکبرالہ آبادی —— حیات وکلام (انتخاب) — مرتبہ: محمد اکرام چغتائی
- آبِ حیات — محمد حسین آزاد
- اُردو کا حال — رضا علی عابدی
- اُردو زبان کیا ہے؟ — ڈاکٹر سلیم اختر
- امیر خسرو کا ہندوی کلام — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
- ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
- ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
- اُردو غزل اور ہندستانی ذہن وتہذیب — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
- جدیدیت کے بعد — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
- ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

طلسم ہوشربا
امیر حمزہ صاحبقران
(۸ جلد)

فسانۂ آزاد
پنڈت رتن ناتھ سرشار
(۴ جلد)

سیرِ کہسار
پنڈت رتن ناتھ سرشار

باغ و بہار
(۱۸۰۱ء)
میر امن دِلّی والے، ڈنکن فاربس

Rs. [redacted].00

www.sang-e-meel.com
ISBN 969-35-1875-6
9789693518757